ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی

اُردو ادب کے بہترین نقّاد اور امراضِ قومی کے کامل نبّاض

حالیؒ کی یاد میں

جہانبانی سے ہے دُشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو، تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیخ محمد اقبال ایم۔اے پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں
چھپوا کر تاج آفس بمبئی سے شائع کیا

فہرس

عہدِ اکبری

۱۔ عبادت خانہ
۲۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور
۳۔ علما کا زوال
۴۔ دینِ الٰہی
۵۔ مخالفت
۶۔ اکبر کا مذہب
۷۔ اسلامی حکومت کا استحکام
۸۔ عہدِ اکبری میں علم و فن
۹۔ شیخ مبارک۔ فیضی۔ ابوالفضل
۱۰۔ ملا عبدالقادر بدایونی
۱۱۔ نواب مرتضےٰ خاں شیخ فریدؒ

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگؒ

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

۱۔ ابتدائی حالات
۲۔ علوم باطنی
۳۔ ارشاد و ہدایت
۴۔ مکتوب یازدہم کی مخالفت
۵۔ دربارِ جہانگیری میں طلبی
۶۔ سنتِ یوسفی
۷۔ کیا حضرت مجددؒ نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا۔

۸ - مذہبی خدمات
۹ - معترضین کے اعتراضات
۱۰ - غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجددؒ کا نقطۂ نظر
۱۱ - فلسفۂ وحدت الشہود
۱۲ - مکتوباتِ امامِ ربانی
۱۳ - خلفائے مجددیہ اور دیگر حضراتِ نقشبندیہ

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

۱ - ابتدائی حالات
۲ - شیخ سیف الدینؒ
۳ - شیخ عبدالوہاب متقی
۴ - شیخ محدثؒ کی علمی خدمات
۵ - مکتوبات
۶ - علمائے عصر

عہدِ شاہجہانی

۱ - شاہجہاں
۲ - شیخ میاں میر لاہوری قادریؒ
۳ - مُلّا شاہ قادری
۴ - سرمد
۵ - دبستانِ مذاہب
۶ - شہزادہ داراشکوہ قادری

عہدِ عالمگیری

۱ - عالمگیر
۲ - اصلاحاتِ عالمگیری
۳ - اربابِ ظاہر
۴ - اسلامی مدارس اور انکا نظامِ تعلیم
۵ - عالمگیر اور غیر مسلم
۶ - خوشحال خاں خٹک
۷ - علوم وفنون

امام الہند شاہ ولی اللہؒ

۱ - ۱۷۰۳
۲ - خاندانی حالات
۳ - شاہ عبدالرحیمؒ
۴ - شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت
۵ - باقی حالات
۶ - قرآن
۷ - حدیث
۸ - اصولِ فقہ
۹ - اجتہاد و تقلید
۱۰ - تصوف
۱۱ - صحابۂ کرام
۱۲ - حجۃ اللہ البالغہ
۱۳ - دیگر تصانیف
۱۴ - اصلاحِ معاشرت
۱۵ - اشعار اور مکاتیب
۱۶ - شاہ ولی اللہ اور حضرت مجدد
۱۷ - امام الہند کون ہے؟
۱۸ - حضرت امام الہند کے فرزندانِ ارجمند

علمائے متاخرین

۱ - زوالِ حکومت
۲ - علومِ اسلامی کا فروغ
۳ - فرنگی محل
۴ - درس نظامیہ
۵ - اسلامی مدارس
۶ - علمائے متاخرین
۷ - اٹھارویں صدی کے مشائخِ کبار
۸ - اردو ادب کی ابتدا

نگہِ واپسیں
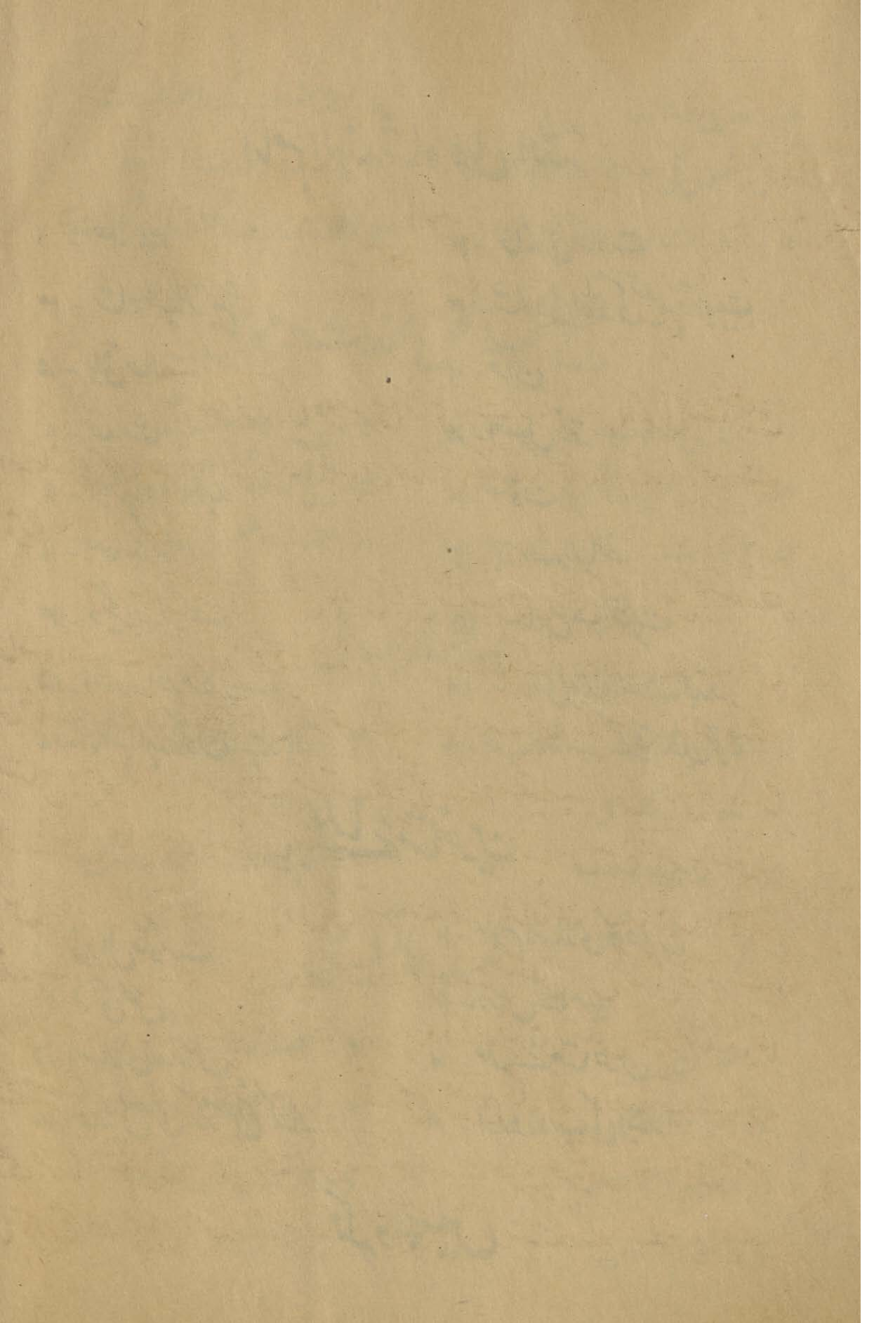
دیباچہ

یہ کتاب سلسلۂ کوثر کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں اکبر کی تخت نشینی اور خاندانِ سور کے خاتمے سے اُنیسویں صدی کے آغاز تک کے واقعات ہیں ؛

جس دَور کی مذہبی اور علمی تاریخ پہلی کتاب میں لکھی گئی۔ اس کی نسبت عام واقفیت اس قدر محدُود ہے۔ اور اِس زمانہ کے علمی و ادبی حالات اس حد تک پردۂ تاریکی میں ہیں۔ کہ ہم نے یہ مُناسب سمجھا۔ کہ اس زمانہ کے متعلق جو علمی و ادبی معلومات مُستند ذرائع سے دستیاب ہوں۔ انھیں درج کرنے میں بُخل سے کام نہ لیا جائے۔ اور گزشتہ چند سالوں میں مطہر۔ جمالی اور اس زمانہ کی غیر معرُوف ہستیوں کی نسبت جو انکشافات ہوئے ہیں۔ انھیں قدرے تفصیل سے بیان کر دیا۔ موجودہ دَور کے متعلق اس قسم کی ضرُورت نہ تھی۔ مغلیہ تاریخ کے متعلق عام طور پر وہ بے خبری نہیں۔ جو ابتدائی ایام کے متعلق ہے۔ اور لوگ عرفی۔ نظیری۔ فیضی بلکہ کلیم اور صائب سے بھی اچھی طرح آشنا ہیں۔ اس لئے رودِ کوثر کو ہم نے مذہبی تحریکوں اور مذہبی علوم کی تاریخ اور جلیل القدر مذہبی راہنماؤں کی سرگزشت کے لئے وقف

رکھا ہے۔

عہدِ مغلیہ کی نسبت معاصرانہ تصانیف۔ تذکرے، تواریخ، مکاتیب بے شمار ہیں۔ اور خوش قسمتی سے ہمیں جن جن چیزوں کی تلاش تھی۔ وہ دستیاب ہوتی گئیں۔ لیکن دو کتابیں پھر بھی نہ ملیں۔ ایک مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ۔ دوسرے معارج الولایت، جس میں بقول مفتی غلام سرور لاہوری، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ کے اختلافات کی تفصیل ہے۔ پہلی کتاب مطبع نظامی میں چھپ بھی چکی ہے۔ اگر کوئی صاحب اسے عاریتاً عنایت کریں۔ یا دوسری کا سراغ بتائیں۔ تو راقم السطور ممنون ہوگا۔

محمد اکرام

عہدِ اکبری

اکبر ۱۵۴۳ء میں پیدا ہُوا۔ اور تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہُوا۔ اسکے بعد اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا۔ کہ جس طرح سیدھے سادھے خوش اعتقاد اور پابندِ مذہب، تُرک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ارکانِ مذہب کی دِل و جان سے بجاآوری کرتا۔ اس نے باپ کی صحرانوردی کے زمانے میں، دُنیا کا سرد گرم چکھا تھا۔ اور طبیعت میں گداز اور رُوحانی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جب بارہ برس کی مایوسی اور سرگردانی کے بعد، پھر تاج و تخت نصیب ہُوا۔ تو گردن خود بخود، ربِّ کارساز کے سامنے سجدۂ شکر میں جُھک جاتی۔

شاہانِ سُور نے علما کو بڑا زور و اقتدار دے رکھا تھا۔ اِس میں مُلکی مصلحتیں بھی تھیں۔ اور طبیعت کا لگاؤ بھی۔ اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا۔ جا بجا قاضی و مفتی مقرر کئے۔ مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ اور صدر الصدور کو وہ اختیار دیئے۔ کہ نہ اس سے پہلے، نہ اس کے بعد ملے ہوں گے۔ خود ان کی دلی قدر کرتا۔ مخدوم الملک تو امورِ مُلکی میں اس کے مشیر اور رُکنِ سلطنت تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سُننے ان کے گھر پر جاتا۔ ایک دفعہ جُوتے ان کے

سامنے اُٹھا کر رکھے۔ شاہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا۔ تاکہ جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدر، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔ اور تقوئے و پرہیزگاری میں فرد تھے۔ ان کی تلقین و تعلیم اور فیضِ صحبت سے یہ حال ہُوا۔ کہ نمازِ باجماعت کی پابندی تو ایک طرف، خود اذان دیتا، امامت کرتا۔ اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

اکبر کا جو اپنا رنگِ طبیعت تھا۔ وہ خانگی اثرات سے اور گہرا ہو گیا۔ ایک دفعہ اس کا عالمِ شباب تھا۔ جشنِ سالگرہ کی تقریب پر لباسِ زعفرانی پہن کر محلسرائے سے باہر آیا۔ صدر الصدور نے سرِ دربار ٹوکا اور اِس شدّت کے ساتھ، کہ عصا کا سرا بادشاہ کو جا لگا۔ اکبر چُپ ہو رہا۔ لیکن اندر جا کے ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا۔ کہ بیٹا، یہ رنج کا مقام نہیں، باعثِ نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا۔ کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مارا، اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا!

ایک دفعہ سُلطان الہند خواجہ اجمیریؒ سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ اور پھر تو یہ حال ہُوا۔ کہ سال بسال اجمیر جاتا تھا۔ کوئی مہم یا خاص مراد ہو۔ تو اس کے علاوہ بھی۔ ایک منزل سے پیادہ پا ہونا تھا۔ اور بعض منتیں (مثلاً جہانگیر کے تولّد سے پہلے) تو ایسی بھی ہُوئیں۔ کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک، پا پیادہ گیا۔ وہاں ہزاروں، لاکھوں روپے کے چڑھاوے چڑھاتا۔ اور پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔ فوج کا نعرہ، "یا ہادی، یا معین" تھا۔ اور علامہ شیرانی کا

خیال ہے۔ کہ حضرت خواجہ بزرگؒ کو دسویں صدی ہجری سے جو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں اکبر کی ارادتمندی کو بھی بہت دخل تھا۔

عبادت خانہ

مذہبی امور سے اکبر کو شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ وہ مشائخ و علما کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ اور عام صحبتوں میں بھی خداشناسی۔ معرفت۔ شریعت اور طریقت کی باتیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتیؒ کا بڑا معتقد تھا۔ اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصولِ برکت کے لئے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا۔ اور انہی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا۔ کہ جو جگہ اتنی رُوحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر کر کے اُسے ظاہری رونق بھی دی جائے۔ چنانچہ ۱۵۷۱ء میں فتحپور سیکری کی شاندار عمارتیں شروع ہوئیں۔ اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہِ ہند کا پایۂ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں۔ دُعاؤں اور عبادتوں میں گذارتا اور مذہبی امور میں بآلاخر اُس کی دلچسپی اتنی بڑھی۔ کہ ۱۵۷۵ء میں اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار خاص ہوتا تھا۔ جس میں مشائخ وقت۔ علما و فضلا اور چند مقرب درگاہ شریک ہوتے تھے۔ اور خداشناسی اور حق پرستی کی حکائتیں اور روائتیں بیان ہوتی تھیں۔

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا۔

لیکن بالآخر انہی نے اسے بدمذہبی کا رستہ دکھایا۔ اور اس کا ایک باعث ان علما و فضلا کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست پر جھگڑے شروع ہوئے کہ فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے۔ اور مَیں اس سے نیچے کیوں رہوں۔ جب یہ قضیہ طے ہُوا۔ تو ہر شخص چاہتا تھا کہ مَیں اپنی فضیلت اور دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا جس سے بادشاہ کا دِل کھٹا ہوگیا۔ اور اس نے کہا، کہ جو کوئی نامعقول باتیں کرے۔ اسے محفل سے اُٹھا دیا جائے۔ ملّا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ اس وقت آصف خاں پاس کھڑا تھا۔ مُلّا صاحب نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ کہ اگر یہی بات ہے، تو بہتوں کو اُٹھنا پڑے گا!

اپنی عزت اور دوسروں کی خفّت کے لیے، علم و مذہب کے دعویدار، جو حربے استعمال کرتے تھے۔ ان کا اندازہ ایک لطیفے سے ہوتا ہے، جسے بدایونی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ جب مرزا مفلس نے دربارِ شاہی میں ایک تفسیر پیش کی۔ تو اس وقت حاجی ابراہیم سرہندی نے ان سے سرِ دربار پوچھا۔ کہ آپ یہ تو بتائیے۔ کہ موسلے کا کیا صیغہ ہے۔ اور اس کا ماخذِ اشتقاق کیا؟ مرزا، علومِ عقلی میں مانے ہُوئے تھے۔ لیکن اس سوال کا ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یار لوگ لے اُڑے۔ کہ حاجی نے مرزا مفلس کو لاجواب کر دیا۔ اور اُس جیسا کوئی لائق نہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد، بادشاہ نے ایک عالم سے پوچھا کہ تم ہماری علمی مجلس میں کیوں نہیں آتے۔ تو وہ بچارا کہنے لگا۔ کہ مَیں آؤں تو سہی، لیکن اگر وہاں، حاجی ابراہیم

مجھ سے پوچھیں۔ کہ علیٰ کیا صیغہ ہے۔ تو فرمائیے کیا جواب دوں!

اکبر کی اس مجلس میں ملک بھر کے منتخب علما آتے تھے۔ لیکن اسے علمی مجلس کہنا تکلف ہے۔ جو لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان کا مقصد علم کی توسیع نہ تھا بلکہ مخالفین کی تضحیک و توہین۔ جب مُلّا عبدالقادر بدایونی اس مجلس میں پہلے پہل آئے۔ تو اُنہوں نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور، حاجی ابراہیم سرہندی اور دوسرے قدامت پسندوں کو نیچا دکھا کے اپنی سربلندی کا سامان کیا۔ بادشاہ انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔ کہ یہ حاجی کا سر پھوڑنے والا آگیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے حاجی کو خوب خوب الزام دئے۔ اور شیخ عبدالنبی کی بھی خوب خبر لی۔

مُلّا صاحب نے ان بحثوں کی جو افسوس ناک بلکہ شرمناک داستان لکھی ہے اس کا خلاصہ آزاد کی زبان سے سنئے:۔

"علماء کا یہ عالم تھا کہ زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پلے پڑتے تھے۔ کٹ مرتے تھے اور آپس میں تکفیر و تذلیل کر کے ایک دوسرے کو فنا کئے ڈالتے تھے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ شیخ صدر اور مخدوم الملک کا یہ حال تھا کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا گریبان۔ دونوں طرف کے روئی تورٹا اور شر دے چٹ مُلّانوں نے دو طرفہ دھڑے باندھے ہوئے تھے۔ گویا فرعونی دَور تھا۔ سبطی اور قبطی دونوں گروہ حاضر تھے۔ ایک عالم ایک کام کو حلال کہتا تھا۔ دُوسرا اس کو حرام ثابت کرتا تھا۔ بادشاہ انہیں اپنے عہد کا امام غزالیؒ اور امام رازی سمجھے ہوئے تھا۔ جب ان کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گیا"

مخدوم الملک اور صدر الصدور حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے زمانے میں

مذہب اسلام پر ہندوستان میں جو نازک وقت آیا اس کی ذمہ داری
بڑی حد تک اس زمانے کے علما پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بااثر
مخدوم الملک مُلا عبداللہ سُلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور تھے۔
مخدوم الملک فرقۂ انصار سے تھے۔ مولینا عبدالقادر سرہندی سے کسب علم
کیا۔ فقہ اور دوسرے اسلامی علوم میں کمال حاصل کیا اور سیرت کی ایک کتاب
کے علاوہ شرحِ مُلا پر حاشیہ بھی لکھا۔ جب ان کا شہرہ بلند ہُوا۔ تو ہمایوں
بادشاہ نے انہیں مخدوم الملک کا خطاب دیا۔ شیخ الاسلام کا خطاب اُنھوں
نے شیر شاہ سے حاصل کیا۔ جب وہ مرا اور سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ تو
ان کا زور اور دبدبہ اور بھی بڑھ گیا۔ سلیم شاہ جانتا تھا کہ عوام کے دلوں پر
ان کی باتوں کا اثر ہے اور وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کا بڑا
ادب کرتا تھا۔ اور ملاقات کے وقت اپنے برابر بٹھایا کرتا تھا۔ مخدوم الملک
نے اپنا اختیار و اقتدار دو کاموں کے لئے استعمال کیا۔ ایک تو کسب زر
کے لیے اور دوسرے فسادِ مملکت کا خطرہ دکھا کے ہر اُس عالم اور درویش
کو اذیت پہنچانے کے لئے جو ان سے کسی مسئلے میں اختلاف رکھتا تھا۔ جمع
اموال کا یہ عالم تھا کہ جب وہ مرے تو تین کروڑ روپے نقد ان کے گھر سے
نکلے۔ اُن کے گورخانے میں سے چند صندوق ملے۔ جن میں سونے کی
اینٹیں چُنی ہُوئی تھیں اور جو مُردوں کے بہانے سے دفن کئے ہوئے تھے۔
یہ صحیح ہے کہ مخدوم الملک نے ترویج شریعت میں کوشش کی۔ لیکن اسمیں
اُنھوں نے حد سے زیادہ تشدّد اور غلو کیا۔ اس زمانے میں مہدویہ فرقہ

زوروں پر تھا۔ اور چونکہ اس جماعت کی بعض باتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعمیل میں تھیں اس لئے کئی نیک اور مخلص لوگ اس میں شریک ہو گئے تھے۔ اور بعض لوگ، جو مہدی جونپوری کے قائل نہ تھے۔ وہ بھی مہدویوں کے طور طریقوں کی قدر کرتے تھے۔ مخدوم الملک ان سب کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے مہدویت کا الزام دے کر بڑے بڑے پاکباز اور قابلِ عزت بزرگوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ شیخ علائیؒ کو جن کی نیکی۔ حق پرستی اور علم و فضل کے سب مورخ گواہ ہیں۔ مخدوم الملک نے ذاتی مخالفت کی بنا پر اور غلط تہمتیں لگوا کر کوڑوں سے پٹوایا۔ جس سے وہ شہید ہو گئے۔ شیخ داؤدؒ کو بھی انہوں نے اسی طرح تنگ کرنے کی کوشش کی۔ کسی پر مہدویت کی تہمت لگتی۔ کسی کی تصنیفات کے متعلق کہا جاتا۔ "ازو بوئے رفض می آید" غرض ان کا شکنجہ ہر ایک کے لئے تیار رہتا تھا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ "چوں ملا را عصبیت (کہ آنرا حمیتِ دین نامند) بیشتر بود۔ در پردہ دینداری استیفائے قوتِ غضبی بروجہ اتم مے نمود"۔ اور تو اور، بدایونیؒ ان کے تعصب کا شاکی ہے۔ ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ وہ علوم ظاہری میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مذہبی اور روحانی زندگی ان لوگوں کی طرح تھی۔ جو نماز کے متعلق تمام مسائل تو بتا سکتے ہیں۔ اور ہر وقت کتاب الصلوٰۃ اپنی بغل میں رکھتے ہیں لیکن عملاً نماز نہیں پڑھتے۔ زکوٰۃ کے مسائل وہ بہت بتاتے تھے۔ لیکن اپنا عمل یہ تھا کہ سال کے اخیر میں تمام مال بی بی کو ہبہ کر دیتے اور وہ نیک بخت سال کے اندر پھر انہیں واپس کر دیتی۔ تاکہ اس

حیلۂ شرعی سے زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ اسی طرح جب حج کے متعلق اِن سے کوئی پُوچھتا کہ "بر شما حج فرض شدہ ؟" تو جواب ملتا "نے" وجہ یہ بتاتے تھے کہ خشکی سے جائیں۔ تو رافضیوں کے مُلک سے گزرنا پڑتا ہے تری کی راہ جائیں تو فرنگیوں سے عہد و پیمان کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلّت ہے۔ پس دونوں طرح ناجائز ہے!

شیخ عبد النبی صدر الصدور، مخدوم الملک سے عمر میں چھوٹے تھے اور انکی طرح غاصب اور ظالم نہ تھے۔ لیکن مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں صدر الصدور کے دستخط سے ملتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس ضمن میں شیخ کے متوسلین رشوت لیتے تھے۔ لیکن شاید اس سے بھی زیادہ جس چیز نے انہیں نقصان پہنچایا وہ مخدوم الملک کا عناد اور دربار کا نیا رنگ تھا۔ مخدوم نے عبادت خانے کے مباحثوں میں ان پر نکتہ چینی شروع کی۔ ان کے خلاف رسالے لکھے جن میں اس قسم کی باتیں تھیں کہ شیخ عبد النبی نے خضر خان شروانی کو پیغمبر صاحب کو بُرا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفض کے الزام میں ناحق مار ڈالا۔ اپنے والد سے حرمتِ سماع کے متعلق شیخ عبد النبی کا اختلاف تھا اور شاید والد نے انہیں علیحدہ بھی کر رکھا تھا۔ مخدوم الملک صاحب نے فتوےٰ دیا کہ شیخ کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ کیونکہ اُسے باپ نے عاق کر دیا ہے۔ اور اسے خونی بواسیر بھی ہے۔ جب مخدوم الملک نے اِس طرح صدر الصدور کی مخالفت اور بے عزتی شروع کی۔ تو اُنہوں نے بھی مخدوم پر بے علمی اور گمراہی کے الزام لگائے اور علما کے دو گروہ ہو گئے جو نئے نئے مسئلوں میں جھگڑتے اور

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے ایک دوسرے کو ذلیل کرتے۔

بدایونی نے عہدِ اکبری کی جو مذہبی تاریخ لکھی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اکبر نے علما کا اقتدار ان کی کج بحثیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا۔ مولینا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں مذہبی خرابیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے۔ اور حضرت مجدد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے۔ "ہر فتورے کہ دریں زماں در ترویجِ ملت و دیں ظاہر گشتہ۔ از شومئے علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرارِ مردم و لصوصِ دین اند۔" ہماری رائے ہے کہ مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہے اور اکبر کی بیراہہ روی کا باعث اس سے زیادہ گہرا تھا۔

مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں۔ اور ہم نے انہیں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن اکبر کے علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابلِ اعتراض باتیں نہ تھیں۔ بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویج شرع کی کوششیں بھی وجہِ مخاصمت ہوئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے۔ کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جائز اور وزنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی دیانتداری پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکامِ شرع کی پابندی میں سخت تھے۔ لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اور جس واقعہ پر اکبر اور ان کا سخت اختلاف ہوا۔ اس میں نوے فیصدی علما بلکہ زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔ مخدوم الملک میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں۔ لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے۔ یعنی شدتِ احتساب، وہ بھی شرعی نقطۂ نظر سے خوبی ہے۔ برائی نہیں۔ انہوں نے شیخ ابو الفضل کی نسبت جو کہا تھا۔ کہ پتہ نہیں

اِس سے دِین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے۔ اسے بھی واقعات نے درست ثابت کیا اور شیخ مبارک کی پختگیٔ عقائد کی نسبت انہیں جو شبہے تھے۔ وہ بھی بیجا نہ تھے۔ شیعوں کی نسبت ان کا جو نقطۂ نظر تھا۔ وہی حضرت مجدد الف ثانی کا تھا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلامی ہندوستان میں مذہبی بے قاعدگیاں بہت تھیں۔ لیکن افغان بادشاہوں، بالخصوص سکندر لودھی اور سلیم شاہ سوری نے ان کے قلع قمع کے لئے اہلِ شرع کے ہاتھ میں بڑے اختیارات دے رکھے تھے۔ اور مخدوم الملک نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق انہیں شدّت سے استعمال کیا۔

مُلکی مصلحت کی رُو سے یہ طرزِ عمل مضر سہی، اور مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اس کا فائدہ عارضی اور ظاہری ہوتا ہے۔ لیکن شرع کی رُو سے تو شرع کی پابندی قابلِ اعتراض نہیں۔ مخدوم الملک میں جو شخصی عیوب تھے۔ حضرت مجدد ان سے مبرا اور پاک تھے۔ اور ان کی رُوحانی بزرگی اور پاکیزگی کا عشرِ عشیر بھی مخدوم کو نصیب نہیں ہوا لیکن ترویجِ شرع اور ردِّ بدعت میں وہ بھی اسی طرح تیغ برہنہ تھے۔ جس طرح مخدوم الملک۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ اگر مخدوم الملک کی مسند پر حضرت مجدّد جلوہ فرما ہوتے۔ تو اِس معاملے میں وہ بھی مخدُوم کے نقشِ قدم پر چلتے۔ اور عہدِ اکبر کی کشمکش پھر بھی رُونما ہوتی!!

عُلما اور اکبر کے درمیان جو اصل وجہِ مخاصمت تھی۔ اسے خود اکبر نے عبداللہ خاں ازبک کے نام ایک خط میں واضح کر دیا ہے۔ اور عقل و براہین کی اہمیت بتاتے ہُوئے علماءِ دربار کی شکایت کی ہے۔ "مے خواہند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند" اور یہ بیان غلط نہ تھا۔ خاندانِ سُور کے عہدِ حکومت اور اکبر کے ابتدائی ایام میں مخدُوم الملک اور صدر الصدور کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔

شرع کی ترجمانی ان کا کام تھا۔ اور ملک کا قانون ان کے ہاتھ میں تھا۔ کئی باتوں (مثلاً متعہ) میں بادشاہ کی کچھ مرضی ہوتی ہوگی۔ اور ان بزرگوں کے فیصلے کچھ اور۔

اکبر جیسے خودسر اور آزادخیال بادشاہ کو جس نے چند سالوں میں بیرم خاں جیسے کارگزار اتالیق کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا تھا۔ یہ کیسے گوارا ہوسکتا تھا۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ جن اصولوں پر مجھے ملک کا نظم و نسق قائم کرنا ہے۔ وہ علما کے بڑھے ہوئے اختیار کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ علما کا زور توڑنے کے درپے ہوا۔ اتفاق سے جیساکہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ شیخ مبارک، اُن کے بیٹے اور بدایونی آن پہنچے۔ اور ان کی مدد سے یہ مشکل حل ہوگئی۔

اکبر اور علما کی کشمکش فی الواقعہ (کلیسا یا ارباب شرع) Church اور (حکومت) State کی کشمکش تھی۔ جس میں حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ بدقسمتی سے اکبر کی اپنی مذہبی طبیعت کی وجہ سے یہ کشمکش دنیوی امور تک محدود نہ رہی، بلکہ مذہبی امور و عقائد پر بھی اس کا اثر ہوا۔ لیکن اس کی تہ میں دنیوی اقتدار کا سوال تھا۔ اور اکبر اور علمائے دربار کے درمیان اصلی وجہ مخاصمت یہ تھی۔ کہ بادشاہ مختارِ کل ہے۔ یا علما کے فتووں کے تابع!

علما کا زوال

جن دنوں عبادت خانے کے مباحثوں میں مخدوم الملک اور دوسرے علما دنیا کو عجیب تماشا دکھا رہے تھے۔ دربار شاہی میں ایک ایسا شخص آپہنچا۔ جس نے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھایا تھا۔ یہ شخص ابوالفضل اور فیضی کا باپ شیخ مبارک تھا۔ شیخ کو علمائے دربار کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچی تھیں۔ انہیں ابوالفضل نے بالتفصیل

اکبر نامہ کے اخیر میں گنایا ہے۔ اور بدایونی نے بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خاندان کی سرگزشت لکھی ہے۔ اُس کا بیان ہے۔ کہ جن دنوں میر حبش اور دوسرے اہلِ بدعت گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں، شیخ عبد النبی صدر الصدور اور مخدوم الملک وغیرہ نے مل کر بادشاہ کے حضور میں عرض کی۔ کہ شیخ مبارک مہدوی بھی ہے۔ اور اہلِ بدعت (شیعہ) بھی۔ خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ کہکر برائے نام اجازت لی اور شیخ کا خاتمہ کرنے کے درپے ہوئے۔ محتسبوں کو بھیجا۔ کہ شیخ کو حاضر کریں۔ لیکن شیخ بچوں سمیت روپوش ہوگیا۔ وہ ہاتھ نہ آیا۔ اور محتسب اس کی مسجد کا منبر توڑ کر ہی واپس آگئے!

شیخ اور اس کے بیٹوں کو روپوشی اور فرار کے زمانے میں جو تکلیفیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ ان کی تفصیل اکبر نامہ میں موجود ہے۔ انہیں دیکھ کر یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ شیخ مُبارک اور اس کے بیٹوں نے درباری علما کا قلع قمع کرنے میں کیوں سر توڑ کوشش کی!!

مدت دراز کی سرگردانی کے بعد مرزا کوکہ کی سفارش سے شیخ کی گلوخلاصی ہوئی۔ اُنہوں نے شیخ کی درویشی اور علم و فضل کی تعریف کی۔ اور بادشاہ سے اُسے گھر جانے اور اپنا درس شروع کرنے کی اجازت دِلوائی۔ شیخ کا بڑا بیٹا فیضی تھا۔ ۱۵۶۷ء میں وہ شاعری کے ذریعے دربار میں پہنچا۔ اور مارچ ۱۵۷۴ء میں ابو الفضل بھی دربار میں آکر میر منشی ہوگیا۔ یعنی جب عُلمائے دربار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ شیخ مُبارک اور اُسکے بیٹوں کا سُورج طلُوع ہُوا۔

مولٰینا آزاد عبادت خانے کے مباحثوں کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:-

"اِن دنوں شیخ ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ اِس فضیلت کی جھولی میں دلائل کی کیا کمی تھی۔ اور اس طبع خداداد کے سامنے کسی کی حقیقت کیا تھی۔ جس بات کو چاہا۔ چُٹکی میں اُڑا دیا۔ بڑی بات یہ تھی۔ کہ شیخ اور شیخ کے باپ نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھ سے برسوں تک زخم اُٹھائے تھے۔ جو عُمروں میں بھرنے والے نہ تھے۔ علما میں خلاف و اختلاف کے رستے تو کُھل ہی گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت ہو گئی کہ فروعی مسائل تو درکنار رہے۔ اصولی عقائد میں بھی کلام ہونے لگے۔ اور ہر بات پر طُرّہ یہ کہ دلیل لاؤ، اور اُس کی وجہ کیا؛ اور خیالات یہ ہوئے کہ مذہب میں تقلید کچھ نہیں۔ ہر بات کو تحقیق کر کے اختیار کرنا چاہیئے۔"

شروع شروع میں یہ مباحثے فقط مُسلمان علما میں ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اسلام اور دوسرے مذہب یکساں ہو گئے اور پہلے تو مسلمان آپس میں مختلف مسائل پر جھگڑتے تھے۔ اب پرتگیزی پادری۔ پارسی دستور اور جین سادھو بھی ان بحثوں میں شریک ہو گئے۔

اکبر ان مباحثوں کی وجہ سے عام عُلما سے بدظن تو ہو ہی رہا تھا ۱۵۷۹ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے علما کے اختیارات کو کم کر دیا۔ شیخ عبد النبی نے ان دنوں ایک مجرم کو جو اکبر کی رانی جودھ بائی کا پروہت بھی تھا۔ ایک سنگین جرم کی پاداش میں قتل کروایا۔ مُعترض کہتے تھے کہ جرم تو ثابت ہے۔ لیکن سزا قتل کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتی تھی۔ اور امام اعظم کا فتوے سُناتے تھے۔ کہ کفار مطیع اسلام، پیغمبرؐ کی شان میں بے ادبی کرے۔ تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ نہیں ہوتا شیخ عبد النبی

نے قتل کرانے وقت بادشاہ کا حکم نہ لیا تھا۔ چنانچہ اکبر بہت خفا ہُوا۔ اس کے علاوہ اندر سے رانیوں اور باہر سے راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان مُلانوں کو حضور نے اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لئے لوگوں کو بے حُکم قتل کر ڈالتے ہیں۔ انہی دنوں شیخ مُبارک کسی تقریب سے حضور میں آئے۔ علما کی وجہ سے جو دقتیں پیش آتی تھیں۔ اکبر نے ان کے سامنے بیان کیں۔ شیخ نے کہا۔ کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ مسئلہ اختلافی میں بہ مناسبت وقت جو مصلحت دیکھے، حکم فرما سکتا ہے۔ اور علما و مجتہدین کی رائے پر اس کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ شیخ نے آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے اس مضمون کا ایک محضر مرتب کیا۔ اس پر علما کی مُہریں حاصل کیں۔ اور شیخ صدر اور مخدوم الملک کو حج کے لئے روانہ کر دیا۔

یہ محضر حسب ذیل تھا:-

مقصود از تشئید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آنکہ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان بیامن معدلت سُلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و اماں و دائرۂ عدل و احساں شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصُوصاً علمائے عرفاں شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیاں بادیۂ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند۔ از عرب و عجم رُو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوئیے معقول و منقول اند۔ و بدین و دیانت و صیانت اتصاف دارند۔ بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیۂ کریمہ

"اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذالک من الشواہد العقلیہ و الدلائل النقلیہ" قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبۂ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبۂ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علے العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللہ اند۔

بنا بریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات، بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند۔ متفق علیہ مے شود و اتباع آں بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و متحتم است۔ و ایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد۔ عمل براں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالف آں موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی ست۔ و ایں سطور صدق و فور حسبۃً للہ و اظہار الاجراء اے حقوق الاسلام بمحضر علمائے دین و فقہائے مہدیین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر رجب سنہ ۹۸۷ھ سبع و ثمانین و تسعمائۃ +

یہ محضر ۲۰ فروری ۱۵۷۹ء کو مرتب ہوا۔ اگرچہ اس میں توضیح[1] کردی گئی تھی۔ کہ

---

[1] مولینا ابو الکلام آزاد اس محضر کا خلاصہ دے کر لکھتے ہیں۔ "اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔
(باقی اگلے صفحہ پر)

امامِ عادل کو مجتہدین اور علما سے انہی باتوں میں زیادہ اختیار ہوں گے ۔ جو نصِ شرعی کے مخالف نہ ہوں ۔ لیکن اکبر اس وقت شرعی معنوں میں امامِ عادل نہ رہا تھا ۔ وہ اپنی حکومت اور رعب و دبدبہ کے نشے میں بہت اونچا اڑ رہا تھا ۔ اور اسلام سے روز بروز دور ہوتا جاتا تھا ۔ ابھی تک اکبر نے مصلحتِ وقت کے لحاظ سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا تھا ۔ جس پر عام مسلمان معترض ہو سکیں ۔ اور لوگوں کی تسلی کیلئے ایسے کام کرتا تھا جن سے اس کی بد اعتقادی پر پردہ پڑا رہے ۔ لیکن جو لوگ دربار کے رازدار تھے وہ کہتے تھے ۔ کہ بادشاہِ ہندوستان نمرود اور فرعون کی ہمسری کرنے والا ہے ۔ ۹۸۷ھ میں (جو محضر کا سال رقم بھی ہے) تجویز ہوئی کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ[1] کہا کریں ۔ لیکن لوگوں کے شور و شرابے کا خیال تھا ۔ اس لئے کہتے تھے کہ باہر نہیں محل میں کہا کرو ۔ ملّا بدایونی کو ان تجاویز کا پتہ تھا ۔ لیکن وہ رازداری کرتے رہے ۔ اتفاق سے جونپور کے قاضی القضاۃ ملّا محمد یزدیؒ کو بھی ان باتوں کا پتہ چل گیا ۔ انہوں نے علی الاعلان فتوے دیا ۔ کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے ۔ اس پر جہاد واجب ہے ۔ دربار میں بھی قطب الدین خاں کوکہ[2] اور شہباز خاں کمبوہ نے بڑی جرأت سے بادشاہ سے کہا ۔ کہ اپنے خیالِ خام سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)

فی الحقیقت خلیفۂ وقت و اربابِ حل و عقد و اصحابِ شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حقِ اجتہاد حاصل ہے اور اسکے سدِّ باب نے تاریخِ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی" (تذکرہ صفحہ ۲۰)

[1] بادشاہ کو خلیفۃ اللہ کہنے کا طریقہ عہدِ عالمگیری میں بھی جاری رہا ۔ لیکن اس طرح نہیں ۔ کہ کلمۂ توحید کا جزو ہو جائے ۔ [2] کیا یہ وہی مرزا قطب الدین کوکلتاش ہیں ۔ جو جہانگیر کے کوکہ تھے ۔ اور جنہوں نے بعد میں جہانگیر کو ابو الفضل کے قتل کرانے کا مشورہ دیا ؟؟

باز رہے۔ لیکن حکومت اور اقتدار کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ اکبر اور بگڑا۔ قطب الدین خان اور شہباز خاں کو بُرا بھلا کہا۔ اور مُلا محمد یزدیؒ اور معزالملکؒ (قاضی القضاۃ بنگال) وغیرہ کو ایک بہانے سے بُلا بھیجا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے۔ تو حکم بھیجا۔ کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جون کے رستے گوالیار پہنچا دو۔ جہاں مجرمانِ سلطنت کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہُوا۔ کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرے داروں نے دونوں کو ایک ٹوٹی ہُوئی کشتی میں ڈالا۔ اور تھوڑی دُور آگے جا کر گرداب کی گور میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد قاضی یعقوبؒ بھی بُلائے گئے۔ اور انہیں اور دوسرے علما کو جن پر شُبہ تھا ایک ایک کر کے عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا گیا۔

اکبر نے ان بزرگوں کو مکاری اور حیلہ سازی سے کسی مقدمے یا داد فریاد کے بغیر شہید کروا دیا۔ لیکن اس سے اُس کا کام کچھ آسان نہ ہُوا۔ ملک میں اس کے عقاید کے خلاف عام شورش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے:۔

"۱۵۸۱ء کا سال اکبر کی زندگی کا نازک ترین سال تھا۔ مُلا محمد یزدیؒ نے ۱۵۸۰ء کے شروع میں اکبر کے خلاف فتوےٰ دیا تھا۔ اور اِس زمانے میں بہار اور بنگال میں اس کے خلاف جو بغاوت ہو گئی تھی وہ ابھی تک نہ تھمی تھی۔ بلکہ ٹوڈرمل جو اسے مٹانے گیا تھا۔ خود مُنگیر میں محصور ہو گیا تھا"

اس کے علاوہ جو لوگ اکبر کی بد اعتقادی سے نالاں تھے۔ اُنہوں نے فقط صُوبجاتی بغاوت پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ عملی طور پر اس بات کی کوشش کی۔ کہ کسی طرح اکبر کو تخت سے برطرف کر کے اُس کی جگہ اُس کے بھائی مرزا محمد حکیم حاکمِ کابل کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیں۔ اِس تجویز کے محرّک غالباً جونپور کے

جاگیردار خان معصوم خاں تھے۔ جن کی خط وکتابت مرزا حکیم سے تھی۔ اُن کے علاوہ خواجہ شاہ منصور کو بھی جو اکبر کے نہایت قابل دیوان تھے اور جنہوں نے ہندوستان میں دہ سالہ بندوبست کا سلسلہ شروع کیا۔ مرزا حکیم سے خط وکتابت کی غلط تہمت میں پھانسی دی گئی۔ لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔ مرزا حکیم لاہور تک آگیا۔ لیکن اُس میں اکبر کی سی حکمت عملی اور قابلیت نہ تھی۔ وہ اکبر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اکبر نے خود کابل تک اُس کا پیچھا کیا۔ اس دوران میں مشرقی صوبوں میں بھی بغاوت فرو ہو گئی۔ جو تھوڑی بہت شورش ہوتی رہی اُسے بعد میں شہباز خاں اور خانِ اعظم نے فرو کر دیا۔

دینِ الٰہی

جب اکبر کے مخالف اس طرح ناکام رہے تو اس نے مذہبی امور میں زیادہ مطلق العنانی شروع کی۔ پارسی دستور اس سے پہلے دارالسلطنت میں آئے تھے۔ اب گوا سے پرتگیز پادری بھی آ گئے۔ تاکہ اکبر کو عیسائی بنائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مذہبی مباحث میں اسلام اور بانئے اسلام کے خلاف بہت کچھ کہنا شروع کیا۔ مسلمان مورخوں نے تو شاید بے ادبی کے خیال سے ان لوگوں کی خلافِ تہذیب باتوں کو درج نہیں کیا۔ لیکن اسمتھ صاحب نے پرتگیزی تصانیف کے حوالے سے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۵ پر ان لوگوں کے جو بیانات نقل کئے ہیں۔ ان سے ان لوگوں کی علمیت اور خوش اخلاقی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پرتگیزوں کا خیال تھا۔ کہ مسلمانوں کا رکوع وسجود ونماز (نعوذ باللہ) رسول اللہ کی پرستش ہے۔ اور وہ بانئے اسلام کی شان میں سرِ دربار بے ادبی کرتے تھے۔

پتہ نہیں۔ اِن لوگوں کے اخلاقِ حسنہ کے متعلق کیا کہا جائے۔ جو بانیانِ مذاہب کو کسی وجہ یا محل کے بغیر رکیک اور گندے الفاظ سے یاد کرنا بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ لیکن بہرکیف یہ لوگ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہُوئے۔ عیسائیت کے علاوہ اکبر نے جین مذہب کے متعلق بھی واقفیت حاصل کرنی چاہی۔ اس نے جین سادھو ہیرا دجے کو (جس نے بعد میں خودکشی کر کے اپنے خیال میں مُکتی حاصل کی)، فتحپور بُلایا۔ اُس سے جین مذہب کی باتیں سیکھیں۔ اور بعض باتیں کچھ دیر کے لئے اختیار بھی کیں۔ لیکن اگر اکبر اسلام کی مروّجہ صُورت سے بدظن ہو گیا تھا۔ تو وہ پارسی، عیسائی، جین یا ہندو مذہب کا بھی قائل نہ ہُوا۔ اور بالآخر اُسے اپنا جُدا مذہب دینِ الٰہی کے نام سے شروع کرنا پڑا۔

اس مذہب کی بنا ۱۵۸۲ء میں رکھی گئی۔ اس کی تشکیل میں دربار کے کئی امرا کو دخل تھا۔ لیکن خلیفہ اوّل شیخ ابوالفضل چُنے گئے۔ دینِ الٰہی اکبر شاہی کے کے متعلق صحیح طور پر واقفیت بہم پہنچانا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ مختلف سالوں میں اُس نے مُختلف صورتیں اختیار کیں اِس کے علاوہ دینِ الٰہی کے ارکان اور بادشاہی چیلوں کے طور طریقے بھی تاریخ کی کتابوں میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ لیکن عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے پیرو "السلامُ علیکم" کی جگہ "اللہ اکبر" اور اس کے جواب میں "جل جلالہٗ" کہتے۔ اِسی طرح بادشاہ نے مُہر کا سجع "اللہ اکبر" رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان فقروں میں ابہام ہے۔ لیکن اکبر نے کئی باتیں ایسی کہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدائی کا دعوےٰ قطعاً نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب حاجی ابراہیم سرہندی نے مُہر کے متعلق کہا کہ اس سے شُبہ پڑتا ہے۔ تو

اکبر نے کہا۔ کہ ضعیف۔ عاجز انسان کس طرح خدائی کا دعوے کر سکتا ہے۔ سچ ہیں فقط ایک "مناسبت لفظی" ہے۔ اسے دوسری طرف لے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سچ بھی دینِ الٰہی کی تاسیس سے بہت پہلے تجویز ہوا تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ کہ دینِ الٰہی یا کم از کم بادشاہی مریدوں کے طریقے میں اکبر کو جو عظمت دی جاتی تھی وہ عبادت کے بہت قریب تھی[1]۔ جو کوئی یہ طریقہ اختیار کرتا۔ وہ بیعت کے وقت اپنا سر اکبر کے پاؤں پر رکھ دیتا۔ اسے تعلیم دی جاتی کہ وہ اخلاصِ چارگانہ کا لحاظ رکھے۔ یعنی ترکِ مال۔ ترکِ جان۔ ترکِ ناموس۔ ترکِ دین۔ بعض عقیدت مندوں نے اس پر بھی اضافہ کیا۔ اور جانی خاں حاکمِ ٹھٹھہ اور کئی دوسروں نے اس انداز کے اقرار نامے لکھ کر بھیجے:۔

منکہ فلاں ابنِ فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوقِ قلبی از دینِ اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابرا و تبرا نمودم و در دینِ الٰہی اکبرشاہی، درآمدم و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترکِ مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم"۔

دینِ الٰہی قبول کرنے والوں کو کئی رسمیں ادا کرنی پڑتی تھیں۔ جن کی تفصیل

---

[1] ان سب معلومات کا منبع بدایونی کی منتخب التواریخ ہے۔

[2] ونسنٹ اسمتھ صاحب یہ ثابت کرنے کی خاطر کہ "دینِ الٰہی" اسلام سے بالکل باہر تھا اور اسکے پیرو اسلام کو ترک کر دیتے تھے۔ ترجمہ کرتے وقت خط کشیدہ الفاظ کو بالکل حذف کر گئے ہیں (صفحہ ۲۱۵) اور حسبِ منشا نتیجہ نکال لیا ہے۔

درج کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مذہب بہت تھوڑے لوگوں نے اختیار کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثر بدعتیں اسلامی عقائد کی غلط ترجمانی کر کے جاری کی گئی تھیں۔ اور اکبر اور اس کے حواری کوشش کرتے تھے۔ کہ انہیں اسلام کے مطابق ثابت کریں۔ مثلاً بادشاہ کو سجدہ کرنا اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن آزاد اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"غازی خاں بدخشی نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کئے۔ غل مچایا۔ گفتگو کے سلسلے پھیل کر اُلجھے۔ معترض مُلانوں کے جوش نہ دم لیتے تھے۔ نہ لینے دیتے تھے۔ جو ان کے طرفدار بڑی ملائمت سے انہیں روکتے تھے۔ اور اپنی بُنیاد جمائے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ عہدِ سلف پر نظر کرو۔ اُمت ہائے قدیمہ کو دیکھو۔ وہ عموماً اپنے بزرگوں کے سامنے تحفۂ عجز و نیاز سمجھ کر ادب سے پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔ مثلاً ملائک کا سجدہ حضرت آدمؑ کو کیسا تھا؟

جواب۔ ظاہر ہے کہ تعظیمی۔

باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یُوسفؑ کو کیوں تھا؟

جواب۔ تحفۂ ادب پیش کیا تھا نہ کہ پرستش بندگی۔

بس وہی سجدہ یہ ہے۔ پھر انکار کیوں؟ اور تکرار کیا؟"

اِس مسئلہ کے متعلق شارح العارفین صاحب نے جو مولینا زکریا اجودھنی کے صاحبزادے اور شرح نزہت الارواح کے مصنف ہیں۔ بادشاہ کو عین واجب لاقل عکسِ واجب قرار دے کر سجدہ جائز ٹھہرایا۔ اور سجدے کا نام زمین بوس تجویز ہُوا۔

اِس طرح ذبیحہ گاؤ بند کرنے کے لئے بھی قرآن سے استدلال کیا گیا آزاد لکھتے ہیں:

"دیپ چند راجہ مجھولہ نے ایک جلسے میں کہا۔ کہ حضور! اگر گائے خدا کے نزدیک واجب التعظیم نہ ہوتی تو سب سے پہلے اس کا سورہ کیوں ہوتا؛ اس کے گوشت کو حرام کر دیا۔ اور تاکید سے کہہ دیا۔ کہ جو مارے گا۔ مارا جائے گا۔ حکما طب کی کتابیں لے کر تائید کو حاضر ہوئے۔ کہ اس کے گوشت سے زنگار رنگ کے مرض پیدا ہوتے ہیں۔ اور دیر ہضم ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ اس محفل میں کوئی پابندی نہ تھی۔ جس طرف بادشاہ کی طبیعت ہوتی۔ درباری اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ لیکن پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوشش کی گئی۔ کہ اسلام سے ہر اختلاف کے لئے کوئی سند لائی جائے۔ خواہ وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً ڈاڑھیاں منڈانے کے متعلق شیخ امان پانی پتی کے ایک بھتیجے مُلا ابو سعید نے فتوے دیا۔ وہ اپنے عم بزرگوار کے کتب خانے میں سے ایک کرم خوردہ کتاب لے کر تشریف لائے۔ اور اس میں سے حدیث دکھائی کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک صحابی آئے۔ بیٹا ساتھ تھا۔ اس کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ اہلِ بہشت کی ایسی ہی صورت ہوگی!!

اِس طرح معلوم ہوتا ہے کہ دینِ الٰہی کی بنیاد بھی انہی بہکانے والوں نے رکھوائی تھی۔ جو بادشاہ سے کہتے تھے کہ ہزار ہجری کے قریب اسلام مٹ جائیگا اور ایسا مذہب جاری ہوگا جس کے سب قائل ہوں گے۔

بعضوں نے قدیم رسائل سے ثابت کیا۔ کہ سنہ ۹۹۰ھ میں یہ نیا دور جاری ہوگا۔ اور بعض حکیم ناصر خسرو کی رباعی سناتے تھے ؎

در نہ صد و ہشتاد و نُہ از حکم قضا ـ آیند کواکب ز جوانب یک جا
در سالِ اسد، ماہِ اسد روزِ اسد ـ از پردہ بروں خرامد آں شیرِ خدا

مُخالفت

اکبر نے نئے مذہب میں کئی ہندوانہ رسمیں داخل کیں لیکن اگر اس نے یہ طرزِ عمل اس اُمید پر اختیار کیا تھا۔ کہ بہت سے ہندو یہ مذہب اختیار کر لیں گے تو اس میں اُسے ناکامی ہُوئی۔ کیونکہ اکبر کے درباریوں میں سے جن اٹھارہ آدمیوں نے یہ عقائد اختیار کئے۔ ان میں فقط ایک ہندو تھا۔ اور وہ بھی درباری مسخرہ بیربر! معاصرانہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سمجھ دار اور دیانتدار ہندوؤں نے اکبر کی خام خیالی کی مخالفت کی۔ ابوالفضل، راجہ ٹوڈرمل کی جابجا شکایت کرتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں بڑا اکٹر تھا۔ راجپُوت راجاؤں نے بھی جو مذہبی معاملات سے شاید اتنے واقف نہ تھے۔ اکبر کے نئے مذہب کو اختیار نہ کیا۔

جب اکبر نے دینِ الٰہی کے متعلق مجلس مشاورت منعقد کی۔ تو مخالفت کرنے والوں میں امیر الامرا راجہ بھگوانداس پیش پیش تھا۔ اُس نے کہا کہ مَیں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ہندو اور مسلمان، دونوں مذہبوں میں خرابیاں موجود ہیں۔ لیکن یہ تو بتایا جائے کہ ان سے بہتر فرقہ کونسا ہے۔ تاکہ ہم اس کے قائل ہو سکیں۔ چنانچہ بدایونی جس نے یہ گفتگو نقل کی ہے، لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ بھی لاجواب ہو گیا۔ اور راجہ کو قائل کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

اِس واقعہ کے چند سال بعد ۱۵۸۷ء میں جب راجہ مان سنگھ بہار کا گورنر ہو کر جانے لگا۔ اور اکبر نے خلوت میں خاص اظہارِ شفقت کر کے مُریدی کا

ذکر کیا۔ تو اُس نے صاف جواب دیا کہ حضور اگر مُریدی سے مُراد جاں نثاری ہے۔ تو آپ دیکھتے ہیں۔ کہ جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اور اگر حضور کی مُراد مذہب سے ہے تو ہندو ہوں۔ فرمایئے مسلمان ہو جاؤں دُوسرا رستہ مجھے معلوم نہیں۔ کونسا ہے کہ اختیار کروں۔ چنانچہ اکبر ٹال گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے سب دلی خیر خواہ ان عجیب و غریب خیالات کے مخالف تھے۔ اکبر اپنے امرا میں سے جس آدمی کی سب سے زیادہ قدر کرتا تھا وہ اس کا رضاعی بھائی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ تھا جو ایک قابل جرنیل تھا اور جس نے ۱۵۸۱ء میں اضلاع مشرقی کی بغاوت فرو کرنے میں اکبر کی بڑی مدد کی تھی۔ اس نے بھی اکبر کے مذہبی خیالات کو بدلتے دیکھا تو اُسے بار بار سمجھایا اور جب وہ نہ مانا تو ہندوستان چھوڑ کر مکہ مُعظمہ چلا گیا۔ اور وہاں سے ایک مفصّل خط اکبر کو لکھا۔ اس میں پھر اپنے خیالات دُہرائے:۔

جمعے کہ خاطرِ اشرف را از دینِ محمدی بیگانہ و مجتنب مے سازند۔ حاشا کہ دوست باشند۔۔۔۔ کایں دُنیا بازیچہ ایست ناپائدار۔ بر حرف دو سہ خوشامد گو آخرت بدُنیا فروش اعتماد نباید کرد۔۔۔۔ پیش ازیں سلاطین بُودہ اند۔ کہ ہمہ صاحب تمکین بودند۔ ہیچ بادشاہے را دغدغہ نہ شد۔ کہ دعوئے پیغمبری و نسخ دین محمدی نماید۔

اس زمانے کی مذہبی تاریخ کا عجیب بلکہ افسوسناک واقعہ یہ ہے۔ کہ خانِ اعظم نے جو دینِ الٰہی کی مخالفت کے لئے ہندوستان چھوڑ کر مکہ معظمہ چلا گیا تھا واپس آکر دینِ الٰہی خود اختیار کر لیا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کی وجہ ابو الفضل کی

وہ تاویلات اور دلائل تھے جو اس نے خان کے شبہات دُور کرنے کے لئے اس کے خطوط کے جواب میں لکھے۔ یا یہ کہ مکّہ معظمہ میں بزرگوں اور عالموں نے اُسے جس بے دردی سے لوٹا۔ اُس نے اُس کا دِل مذہب سے کھٹّا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدت مند لوگ مقدس جگہوں کے متعلق اپنے دِل میں ہمیشہ نیک خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن جس طرح کاشی میں ہندو زائرین اور بیت المقدس میں عیسائی زائرین کی نیک نیتی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ اِسی طرح مسلمانوں کے مذہبی مقامات بھی مذہب فروشوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور شائد انہی کی دُنیاداری نے خانِ اعظم کو بددِل کر دیا ہو۔

خانِ اعظم ۱۵۹۴ء میں مکّہ معظمہ سے واپس آیا تھا۔ دینِ الٰہی کے متعلق ۱۵۹۵ء کے بعد کوئی معاصرانہ ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ کہ بدایونی نے جو عہدِ اکبری کا مذہبی مورخ ہے۔ اپنی کتاب میں فقط ۹۶-۱۵۹۵ء تک کے واقعات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ شاید' اس کے بعد ان باتوں کی طرف اکبر کی توجہ بھی کم ہو گئی تھی۔ خانِ اعظم اب وکیل مطلق تھا۔ اور اگرچہ اس نے دینِ الٰہی قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس امر کی قوی شہادت موجود ہے۔ کہ اس کی اسلامی حس مُردہ نہ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ' جو لوگ اکبر کے رازدار تھے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے مر رہے تھے۔ شیخ مُبارک نے ۱۵۹۳ء میں انتقال کیا۔ ۱۵۹۵ء میں ایک طویل اور تکلیف دہ علالت کے بعد فیضی بھی مر گیا۔ ابوالفضل باقی رہ گیا تھا۔ اسے جہانگیر نے ۱۶۰۲ء میں مروا ڈالا۔

اس کے بعد اکبر تین سال تک زندہ رہا۔ جہانگیر کی چھوٹی تزک[۱] میں لکھا ہے

(۱) صفحہ آئندہ دیکھیئے

کہ مرتے وقت اکبر نے کلمۂ شہادت دُہرایا۔ سورۂ یٰسین پڑھوا کر سُنی۔ اور بطور ایک راسخ الاعتقاد مُسلمان کے مرا۔ سرتامس راؤ کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح جب پُرتگیز پادری بوٹیلو سے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہ نے پوچھا۔ کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہُوا۔ تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا۔ کہ میری تو خدا سے التجا تھی۔ کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط اُمیدیں دلاتا رہا۔ اور بالآخر آپ کے دینِ محمدی پر ہی مرا!

اس وقت اسلام کے لیے اکبر کے عقائد سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا۔ اکبر کا جانشین جہانگیر ہوا۔ اور اس نے عہدِ اکبری کے اکثر قواعد کو جو شرع اور اسلام کے خلاف تھے۔ موقوف کر دیا۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی۔ کہ جہانگیر کے بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو۔ خسرو کی بیوی خانِ اعظم کی بیٹی تھی۔ اور وہ راجہ مان سنگھ کا بھی قریبی تھا۔ ان دونو نے اس کے حق میں کوشش کی۔ لیکن شیخ فرید بخاری نے جنہیں بعد میں نواب مُرتضٰے خاں کا خطاب ملا۔ اور دوسرے مُسلمان امرا نے اس موقع پر بڑی قابلیت دکھائی۔

شیخ فرید ایک بہادر۔ قابلِ اعتماد اور متدین بزرگ تھے۔ اکبر اور جہانگیر دونوں ان پر بھروسا کرتے تھے۔ چنانچہ جب جہانگیر اکبر کے آخری ایام میں اس سے ملنے آیا۔ تو وہ

نوٹ صفحہ گذشتہ

اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔ لیکن چھوٹی تزک بھی بہت پُرانی۔ اور اسکے عہدِ شاہجہانی کے مستند قلمی نسخے ملتے ہیں۔ مآثر الامرا اور دربارِ اکبری کے مُصنفین نے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے۔

انہی کے ہاں مُقیم رہا۔ اکبر، ابو الفضل کے قتل اور بعض دُوسرے امور کی بنا پر بیٹے سے ناخوش تھا۔ اس کے سامنے شیخ فرید ہی نے جہانگیر کو پیش کیا۔ باپ بیٹے کی صُلح کرائی۔ اور جہانگیر کی جانشینی کا فیصلہ کرایا۔ اس کے بعد جب جہانگیر کے دُشمن اسے ہلاک کرنے کے منصُوبے باندھ رہے تھے۔ تو اس نازک موقعے پر وہ شیخ فرید ہی کے گھر ٹھہرا رہا۔ شیخ فرید فوج کے بخشی تھے۔ اور تمام سپاہیوں پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ اُنہوں نے فوج کو جہانگیر کے حق میں رکھا۔ اور ساداتِ بارہہ کو بھی جو بڑے بہادر سپاہی تھے۔ جہانگیر کے ساتھ ملا لیا۔

لیکن شیخ فریدؒ فقط ایک بہادر سپاہی قابل منتظم فیّاض اور مخیّر امیر ہی نہ تھے۔ بلکہ انہیں مذہب سے دِلی ہمدردی اور اسلام سے سچّا عشق تھا۔ چنانچہ جب اکبر مر رہا تھا۔ تو شیخ فریدؒ اور اُن کے ساتھیوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا۔ بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا۔ کہ وہ قوانینِ اِسلام کا احترام کرے گا۔ جہانگیر نے بالعموم اس وعدے کو ایفا کیا۔ اور اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کا اگر کوئی اثر باقی تھا۔ تو وہ عہدِ جہانگیری میں ناپید ہوگیا۔

اکبر کا مذہب

اکبر کے مذہبی خیالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ پُوچھا جاتا ہے کہ آیا اکبر نے جو عقائد و رُسوم ۱۵۸۱ء کے بعد اختیار کئے۔ وہ مذہب اسلام سے خارج تھے یا مذہب اسلام کی ایک غیر تقلیدی صورت۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس پر اکبر کے زمانے میں ہی اختلاف رائے تھا۔ مثلاً ابو الفضل تو ان اعتقادات اور احکام کو اسلام کی اجتہادی صُورت سمجھتا تھا۔

اور بدایونی اسلام کی صریح خلاف ورزی۔ حال ہیں ونسنٹ اسمتھ صاحب اور کرنیل ولزلی ہیگ جو اور کسی بات میں بدایونی سے اتفاق نہیں کرتے اس مسئلے پر اُس کے ہمخیال ہو گئے ہیں"۔ اسمتھ صاحب تو ہر صوفی کو بلکہ ہر اُس شخص کو جو ذرا بھی رواداری اور وسیع مشربی کا قائل ہو۔ دائرۂ اسلام سے باہر سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں ان سے شکایت نہیں۔ لیکن کرنیل ولزلی ہیگ نے اس مسئلے پر عجیب مضحکہ خیز تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "بہت سے مسلمان جو ایک اتنے بڑے بادشاہ کو اپنے طبقے میں شمار کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ اکبر ہمیشہ مسلمان رہا"۔ کسی کی نیت پر حملہ کرنا اور کسی رائے کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کے بجائے اِس کے لئے حیلے ڈھونڈنا قابلیت یا انصاف پسندی کی دلیل نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ فاضل مورخ کو یہ خیال نہیں آیا۔ کہ یہی اعتراض اُن پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اُن کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ عیسائی مورخین کو یہ امر ناگوار ہے۔ کہ کسی با اقتدار اور با عظمت بادشاہ کو، جس کی رواداری مسلّمہ ہو۔ مسلمان سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کا مذہب ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر دیانتداری سے اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ اور صرف مسلمان ہی نہیں جو اسمتھ صاحب اور کرنیل صاحب کے خیالات سے اختلاف کرتے ہیں۔ بلکہ مسٹر پی۔ کے مینن ایک ہندو صاحب قلم نے بھی رسالہ اسلامک کلچر میں اکبر کی شخصیت پر ایک پُرزور مضمون لکھا ہے۔ جس میں اُنہوں نے اِن یورپین مورخین کی تردید کی ہے اور اسمتھ صاحب کے بعض نظریوں کو "لغو" کہا ہے۔ حال ہی میں پروفیسر سری رام شرما نے اپنی انگریزی تصنیف "مغلوں کی مذہبی

پالیسی "The Religious Policy the Great Mughals" میں بالتفصیل
اکبر کو مسلمان ثابت کیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں عبداللہ خاں ازبک ترکستان کا بادشاہ تھا۔ اس نے
اکبر سے راہ و رسمِ مراسلت نگاری ترک کر دی۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد خط لکھا۔
تو اپنی خاموشی کی وجہ یہ بتائی۔ کہ سُننے میں آیا ہے۔ کہ آپ نے پیغمبری بلکہ خدائی
کا دعوےٰ کیا ہُوا ہے۔ اِسی وجہ سے ارسالِ رسل و رسائل میں کمی ہُوئی۔ اکبر نے
ایک طول طویل خط اس کے جواب میں ابوالفضل سے لکھوا کر شاہِ ترکستان کی
خدمت میں بھیجا۔ یہ خط انشائے ابوالفضل کا دُوسرا خط ہے۔ اور اسے اکبر کا
اپنے مذہب کے متعلق اپنا بیان سمجھنا چاہیے۔ شروع میں ایک طویل اندراج
"گوہر شب چراغِ عقل" کی بڑائی کے متعلق ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ قرآن و حدیث
کا ارشاد ہے۔ اور اس مسئلہ پر سب قومیں اور سب مذاہب متفق ہیں۔ کہ انسان
کے لیئے سب سے زیادہ لائقِ افتخار چیز عقل ہے۔ جس کے بغیر خدا کو نہیں پہچانا
جاسکتا۔ اور اس کارخانۂ ہستی کے بھید نہیں ظاہر ہوتے۔ لامحالہ اِس
عقلِ خداداد کا استعمال کرنا چاہیئے۔ اور دین و دُنیا کی راہیں اس کی مدد سے
ڈھونڈنی چاہیئں۔ لیکن ایک گروہ ایسا ہے۔ جو اپنی خودی اور خود پرستی میں
مُبتلا ہو کر احکامِ قرآنی کی غلط ترجمانی کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے۔ کہ فرمانروائی
اور کارگزاری میں بادشاہ کا شریک ہو جائے۔ "و فرمانِ آسمانی و نامۂ جاودانی را
کہ فرستادۂ خدا و رسانیدۂ پیغمبر است۔ از شاہراہ گردانیدہ برنگِ دیگر وا مینمایند
و مجملاتِ نصوص را تاویلات و تسویلات نمودہ مے خواہند۔ کہ در فرمانروائی و کارگزاری

شریکِ بادشاہی باشند) اس لئے دِل ہر وقت ارشاداتِ الٰہی کا طالب رہتا تھا۔ اور چونکہ ہر بات میں بے شمار اختلاف دیکھنے میں آتے تھے۔ اس لئے مطالب کی تحقیق میں دلائل و براہین کی طلب کی جاتی۔ اور اختلافی مسائل پر غور و خوض ہوتا۔ (دلِ دانش گزیں ہموارہ در تحصیل مرضیات الٰہی مے باشد۔ چوں اختلافاتِ بسیار در ہر باب بسمعِ ہمایوں مے رسد۔ در مطالب علمی و عملی طلبِ دلائل و براہین مے نماید۔ و ہموارہ استکشاف غوامض مسائلِ دین و تنقیح مقاصدِ مجتہدین و مستنبطات عقائد سلف و ماخذ تاویل خلف و تفحص موارد خلاف و تفحص مواقع اختلاف و منشاء خلافی کہ درین یکہزار سال میان علمائے امت متنازع فیہ بود۔ چنانچہ کتبِ متداولہ مبسوط بر تفاصیل آن مشتمل است مینماید)

اس دلائل طلبی اور ہر ایک چیز کو عقل و دانش کے معیار سے جانچنے کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ان لوگوں کا جو جنسِ عقل سے خالی تھے۔ لیکن ظاہر داری کے زور پر بُڑے بڑے دعوے باندھ رہے تھے۔ بازار سرد ہوگیا۔ اور انہوں نے حسد اور عداوت سے طرح طرح کی غلط افواہیں مشہور کر کے لوگوں کو ورغلانا شروع کیا۔ انہی لوگوں نے ہماری نسبت نبوت اور الوہیت کے دعوے مشہور کر رکھے ہیں۔ ورنہ کہاں بندۂ عاجز اور کہاں یہ دعوے (این بے سعادتاں گاہے نسبتِ ادعائے الوہیت و گاہے نسبت دعوئے نبوّت باینجناب نمودہ خود را در گرداب بلا موج خیز عنا زدہ ...... فی الواقع ساحتِ قدسِ مساحت جناب کبریائے الٰہی را باخس و خاشاک اِمکان چہ نسبت و در سراپردۂ عصمتِ نبوت پابندانِ عقالِ ہوا را چہ مناسبت تعجب میشود۔ کہ در مجالسِ اربابِ دولت کہ از تائیدیافتگانِ الٰہی اند

امثال ایں مقدمات بر سبیلِ احتمال ہم چرا بگزرد...... الحمد اللہ والمنۃ کہ ہمیشہ بپشید بد دانش وبینش فرمودۂ خدا و پیغمبر رو بودہ و روز افزونی بختِ ہمایوں گواہِ حال بس است) اس کے بعد اپنے کچھ کارنامے گنائے ہیں۔ کہ میں نے بعض راجاؤں کے دشوار گزار قلعے فتح کئے ہیں۔ میری وجہ سے کئی بُت خانے، درویشوں کی خانقاہیں بن گئی ہیں۔ اور ناقوس کی آواز کی جگہ آذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر لکھا ہے۔ کہ اپنی تو خواہش ہے۔ کہ جب ادھر سے اطمینان ہو جائے۔ تو فرنگیوں پر جنہوں نے سمندر پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اور زائرانِ بیت الحرم کو آزار دیتے ہیں۔ خود حملہ کر کے ان ممالک سے نکالا جائے۔ لیکن چونکہ ابھی اور مہمات درپیش ہیں۔ اس لئے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑتا ہے!

اکبر کے اخیر عمر کے مذہب کے متعلق اندازہ لگانا اس لئے بھی مشکل ہے۔ کہ اس مسئلہ کے فقط دو راوی ہیں۔ پرتگیز مشنری اور ملا صاحب بدایونی۔ پرتگیز بزرگوار تو اپنے آقایانِ نعمت کو اُمیدیں دلا رہے تھے۔ کہ اکبر، آج عیسائی ہُوا یا کل۔ اس لئے اُنہوں نے اکبر کے عام مُسلمانوں سے اختلاف کو خوب نمک مرچ لگا کے پیش کیا۔ مُلا صاحب کو بھی دربار کا نیا رنگ ناپسند تھا۔ اور ان کی طبیعت کا اسلوب ایسا تھا۔ کہ وہ شاید ہی کبھی کسی سے خوش ہوئے ہوں۔ انہوں نے اپنی تاریخ میں جو حالات لکھے ہیں۔ ان کا جزوِ غالب صحیح ہے۔ لیکن قیاس کہتا ہے۔ کہ شاید کئی باتیں جو ان کے نظریوں کے خلاف تھیں۔ چھوٹ گئی ہیں۔ کم از کم اتنا ضرور ہے۔ کہ جن بعض باتوں کو اُنہوں نے اکبر کی مذمّت کے لئے پیش کیا ہے۔ ان پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ صُورتِ حالات اس قدر بُری نہ

تھی۔ جس قدر مُلا صاحب ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ۹۸۹ھ ہجری کا ذکر کرتے ہیں۔
یعنی اس وقت جب اکبر اپنی بیراہ روی کی قریباً ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔
گاؤکشی بند ہو چکی ہے۔ ریش تراشی عام ہے۔ عقیدتمند مُرید بیعت کے وقت
"دینِ اسلام مجازی و تقلیدی" کو ترک کر رہے ہیں۔ عوام میں مشہور ہو گیا ہے۔
کہ بادشاہ، نبوت، بلکہ الوہیت کا دعویدار ہے۔ مُلا شیری کے اس شعر کو لکھے ہوئے
ایک عرصہ ہو چکا ہے ؎

بادشاہ امسال دعوائے نبوت کرد است
گر خدا خواہد، پس از سالے خدا خواہد شدن!

اور مُلا صاحب لکھتے ہیں۔ "دریں ایام جماعت نماز و اذان، کہ ہر پنج وقت برائے
خاطر جماعت در دربار میگفتند۔ برطرف شد" یعنی کم از کم، اس زمانے تک تو
بادشاہ سرِ دربار پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھا کرتا تھا!!

اسی طرح انہوں نے ایک جگہ حکیم مصری کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جن دنوں اواخر
حکومت میں اکبر دیر تک لاہور مقیم تھا۔ تو اس نے قلعۂ لاہور میں دیوانِ عام کے
سامنے ایک مختصر سی مسجد بنوا دی۔ تاکہ جو لوگ کارِ ضروری میں مشغول ہوں۔ انہیں نماز
کے لئے دُور نہ جانا پڑے۔ اس پر حکیم مصری نے کہا ؎

شاہِ ما کرد مسجدے بُنیاد ایھا المومنین، مُبارک باد۔
واندریں نیز مصلحت دارد تا نمازاں گزار بشمارد!

مُلا صاحب اور حکیم صاحب، جو چاہیں خاشیئے چڑھائیں۔ لیکن، خیر اس سے اتنا تو
پتہ چلتا ہے۔ کہ اس زمانے میں جب عیسائی مورخین کہتے تھے۔ کہ شہر لاہور میں

کوئی مسجد نہیں رہی۔ اکبر نے خود، قلعہ شاہی میں ایک نئی مسجد بنوائی تھی!

اسلامی حکومت کا استحکام

جب درباری خوشامدیوں نے اکبر کو یقین دلایا۔ کہ اب اختلافاتِ مذہبی مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ اور کتابوں کی رُو سے آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے۔ تو اس نے مذہبی اور معاشرتی امور میں چند ایسی بوالفضولیاں کیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور خیال آتا ہے۔ کہ جب ایک شخص اپنے صحیح دائرۂ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے، اور خوشامدیوں کی واہ واہ میں اپنی خام خیالیوں کو بڑھائے جاتا ہے۔ تو وہ بڑی مضحکہ خیز حماقتوں کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ لیکن مذہبی معاملات میں اکبر کی بوالعجبیوں کے باوجود اس امر کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ کہ اپنے خاص دائرۂ عمل یعنی مُلک گیری اور مُلک رانی میں اکبر بے نظیر تھا۔ اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کو جس طرح اس نے مستحکم کیا۔ کسی اور بادشاہ نے نہیں کیا۔

اکبر کے کام کا صحیح اندازہ اُس وقت ہوتا ہے۔ اگر اس سے پہلے کی اسلامی حکومتوں پر نظر ڈالیں۔ اور ان کا اس کی اپنی اور اپنے جانشینوں کی حکومت سے مقابلہ کریں۔ اکبر سے پہلے ایک اسلامی حکمران خاندان کا زمانۂ حکومت سو سال سے زیادہ نہ تھا۔ اور باقاعدہ اور مستحکم حکومت تو کسی خاندان کو نصف صدی سے زیادہ نصیب نہیں ہوئی۔ اکبر سے پہلے سب سے زیادہ جاہ و جلال سُلطان علاءالدین خلجی کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن خلجیوں کی حکومت کتنے دن رہی؟ فقط تیس پینتیس سال! خاندانِ غلاماں کے تحت کئی ایسے مختلف غلام خاندان

جمع ہیں - جن کا آپس میں بڑا دور کا تعلق تھا - لیکن اگر مختلف خاندانوں کو علیحدٰہ کریں تو کسی کی حکومت پچاس سال سے زیادہ نہیں - اور سب کی ملا کر سو سال نہ ہوگی - خاندانِ سادات اڑتیس ۳۸ سال برسرِ اقتدار یا برسرِ زوال رہا - لودھیوں کی حکومت پچہتر ۷۵ سال سے زیادہ نہیں - یہی حال تغلق خاندان کا ہے - نتیجہ اس کا یہ ہوتا - کہ دس پندرہ سال تو ایک خاندان کو پاؤں جمانے میں لگتے - اور ابھی انہیں حالات کو سمجھنے اور کوئی اصُول جاری کرنے کا ہی موقع نہ ملتا کہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا - اور پھر "دورِ اوّل" - یہی وجہ تھی - کہ ابتدائی خاندانوں کی حکومت بے حد سطحی تھی - اور مرکزی نظم و نسق کے علاوہ باقی اصلی اختیار ہندو پنچائتوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھا -

اکبر کے زمانے میں اسلام کی کمزوری کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اُس سے پہلی دو صدیوں میں دہلی کی حکومت نے بجائے ترقی کے تنزّل کیا تھا - اور ہندو راجاؤں اور مدبّرین (مثلاً رانا کنبوہ - رانا سانگا - جسرت کھوکھر - میدنی رائے - ہیموں) نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا - جب بابر آیا - تو شمالی ہندوستان کا سب سے با اقتدار حاکم ابراہیم لودھی نہ تھا - رانا سانگا تھا - جس سے مالوہ - گجرات خاندیش کے مُسلمان بادشاہ جو دبدبے اور اقتدار میں شاہِ دہلی سے بڑھ کر تھے - خم کھاتے تھے - اور شکستیں کھا چکے تھے - اس نے خود بادشاہِ دہلی کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تھا - ابراہیم لودھی نے فوجیں بھیجیں - لیکن وہ شکست کھا کر واپس آئیں - اور بادشاہ کو لہُو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑا - پنجاب میں جسرت کھوکر نے بڑا اقتدار پایا تھا - مالوہ میں میدنی رائے ' بظاہر وزیر ' لیکن

فی الواقع حکمران تھا۔ اس طرح کے دوسرے با اثر ہندوؤں کے نام اس زمانے کی تاریخ میں ملیں گے۔ ضعفِ سلطنت کی وجہ سے رودلی۔ ناگور۔ اجمیر۔ چاندیری اور دوسری جگہوں میں مُسلمانوں کی مسجدوں اور مقدس مقامات کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کا ہم چشمۂ کوثر میں ذکر کر چکے ہیں۔ بابر اور شیر شاہ نے ان حالات کی اصلاح کی۔ اور دہلی کے مسلمان بادشاہ کا اقتدار وسیع کیا۔ لیکن وہ ہوا کے جھونکے تھے۔ جو آئے اور نکل گئے۔ اِسلامی حکومت کا اصل استحکام اکبر کو خود کرنا پڑا!

استحکامِ حکومت کے لئے سب سے پہلے اکبر نے یہ کیا۔ کہ ملک میں جو صُوبے خود مختار ہو گئے تھے۔ مثلاً سندھ۔ بنگال۔ گجرات۔ خاندیش۔ انہیں پھر حکومتِ دہلی کے تابع کیا۔ کشمیر شروع سے آزاد تھا۔ اسے بھی فتح کر کے دہلی سے وابستہ کیا۔ یہ ایک بڑی منزل تھی۔ لیکن ملک گیری آسان۔ مُلک رانی مشکل۔ اکبر کا اصل کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم و نسق تھا۔ جس نے ملک کو امن و امان اور اُمرا وارا کین کو سکون و قرار دے کر حکومت کے استحکام کا سامان کیا۔ اکبر کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ موزوں امرا اور کارگزار افسروں کی فراہمی تھی۔ اورنگ زیب کو ہمیشہ شکایت رہی۔ کہ جو قابل افسر اکبر کو میسّر تھے۔ اسے نصیب نہ ہوئے۔ لیکن اکبر فقط خوش قسمت نہ تھا۔ اس کی اپنی کوششوں کو بھی اس میں بڑا دخل تھا۔ اس کی نظر جوہر قابل کی تلاش میں رہتی۔ وہ ہونہار بہادروں کو ترقی دے کر اور مختلف علاقوں اور مہموں کا تجربہ دلا کر اپنے لئے زیادہ کارآمد بناتا۔ اور ان سے امورِ مُلکی میں مدد لیتا۔ فیضی نے اکبر کے نام دکن سے جو خطوط لکھے ہیں (ملاحظہ ہو

دربار اکبری) ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اکبر کو قابل اور لائق اہل علم اور منصبداروں کی کسقدر تلاش رہتی تھی۔ ہمایوں کے ساتھ اور اکبر کے زمانے میں جو ایرانی مدبر آئے (اور جنہیں معززعہدے دئے کر اکبر نے دوسروں کے لئے ایک کشش پیدا کر دی) انہوں نے اکبر کا کام بڑا آسان کر دیا۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اکبر ہر طرف نظر دوڑاتا تھا۔ ٹوڈرمل شیر شاہ کا دیوان تھا۔ جو مغلوں کا جانی دشمن تھا۔ لیکن چونکہ راجہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اکبر نے اسے خوشی سے ملازمت میں لیا۔ اور اسے بڑے اختیارات دئے۔ ہندوؤں میں راجپوت، بہادر سپاہی اور کامیاب منتظم ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے ملک انہیں سے لیا تھا۔ اور ابھی ان میں سپاہیانہ اور حاکمانہ خوبیاں باقی تھیں۔ اکبر نے ملازمت شاہی کے دروازے ان کے لئے کھول کر انہیں بھی مطمئن کیا۔ اور حکومت کو بھی وفادار، جاں نثار ملازم ہاتھ آئے۔ اکبر کی کامیابی کا اصل باعث اس کا اور اس کے اراکین سلطنت کا تدبر تھا۔ لیکن صلح کل کی پالیسی سے اس میں بڑی سہولتیں پہنچیں۔ ملک کا بیشتر حصہ غیر مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ ابھی تک ان کے ساتھ رواداری کا سلوک ہو رہا تھا لیکن انکے تالیف قلوب کی کوئی خاص کوشش نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے اس طرف قدم اٹھایا۔ اور غیر مسلم بھی سمجھنے لگے۔ کہ وہ فقط حکمران قوم کے غلام نہیں۔ بلکہ بادشاہ کی نظر ان کے فائدے اور خوشحالی پر بھی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے۔ کہ حکمران قوم اور دوسروں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا چاہیئے۔ انہیں اکبر کی پالسی ناپسند تھی۔ اور وہ شرعاً بھی اسے برا سمجھتے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ اسلامی حکومت کی سب سے زیادہ توسیع و تنظیم ان دو بادشاہوں (علاء الدین خلجی اور جلال الدین اکبر)

کے ہاتھ ہوئی۔ جو امور ملکی میں شرع کو بہت دخل نہ دیتے تھے۔ اور سمجھتے تھے۔ کہ جہاں بانی کا کام فی نفسہ اس قدر مشکل اور اہم ہے۔ کہ اسے اُن قاضیوں اور علما کے فتووں پر چھوڑ دینا۔ جو اس کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہیں مصلحتِ ملکی کے خلاف ہے۔

سیاسی مصلحتوں کے علاوہ اکبر کی صلح کل پالیسی کا باعث اس کا اپنا رجحان طبع ہوگا۔ ہم ابوالفضل کا بیان آگے چل کر نقل کریں گے۔ کہ اہلِ شرع کی پیروی میں نیکی فقط نیکوکاروں کے ساتھ نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ہر ایک کے ساتھ نیک سلوک ہو۔ یہی اکبر کا اصول تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ بادشاہ ساری رعیت کا نگہبان ہے۔ اور ان کی خوشحالی کا ذمہ دار۔ اگر وہ اپنی کوششیں مسلمانوں تک محدود رکھے تو فقط دس پندرہ فیصدی کو فائدہ پہنچے گا۔ اور یہ انصاف کے خلاف ہے۔ شیخ مبارک کے ہاتھ جو محضر تیار ہوا تھا۔ اس میں بھی "تسہیلِ معیشت بنی آدم" اور "ترفیہ عالمیان" پر بڑا زور دیا تھا۔ اس اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے اکبر نے اپنی نظر کو وسیع کیا۔ اور ہندوؤں کی اس قدر دلجوئی کی۔ کہ جو لوگ حکومت سے پریشان و بیزار پھرتے تھے وہ بھی دلی خیرخواہ ہو گئے۔

عہدِ اکبری میں علم و فن

اکبر کے دربار کے مذہبی قضیوں کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے۔ لیکن دربار میں جو مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی۔ ملک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ عام ملک میں اسلامی اعتقادات قائم رہے۔ بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ اس وقت جونپور۔ دہلی۔ لاہور۔ سیالکوٹ۔

احمد آباد اور دُوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی۔ اور قابل علماء کی کمی نہ تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ دُوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر، جس زمانے میں شیخ مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کریں اُسے رُوحانی قحط سالی کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا!

اکبر کے زمانے میں درس و تدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ خلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں علوم و فنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں۔ اور فقہ اور اصولِ فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لودھیوں کے زمانے میں معقولات کی چند کتابیں بڑھیں۔ لیکن اکبر کے عہد میں معقولات میں بہت اضافہ ہُوا۔ اس کی ایک وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علما کی آمد تھی۔ جنہوں نے منطق اور فلسفے کو رواج دیا۔ ان میں شاہ فتح اللہ شیرازی بہت ممتاز تھے۔ جنہیں اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا تھا۔ ان کی نسبت میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں۔ "تصانیف علمائے متاخرین ولائت (ایران) مثل محقق دوّانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جمِ غفیر از حاشیۂ عقل استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات را رواجے دیگر شد"۔

لیکن معقولات کے فروغ میں، جو بعد میں ایک علمی وبا کی حد تک پہنچ گیا۔ علمائے ماوراالنہر کو بھی خاص دخل ہے۔ بدایونی لکھتا ہے۔ کہ جب منطق کا علم سمرقند اور بخارا میں پہنچا۔ تو بڑا مقبول ہُوا۔ اور مصالح ایسا تیز لگا۔ کہ ہر شخص معقولی اور

منطقی ہوگیا۔ اور جب کسی نیک بخت صاحبدل کو دیکھتے۔ تو اس کی ہنسی اُڑاتے کہ گدھا ہے۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں منطقی دلیل یہ دیتے کہ یہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں۔ تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے۔ وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا بھی نہیں۔ تو کیا ہے"۔ جب یہ بوالفضولیاں حد سے بڑھ گئیں۔ تو مشائخ صوفیہ نے منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا۔ اور بادشاہِ وقت، عبداللہ خاں ازبک سے استدعا کی۔ کہ اس فن کے اُستادوں کو ملک بدر کیا جائے۔ چنانچہ کئی معقولی، مثلاً قاضی ابُوالمعالی۔ مُلا مرزا جان۔ ملا عصام وغیرہ وہاں سے نکالے گئے۔ ان میں سے بعض نے ہندوستان کی راہ لی۔ اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ (چنانچہ خود بدایونی نے قاضی ابوالمعالی سے چند سبق پڑھے تھے) یقین ہے۔ کہ معقولات کی مقبولیت میں ان بزرگوں کو بھی دخل ہوگا!

دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عہدِ اکبری میں پھر اُستوار ہوئے۔ گجرات اس زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا۔ ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب سے آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے اور یہاں کے لوگوں کو بھی عرب جانے میں آسانی تھی۔ دوسرے شاہانِ گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی کر کے انہیں بہت فروغ دیا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عہدِ اکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم و فضل میں دہلی پر فوقیت تھی۔ لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا تو گجرات کے علما دہلی پہنچنے شروع ہُوئے۔ اور گجرات کی بندرگاہوں کے رستے عام

ہندوستانی طلبا کو بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاکر حصول علم کا موقع ملا۔

علوم اسلامی کی اشاعت اور معقولات کی توسیع کے علاوہ اکبر کا زمانہ جس بات کے لئے نمایاں ہے وہ فنونِ لطیفہ کی ترقی ہے۔ فنِ شعر۔ مصوری۔ موسیقی۔ ان سب فنون کو اکبر کے زمانے میں فروغ حاصل ہوا۔ اکبری عہد کے فنِ تعمیر کے بہترین نمونے فتحپور سیکری میں ہیں۔ جو مدتوں اس کا دارالخلافہ رہا۔ اکثر عمارتیں سُرخ پتھر کی ہیں۔ اور انہیں، بالخصوص مزار شیخ سلیم چشتی کے بلند دروازے کو دیکھ کر حیرت اور مسرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ بھی اسی زمانے میں بنا۔ اس کے علاوہ مغلیہ مصوری کا آغاز اکبر کے زمانے میں ہوا۔ اس زمانے میں ایران سے کئی مصور آئے۔ جن میں خواجہ عبدالصمد بہت مشہور ہیں۔ ان سے ہندوستانی صناعوں نے مصوری کی تکمیل کی۔ اور آہستہ آہستہ یہاں بھی فنِ مصوری اس عروج پر پہنچ گیا کہ ایران، ہندوستان سے پیچھے رہ گیا۔ موسیقی میں تان سین بہت مشہور تھا۔ جو اکبر کے نورتنوں میں سے تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے ادبیات کی بڑی سرپرستی کی۔ سنسکرت۔ عربی۔ ترکی۔ یونانی سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سنسکرت سے جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں رامائن۔ مہابھارت۔ بھاگوت گیتا۔ اتھروید اور ریاضی کی ایک کتاب لیلاوتی مشہور ہیں۔ ہندی زبان نے بھی اس زمانے میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ اور ہندی کے دو بہترین شاعر سُورداس اور تُلسی داس اکبر کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ بیرم خان کا لڑکا عبدالرحیم خانِ خاناں خود ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ملک الشعرا کا عہدہ بھی غالباً اکبر کے زمانے سے

شروع ہوا۔ فیضی اس عہدے پر مامور ہوا۔ اور وہ ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں سے گنا جاتا ہے۔ مُلّا ظہوری اور ملک قمی جو ہندوستان کے فارسی شعرا میں مشہور ہیں۔ اس زمانے میں زندہ اور دکن کے درباروں سے وابستہ تھے۔

مؤرخین میں مُلّا عبدالقادر بدایونی مصنف "منتخب التواریخ"۔ مُلّا نظام الدین احمد مُصنف "طبقاتِ اکبری" اور علامہ ابوالفضل مُصنف "آئینِ اکبری" و "اکبرنامہ" مشہور ہیں۔ ان مورخین کے علاوہ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم جس نے "ہمایوں نامہ" لکھا ہے۔ بڑی قابل اور عالم خاتون تھیں۔ عہدِ مُغلیہ کی مشہور خواتین کا ممتاز سلسلہ انہی سے شروع ہوا۔ اور جس طرح چاند بی بی۔ نورجہاں۔ جہاں آرا اور زیب النساء کی قابلیت اور اثر و اقتدار سے عیسائی مورخین کا یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں میں مستورات کو جائز درجہ نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح گلبدن بیگم کی علمیت اور زہد و تقوے بھی قوم اور ملک کے لئے باعثِ فخر ہے۔

اس زمانے میں بہت سے قابل اطبا بھی تھے۔

"عہدِ اکبری" کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے۔ کہ تمباکو ہندوستان میں پہلی مرتبہ اسی زمانے میں آیا۔

شیخ مُبارک۔ فیضی۔ ابوالفضل

دربارِ اکبری کی مذہبی تاریخ میں تین نام کثرت سے آتے ہیں۔ شیخ مُبارک۔ ابوالفیض فیضی اور ابوالفضل۔ تینوں کی نسبت معلوم ہے۔ کہ جن علوم کو علومِ اسلامی

کہا جاتا ہے۔ ان میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اس کے باوجود مذہبی حلقے اور اب عام مُسلمان بھی ان کی نسبت کراہت کا اظہار کرتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے آخر تک جب فارسی کا عام رواج تھا۔ اور فیضی اور ابوالفضل کی تصانیف مدارس میں رائج تھیں اس وقت تک یہ کراہت بہت تھوڑی تھی۔ اور خاص خاص اشخاص تک محدُود تھی۔ عوام الناس انشائے ابوالفضل اور فیضی کا دیوان اور مثنویاں پڑھتے اور فیضی کی تفسیرِ دیکھتے۔ تو انہیں ان میں اسلام کے اصولوں اور متبرک ہستیوں کے خلاف ایک چیز نظر نہ آتی۔ بلکہ انشائے ابوالفضل میں جا بجا معرفت الٰہی کی وہ باتیں تھیں جو خاص خاص صوفیائے کرام کا حصّہ سمجھی جاتی ہیں۔ اور فیضی کی نلدمن میں وہ نغمتیہ مثنوی ہے جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اب فارسی کا رواج کم ہوگیا ہے۔ یہ تصنیفات لوگوں کی نظر سے نہیں گزرتیں لیکن تاریخ کے جویا، بالخصوص وہ لوگ جنہیں گرم گرم قصّوں اور چُبھنے والے فقروں کی تلاش ہے۔ بدایونی کی منتخب التواریخ پڑھتے ہیں۔ جس میں شیخ مُبارک اور اس کے دو بیٹوں کے منہ پر دوجہاں کی سیاہی ملی ہوئی ہے۔ اور اُسی کے بیان کے مطابق اپنی تاریخیں مرتب کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہی ہستیاں جن کی تصانیف، کل تک مدارس اسلامی میں شیرِ مادر کی طرح مرغوب تھیں۔ آج مردُود و مقہور ہیں ؎

شیخ مُبارک

شیخ مُبارک، جن کا پورا نام مبارک اللہ ہے۔ ۹۱۱ھ میں بمقام ناگور پیدا ہوئے۔ جو راجپوتانہ کی ایک قدیم علمی بستی ہے۔ خاندان میں علم و فن کا احترام تھا۔ اس لئے ساری عمر اس طرف توجہ رہی۔ مروّجہ علوم زیادہ تر اُنہوں نے احمد آباد (گجرات) میں حاصل کئے۔ جو اُن دِنوں

اس بارے میں دہلی پر بھی فضیلت رکھتا تھا۔ ان کے اساتذہ میں سے خطیب ابوالفضل گازرونی نے، جو خود مولینا جلال الدین دوانی کا شاگرد تھا۔ انہیں بڑی محبت سے تعلیم دی۔ خطیب موصوف شیراز میں مقیم تھا۔ کہ شاہانِ گجرات کی کشش اسے احمد آباد کھینچ لائی۔ اسے معقولات منطق اور الہیات سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ شاگرد نے بھی ان پر توجہ دی۔ اور اس کی طبیعت پہ ایک خاص رنگ چڑھ گیا۔ اس کے علاوہ شیخ نے دوسرے عالموں اور خدا رسیدہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ اور بالاخر ۶ محرم ۹۵۰ھ میں آگرے آکر درس و تدریس شروع کیا۔ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں فیضی اور ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں ابوالفضل یہیں پیدا ہوئے۔

ان دنوں مخدوم الملک کا بڑا زور تھا۔ اور ان کی کوششیں مہدویوں اور اور بدعتیوں کے قلع قمع پر مبذول تھیں۔ شیخ، جو کہ آزاد خیال عالم تھا۔ اور مہدویوں اور اہلِ تشیعت سے بھی صحبت رکھتا تھا۔ مخدوم کی نظروں میں خاص طور پر کھٹکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے آزار میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن مرزا عزیز کوکہ کی سفارش سے ان کی گلو خلاصی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ ان کی اولاد دربارِ شاہی میں باریاب ہوئی۔ ۹۷۴ھ میں شاعری کے طفیل فیضی کی دربار میں رسائی ہوئی۔ اور ۹۸۱ھ میں ابوالفضل جا کر میر منشی ہوئے۔ اب انکا ستارا بلند ہُوا۔ اور ابوالفضل اور فیضی کو دربار میں وہ عروج ہُوا کہ ان کے سامنے باقی سارے اہلِ علم ماند پڑ گئے۔

اکبری دربار کی مذہبی جدتوں کے سلسلے میں شیخ مبارک کا ذکر اکثر آتا ہے۔

لیکن کوئی محکم بات ایسی نہیں ملتی۔ جس سے اس کے عقائد کے خلاف فیصلہ کیا جا سکے۔ سب سے بڑی شکائت علما کو اس کے محضرنامہ سے ہے۔ جسے اس نے ترتیب دیا۔ اور جس کے مطابق حاکمِ عادل کو مجتہدانہ اختیارات دیئے گئے۔ ہم محضر کے متعلق مولینا ابوالکلام آزاد کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ واقعی حاکمِ عادل کو یہ اختیارات ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ اگر شیخ مبارک کی رائے اس بارے میں غلط ہو۔ تب بھی اس سے الحاد و بے دینی تو لازم نہیں آتی۔ اور پھر ایک ایسی دستاویز کی وجہ سے، جس پر تمام علمائے عصر کی مُہریں ثبت ہوں۔ محضر کے علاوہ بدایونی نے شیخ مبارک کے جرم گناہ میں اس کی گفتگو نقل کی ہے۔ کہ خلوتِ بادشاہی میں بیربر سے کہا۔ کہ جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں۔ شمس العلما آزاد اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اگر حق پوچھو۔ تو اس بچارے نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اُس کی قسمت۔ اور وں کی باتیں اس سے ہزار من سنگین دوزنی ہوتی ہیں۔ انہیں ان کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ہیں۔ ان کے مُنہ سے بات نکلی اور کُفر۔"

شیخ مبارک کا تبحرِ ابُہم تفسیر منبع نفائس العلوم ہے۔ جو اُنہوں نے چار ضخیم جلدوں میں لکھی۔ اس کے دیباچہ کے متعلق بدایونی کہتا ہے :۔

"و از غرائب امور است۔ اینکہ در خطبۂ آں تفسیر، تحریر مقصدے کردہ۔ از آنجا بوئے دعوے مجددی با تہ، جدیدمی آید و تجدید او خود آں بود کہ معلوم است"

آج یہ تفسیر نہیں ملتی۔ ورنہ پتہ لگتا۔ کہ شیخ مبارک نے کیا لکھا۔ اور بدایونی کیا سمجھا۔

لیکن اتنا معلوم ہے۔ کہ جب یہ تفسیر لکھی گئی۔ تو ابوالفضل نے اس کی نقلیں تیار کرا کے ایران، توران اور ملکِ رُوم وغیرہ میں بھیجیں۔ ابوالفضل کے دشمنوں نے اس کی اطلاع اکبر کو بھی دی۔ اُسے بڑا ملال ہُوا۔ مولٰینا آزاد لکھتے ہیں:۔

"چغل خوروں کی باتیں کس نے سُنی ہیں۔ کہ کیا کیا موتی پروئے ہوں گے۔ شاید یہ کہا ہو۔ کہ حضور کے سامنے یہ اہلِ دین کو مقلد کہتا ہے۔ اور تقلید کی قباحتیں اور دینیات کی خرابیاں ظاہر کرتا ہے۔ اور دل سے اعتقادِ مفسرانہ رکھتا ہے"۔

اتنا تو بدایونی بھی کہتا ہے۔ کہ جب تفسیر لکھی جا رہی تھی تو شیخ مبارک "ابنِ فارض کا قصیدۂ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے۔ (اور قصیدۂ بردہ) اور قصیدۂ کعب ابنِ زہیر اور اور بزرگوں کے قصائد وظائف کے طور پر حفظ پڑھتا تھا" قصیدۂ بردہ عربی کا ایک مشہور قصیدہ ہے۔ جو رسُولِ اکرمؐ کی تعریف میں لکھا گیا۔ ان وظائف سے شیخ کے خیالات کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکتا ہے!

شیخ مبارک کی وفات ۱۷ ذیقعد ۱۰۰۱ھ کو ہوئی۔ بدایونی ان کی نسبت لکھتا ہے کہ "بجہت شومئے حبِ دُنیا و جاہ در لباسِ فقر، ہیچ جائے آشتی بدینِ اسلام نگذاشت" اور اُس کی "بے دینی و غوص در مال و جاہ و زمانہ سازی و مکر و فریب و غلو در وادئے تغیرِ مذہب و ملت" کی شکایت کرتا ہے۔ بدایونی شیخ مبارک کا شاگرد تھا۔ اور کئی سال اُس کی خدمت میں فیض حاصل کر چکا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ زہر اگلتے وقت اس نے انصاف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں۔ شیخ مبارک کی آزاد خیالی اور "غلو در وادئے تغیرِ مذہب و ملت" کے متعلق جو کچھ وہ چاہیں کہیں۔ لیکن شیخ کے واقعاتِ زندگی ہی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ کہ

کہ زمانہ سازی اور حبِ جاہ اسے چھو بھی نہ سکی تھی۔ اگر زمانہ سازی کا اس میں شائبہ بھی ہوتا۔ تو وہ کیوں اِس مجلس میں جو سلیم شاہ نے شیخ علائی کے اعتقادات کا فیصلہ کرنے کے لئے بُلائی تھی۔ شیخ کا ساتھ دیتا۔ اور مخدوم الملک کی مضر اور مہلک مخالفت خرید تا۔ شیخ مُبارک نے جو تکلیفیں اپنے عقائد اور اپنی آزادروی کیلئے اُٹھائی تھیں۔ ان سے ظاہر ہے۔ کہ وہ زمانہ ساز نہ تھا۔ حُبِ جاہ کی تہمت بھی بے انصافی ہے۔ اگر شیخ مبارک کو ان چیزوں کی ہوس ہوتی۔ تو وہ شیر شاہی خاندان کے عرُوج میں ہی اس کے لئے قدم اُٹھاتا۔ پھر جب اُس کے بیٹے دربارِ اکبری کی سب سے اُونچی کرسیوں پر متمکن تھے۔ اور بادشاہ نے سیاہ وسفید کی باگ ان کے ہاتھ میں دے رکھی تھی۔ اس وقت اگر شیخ چاہتا تو مخدوم الملک کی یا صدر الصدور کی گدی سنبھالتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اسے درباری قدر و منزلت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ معاصرانہ تاریخوں بلکہ خود بدایونی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ اخیر عمر میں بھی دربار سے دُور دُور رہا۔ خاص خاص موقعوں پر اکبر سے ملا۔ لیکن اس کے علاوہ اپنے محبُوب مشغلہ یعنی تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں منہمک رہا۔

بدایونی کی ایک بڑی ستم ظریفی یہ ہے۔ کہ باوجودیکہ اس کی نظروں میں دربارِ اکبری کے سب سے بڑے ملحد شیخ مُبارک۔ ابو الفضل اور فیضی تھے۔ لیکن اس نے اس زمانے کی مذہبی اختراعوں کی تاریخ لکھی ہے۔ ہر ایک بدعت کے مُوجد کا نام بھی درج کر دیا ہے۔ لیکن حیرانی یہ ہے۔ کہ مذہب اسلام اور شعارِ اسلامی سے جتنی باتوں میں انحراف کیا گیا۔ ان میں سے ایک بات بھی بدایونی نے ایسی نہیں

لکھی جسمیں شیخ مبارک، فیضی یا ابوالفضل نے پہل کی ہو۔ اور بادشاہ کو گمراہ کیا ہو۔ مُلّا صاحب نے خود متعہ کا رستہ دکھایا تھا۔ زعفرانی اور لال کپڑوں کے جواز کا فتوے حاجی ابراہیم سرہندی لائے۔ بادشاہ کو سجدہ کرنے کا فتوے قاضی خاں بدخشانی نے دیا۔ اور مُلّا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا۔ کہ ہائے یہ مجھے کیوں نہ سُوجھا۔ حریف بازی لے گیا! ڈاڑھی منڈانے کی حدیث حضرت شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے نے نکالی تھی۔ اسلام کے ساتھ ہند ومذہب کا جوڑ، کلام مجید اور پُران کی تطبیق شیخ تاج الدین ولد زکریا اجودھنی دہلوی نے کی۔ اختلافِ مذاہب مٹانے اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے مطالعہ کرنے اور ان سب کو ملاکر ایک نیا معجونِ مرکب تیار کرنے کا سبق بھی انہی بزرگوں نے دیا تھا۔ جو قدیم رسالے لائے تھے۔ اور ان کے حوالے اور ناصر خسرو کی رباعیوں سے بتاتے تھے۔ کہ ۹۹۰ھ میں یہ سب باتیں ہوں گی ..یہی باتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے مُسلمان اکبر سے ناراض ہیں۔ جب یہ دربار میں رائج ہوگئیں۔ تو اور درباریوں کے ساتھ فیضیؔ اور ابوالفضل نے بھی انہیں اختیار کیا۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں۔ جس کے متعلق بدایونی نے ہی کہدیا ہو۔ کہ وہ شیخ مُبارک یا ابوالفضل یا فیضیؔ نے شروع کی۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے باوجود شیخ مُبارک اور اس کے بیٹے سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ اور دوسروں کا محض ضمناً نام آگیا ہے۔ آزاد[1] اِس امتیاز کی وجہ یہ دیتا ہے۔ کہ فیضیؔ اور ابوالفضل، بدایونی کے ہم درس اور ہم سبق تھے۔ وہ رُتبے اور شان وشکوہ میں ان سے بہت بڑھ گئے تھے۔ اِس "رشکِ منصبی" سے مُلّا صاحب کا دل جلتا تھا اور اس کا بخار اپنی تاریخ میں نکالا ہے۔

---

[1] دربارِ اکبری صہ ۴۴۵ وغیرہ

شیخ مُبارک مذہبی معاملات میں آزاد خیال تھا۔ لیکن اُسے اور اُسکے خاندان کو نقشبندیہ سلسلے کے ساتھ، جو شرع سے بہت قریب ہے، اُکئی رابطے رہے۔ ابوالفضل تو کہتا ہے۔ کہ وہ مشہور نقشبندیہ بزرگ خواجہ عبیداللہ احرارؒ کا مُرید خاص تھا۔ وہ یہ لکھ کر کہ شیخ نے شیخ فیاضی بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہونے کی خواہش کی۔ لکھتا ہے :۔

"و پاسخ یافت کہ دریں نزدیکی یکے را بر فراز ہدائت مے بر آرند و بر ہنمائی جوئندگانِ آگہی نامزد میکنند۔ عبیداللہ نام دارد۔ گرامی لقب اُو خواجہ احرار خواہد بود۔ انتظار آں ہنگام نماید۔ و آئین او برگزیند۔ خواجہ دراں ہنگام آبلہ پائے عرصۂ تگاپوے بودند و در جستجوئے جاں داروئے حقیقت دوارؔ۱ و داشتند۔ چون وقتِ کار رسید۔ بداں پایۂ والا سرفرازی یافت۔ و تلقین خدا پژوہی ازو برگرفت۔ گمنامی را خلوتِ او فرمودند و بے تعینی پیشۂ او مقرر شد۔ در سخنانِ خواجہ ہر جا کہ بدرۂ یشے تعبیر میرود۔ ایں یگانۂ روزگار (شیخ مُبارک) را میخوانند"۔

ابوالفضل نے خواجہ عبیداللہ احرارؒ اور شیخ مُبارک کے تعلقات کا ذکر بڑا زور دے کر کیا ہے لیکن اس معاملے میں اُسے سہو ہوا ہے۔ خواجہ احرارؒ اور شیخ کی ملاقات سرے سے ناممکن ہے۔ کیونکہ شیخ سنہ ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرہ ۸۹۵ھ میں وفات پا چکے تھے۔ شیخ کی ملاقات حضرت

۱؎ یہ لفظ مطبوعہ کتاب (انشائے ابوالفضل صر ۳۲۳) میں پڑھا نہیں جاتا۔ آزاد کی تشریح ہے "وہ اُن دنوں نوشدارُوئے حقیقت کی جستجو میں سیاحی (سیاحی؟) کرتے ہوئے ہندوستان آنکلے تھے" (دربارِ اکبری صر ۳۳۱)

خواجہ احرار کے خاندان یا سلسلے کے کسی اور بزرگ سے ہوئی ہوگی۔ ہاں اتنا یقینی ہے۔ کہ وہ نقشبندیہ سلسلے میں مُرید ہُوا تھا۔ چنانچہ بدایونی یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ شیخ کے خیالات مختلف وقتوں میں مختلف رہے ہیں۔ لکھتا ہے۔

"در اوائل عہدِ بادشاہی چوں جماعہ نقشبندیہ استیلا داشتند۔ نسبتِ خود بایں سلسلہ درست کرد۔"

شیخ مبارک کے خاندان کو نقشبندی بزرگوں سے دوسرا تعلق فیضی کی تفسیر بے نقط سے ہُوا جس کے متعلق نقشبندی تذکرہ نگار راوی ہیں۔ کہ اس کی تصنیف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فیضی کا ہاتھ بٹایا تھا۔ تیسرا رابطہ شیخ مبارک کے داماد خواجہ حسام الدین سے ہے۔ جو حضرت مجدد کے پیر بھائی اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفۂ خاص تھے۔ انہوں نے ہی حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ان کے خُردسال فرزندوں کی نگہداشت کی۔ اور ان کی خانقاہ کا نظم ونسق قائم رکھا۔

ملک الشعرا فیضی فیاضی

فیضی شیخ مُبارک کا بڑا بیٹا تھا! ور ہندوستان کی فارسی شاعری کی تاریخ میں خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ علم وفضل میں بھی بے نظیر تھا۔ اس کی عربی دانی کا اندازہ ۷۵ جزو کی اُس تفسیر سے ہوسکتا ہے۔ جس کی بُنیادی عبارت صنعتِ ایہام میں یعنی بغیر کسی نقطے کے لکھی گئی۔ فارسی تو خیر اپنے گھر کی لونڈی تھی۔ فیضی نے سنسکرت کو بھی اہلِ فن کے طریقہ پر حاصل کیا۔ بدایونی نے اس کے حال میں بڑی خاک اُچھالی ہے۔ لیکن اسے بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ کئی علوم میں یگانۂ روزگار

تھا۔ "در فنونِ جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و خط و انشا عدیل در روزگار نداشت"۔ لیکن شہرت زیادہ اس کی بطور ایک شاعر کے ہوئی ہے۔ دربار میں باریابی بھی شاعری کی سفارش سے ہوئی۔ پہلا قصیدہ جو اس نے اکبر کی تعریف میں پڑھا۔ اُسی میں حکیمانہ طبیعت اور باطنی کشمکش کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ مُبارک کی آزاد خیالی بیٹوں کو وراثت میں ملی تھی۔ طبیعت میں حوصلہ اور بلندی تھی۔ تمام علوم قرآنی کو اپنی عقل اور دلائل کے معیار پر پرکھتے۔ لیکن جتنی نگاہِ نکتہ چیں تیز تھی۔ اس قدر جذبۂ توفیقِ الٰہی نہ تھا۔ اور وہ باطنی آنکھ جو منطقی دلیلوں اور ظاہری قیاسات سے گزر کر حقیقت سے ہمکنار کرتی ہے۔ میسّر نہ تھی۔ اس لئے بسا اوقات کامیاب نہ ہوتے۔ طبیعت میں احکامِ اسلامی کا احترام بھی تھا۔ اس لئے اس ناکامیابی کا دُکھ ہوتا۔ اِس کشمکش کی تصویر فیضی کے اشعار میں کئی جگہ ہے۔ اپنے پہلے مدحیہ قصیدے میں کہتا ہے ؎

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام ... سفینۂ دلم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم ہراسیمہ کز کدام دلیل ... برم ظنون و شکوک از علومِ ایقانی
چرا بود متخالف رسُومِ اسلامی ... چرا بود متشابہ حروف فُرقانی

لیکن جو الجھنیں حکامِ اسلامی کے متعلق ذہنی کشمکش سے پیدا ہوتی تھیں۔ ان سے زیادہ خلفشار، اسلام کے دعویداروں اور فقہا و علما کی ظاہری و باطنی زندگی کے فرق دیکھنے سے ہوتا۔ کہ دعوے تو یہ تھے۔ کہ ہم خیر الامم ہیں، رحمت للعالمین کی اُمت ہیں۔ لیکن اعمال اور اخلاق ایسے۔ کہ "جنہیں دیکھ کے شرمائیں ہنود"

فیضی کہتا ہے ؎

زباں کشیدہ بدار القضائے عجب و ریا　　شہودِ کذب ز دعوے گرانِ ایمانی
اگر حقیقتِ اسلام در جہاں اینست　　ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی!

فیضی کے حالات اور تصانیف سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اُسے اِس امر کا بڑا رنج تھا۔ کہ مسلمان دعوے تو کرتے ہیں۔ کہ ان جیسا کوئی نہیں۔ لیکن تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر یا اپنی خود غرضیوں کے جال میں پھنس کر ایسی ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔ جن سے عام دُنیاداروں بلکہ لامذہبوں کو بھی شرم آتی ہے۔ خاندیش کی سفارت کے دوران میں اُس نے ایک طول طویل خط اکبر کو لکھا تھا۔ اُس میں مذہب کے دعویداروں کی کئی بوالفضولیاں بیان کی ہیں۔ ایک ازبک کی نسبت لکھا ہے۔ کہ اسے گرفتار کیا گیا۔ تو اُس کے پاس سے دھاگے کی ایک بڑی انٹی ملی۔ لوگوں نے پُوچھا کہ یہ کس لئے ہے۔ تو کہنے لگا۔ کہ میری ایک ضعیف ماں ہے۔ اس نے دی تھی۔ کہ اگر ہو سکے۔ تو کسی رافضی کے خون میں اسے رنگ لاؤ۔ تاکہ جب مَیں مروں تو میرا کفن اسی رنگین دھاگے سے سیا جائے!

شیعہ سُنی اختلافات کے بارے میں ظہوری کی زبانی ایک کہانی لکھی ہے۔ ایک دن مکہ معظمہ میں ایک حوض کے کنارے چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ماورالنہری کہنے لگا۔ کہ روز قیامت حوض کوثر کے چار کونوں پر چار یار بیٹھیں گے۔ اور مومنوں کو آبِ کوثر سے فیضیاب کرینگے اتفاق سے وہاں محمود صباح نیشاپوری بیٹھے تھے۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کہ کیا نامعقول باتیں کر رہے ہو۔ حوضِ کوثر تو گول ہے۔ اور اُس کے ساقی حضرت مُرتضےٰ علی ہیں! اس پر فیضیؔ نے عطارؔ کے شعر نقل کئے ہیں ؎

زنادانی و لے پُر جہل و پُر مکر گرفتارِ علی ماندی و بُو بکر

گر آں بہتر و ایں بہتر تراچہ؟ چو حلقہ ماندۂ بر در، تراچہ؟

چو یک دم زیں تخیل مے نرستی ندانم تا خدارا کے پرستی!

پھر لکھا ہے۔ کہ توحید کے اِن دعویداروں نے کسی نہ کسی انسان کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اور خُدا کی پرستش سے غافل ہو کر ساری توجہ اس انسان کی طرف کر رکھی ہے۔ دکن کی نسبت لکھا ہے۔ کہ اس ملک میں قدیم دکنی فی الخفیفت داور الملک کی پرستش کرتے ہیں۔ جسے عوام الناس دارالملک کہتے ہیں۔ گجرات کے سپاہیوں میں سے تھا۔ وہیں ہلاک ہو گیا۔ اب بیسں۲۰ تیس۳۰ جگہ اس کی قبریں بنائی ہیں۔ اور ہر جگہ معتقدوں کا ہجُوم ہوتا ہے۔

پھر مُلّا عبد اللطیف بربری کی زبانی ایک قصّہ لکھا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تصوّف و مشیخیت کے دعویدار اپنا اعتبار بڑھانے اور جُہلا کو بہکانے کے لئے کیسی کیسی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ مُلا عبد اللطیف نے بیان کیا کہ سید محمّد گیسُو درازؔ کی اولاد میں سے ایک صاحب ہیں۔ حضرت اللہ نام۔ گذشتہ سال وہ ایک دفعہ بُرہانپُور آئے تو ملاقات کے دوران میں مجھ سے کہنے لگے کہ تم جانتے ہو کہ مَیں کون ہوں؟ مَیں کچھ نہ بولا۔ تو فرمایا۔ کہ جُب حضرت مریم علیہ السلام آسمان پر گئیں۔ تو حضرت میر سیّد گیسُو درازؔ کو حاضر کیا گیا۔ اور ان کی شادی حضرت مریمؑ سے کر دی گئی۔ مَیں ان کی اولاد میں سے ہوں"۔ اس پر مُلّا عبد اللطیف نے کہا۔

کہ تب تو آپ کو فرنگستان میں تشریف لے جانی چاہیئے جہاں کے لوگ ابنِ مریمؑ کے پجاری ہیں۔ حضرت اللہ نے جواب دیا۔ کہ وہ ولائت میرے سوتیلے بھائی عیسٰی کے سپرد ہے۔ پتہ نہیں وہاں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے!!

مندرجہ بالا اقتباسات سے ان باتوں کا پتہ لگتا ہے۔ جنہوں نے فیضیؔ کا دِل عام مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ اسلام کے ترجمانوں سے کھٹا کر دیا تھا۔ ایک قطعہ میں اس نے "طائفۂ اہلِ محبت" کے طریقے کا اُن " ابلہ فریب " اور بے مہر بزرگوں کی روش سے مقابلہ کیا ہے۔ جو تقدّس اور مذہبیت کے تو بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن جو عملاً معمولی اخلاق سے بھی عاری ہوتے ہیں ؎

دانی کدام طائفہ اہلِ محبت اند ۔۔۔ آنانکہ ہم رہینِ وفایند وہم رہی

بر سر قدم نہند سُکتر ز برگِ گل ۔۔۔ بر دیدہ بگذرند چو بادِ سحرگہی

گفتارِ شاں بلب چو جوانانِ پردہ دار ۔۔۔ اسرارِ شاں بدل چو نگارانِ خرگہی

نے آں گروہِ خیرہ کہ در پیشگاہِ عقل ۔۔۔ ابلہ فریب ساختہ خود را ز ابلہی

در سینہ مہر نے و تمنائے ہمدمی ۔۔۔ در کیسہ خاک نے و گزافِ شہنشہی

دِل بر درِ صنمکدۂ جُرم بُت پرست ۔۔۔ لب در ادائے سبحۂ استغفر اللہی

بیرونِ تراود از دلِ شاں تلخئ مزاج ۔۔۔ زانساں کہ شیشہ بادہ بریزد ز بے تہی

مدعیانِ دین و مذہب کی عملی زندگی سے فیضی کو جو شکائت تھی۔ اس کے علاوہ شائد عقائد اسلامی میں بھی دو چار باتیں ایسی تھیں۔ جن کی مروجہ ترجمانی اس کی عقلِ خردہ بیں کو کھٹکتی تھی۔ ایک تو غالباً بہشت و دوزخ کا مسئلہ تھا۔ جس پر

بہت سے حکمائے اسلامی نے مُسلمانوں کی عام رائے سے اختلاف کیا ہے ؎

ایا محیط مواعظ کمالِ ملّت و دیں — دریغ گوہر وعظِ ترا مصارف نیست
بہ پیشِ من سخن از دوزخ و بہشت مگو — کہ گوشِ ہوش حریفاں بریں زخارف نیست
خدائے را زمن احوالِ حشر و نشر مپرس — کہ سادہ لوحِ محبتؔ ابوالمعارف نیست
غلام صُوفیِ صافی شوم کہ مے گوید
بہشت و دوزخ بجز بسط و قبض عارف نیست

اُس کے ایک شعر سے خیال ہوسکتا ہے۔ کہ شائد وہ فریضۂ حج کی حکمت کو بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اور اس کا دل حیران تھا۔ کہ حرم کے طواف اور بُت کی پرستش میں کیا فرق ہے ؎

آنکہ میکرد مرا منع پرستیدنِ بُت — در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

یہ صحیح ہے۔ کہ شعرا کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔ اور فارسی میں سینکڑوں ایسے اشعار ہوں گے۔ جن میں اسی طرح کے خیالات نظم کئے گئے ہیں۔ مثلاً عُرفی کی مشہور رُباعی ہے۔

حرم جویاں درے را مے پرستند — فقیہاں دفترے را مے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد — کہ یاراں دیگرے را مے پرستند

لیکن چونکہ فیضیؔ کی آزادہ روی معلوم تھی۔ اور اس کے علاوہ وہ فقط شاعر ہی نہ تھا۔ عالم بھی تھا۔ اُس کی باتیں زیادہ کھٹکتی تھیں۔ بدایونی تو یقیناً اُسے مُلحد سمجھتا تھا۔ اور شیخ عبدالحق محدثؒ اور دوسرے متقی بزرگ جب بہشت و دوزخ کے متعلق اس کے خیالات یا اسلام کے بعض مسلّمہ اصولوں پر اس کی نکتہ چینی دیکھتے

تو وہ بھی بدایونی سے متفق ہو جاتے۔ لیکن فیضی کی تصانیف میں کئی ایسی چیزیں ہیں۔
جن سے بدایونی کی رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ یا ممکن ہے۔ کہ بھٹک بھٹک کر
اور "جابکئے تعقل" اور تشلک کے نشتر کھانے کے بعد فیضی راہِ راست پر آگیا ہو۔
اس نے اخیر عمر میں جو تفسیر بے نقط لکھی۔ اگر اس سے فیضی کے خیالات کا اندازہ
کیا جائے۔ تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ شمس العلما آزاد لکھتے
ہیں "فیضی کی تفسیر سواطع الالہام اور موارد الکلام موجود ہے۔ لیکن اہلِ فن
کے اصول سے بال بھر نہیں سرکا۔ تمام آیات و احادیث اور بزرگوں کے
کلمات و طیبات کے مضامین ہیں"۔ مولینا شبلیؒ بھی عہدِ اکبری کی مذہبی
تاریخ لکھنے کے بعد کہتے ہیں "فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے لیکن
ایک ذرہ مسلماتِ عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ فیضی کی مذہبی
آزادی، ہم جو کچھ سنتے ہیں۔ زبانی سنتے ہیں۔ تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجد ہی
نظر آتا ہے"۔ یہ صحیح ہے۔ کہ بدایونی یہاں بھی چھری چبھوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں
"تفسیر بے نقط برائے شستن بدنامی کہ تا روزِ جزا بصد آبِ دریا شیشہ نگردد در عین
حالتِ مستی و خباثت مینوشت۔ وسگاں آں را از ہر طرف پائمال ساختند"۔ لیکن
نگہِ بدبیں کا کیا علاج! فیضی اور شیخ مبارک کی نسبت ملا صاحب ایسی ایسی باتیں
لکھ گئے ہیں۔ کہ الاماں! آج ان کی تصدیق یا تکذیب کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اسلئے
مورخ بے بس ہے۔ لیکن تفسیرِ بے نقط موجود ہے۔ اس سے مفسّر کے خیالات
اور معتقدات کو بخوبی پرکھا جاسکتا ہے۔ مُلّا صاحب کو ان میں اعتراض کی
کوئی گنجائش نظر نہ آئی۔ تو لکھ دیا۔ کہ اپنی بدنامی دھونے کی خاطر یہ تفسیر لکھی ہے

لہ قاضی محمد سلیمان مصنف رحمۃ للعالمین نے مشاہیر اسلام ہیں اور مولینا ظفر علی خان نے اپنے ایک مضمون میں
بالتفصیل فیضی کو مسلمان ثابت کیا ہے۔

اور یہ نہیں سوچتے کہ دربار اکبری کا جو رنگ تھا۔ اور بادشاہ کے جو خیالات تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے ایسی تفسیر لکھنے سے فیضی کو کونسا دنیاوی فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ اور پھر اگر فیضی کے وہی خیالات تھے۔ جو مُلّا صاحب اُس سے منسوب کرتے ہیں۔ تو ان خیالات نے تفسیر میں کیوں جگہ نہ پائی؟ آزاد مرحوم بالکل صحیح لکھتے ہیں:۔

"زبانی باتوں میں مُلّا صاحب جو چاہیں کہیں۔ مگر نفس مطالب میں جب۔ نہ اب۔ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے۔ کہ وہ بے دینی اور بدنفسی پر آجاتے۔ تو جو چاہتے لکھ جاتے۔ انہیں ڈر کس کا تھا"۔

فیضی کی تفسیر کے بارے میں ملا صاحب کا عجیب معاملہ ہے۔ جب یہ تفسیر لکھی گئی۔ تو آپ نے ایک چھوڑ دو تاریخیں لکھیں۔ تقریظ ان پر مستزاد۔ لیکن گھر پر بیٹھ کر تفسیر اور صاحب تفسیر کو وہ بے نقط سُنائی ہیں۔ کہ خدا کی پناہ (اور پھر ساری دُنیا کو ریاکاری اور مکر وفریب کے طعنے دیتے ہیں!)۔ تفسیر جن حالات میں لکھی گئی۔ ان کے متعلق مُلّا صاحب کے سوا کوئی اور شہادت نہیں۔ جو وہ فرمائیں۔ اُن کا دین ایمان۔ لیکن مؤرخ کو اتنا پُوچھنے کا حق ہے۔ کہ اگر تفسیر ان حالات میں لکھی گئی۔ تو آپ نے اس کی تاریخیں اور تقریظ کیوں لکھی؟ اس کے علاوہ حضرت مجدّد الف ثانی کے خلیفہ، خواجہ بدرالدین سرہندی کا بیان ہے۔ کہ حضرت مجدّد نے تفسیر کی تیاری میں شرکت کی تھی۔ مُلّا صاحب خود کہتے ہیں۔ کہ لاہور کے مشہور فاضل مولانا جمال ؒ نے تفسیر میں اصلاح دی۔ تقریظیں لکھنے والوں میں دوسرے بزرگوں کے علاوہ حضرت مجدّد الف ثانی کے

اُستاد شیخ یعقوب کشمیریؒ کا نام ہے۔ اب اہلِ انصاف ہی فیصلہ کرلیں۔ کہ حضرت مجددؒ یا مولانا جمال اس تفسیر کی تیاری میں ہاتھ بٹاتے یا شیخ یعقوب اسکی تعریف کرتے۔ جو حالت مستی و جذابت میں لکھی گئی۔ اور جسے کتّے ہر طرف سے پامال کرتے پھرتے تھے!!

ملّا صاحب سمجھتے تھے۔ کہ انہوں نے فیضی کے خلاف الحاد و بے دینی کے جو الزام لگائے ہیں۔ اُن کی تفسیر بے نُقط سے قطعی تردید ہو گی۔ اس لئے اُنہوں نے ضروری سمجھا کہ چند باتیں ایسی لکھدیں۔ جن سے اِس تفسیر کی قدر و منزلت میں فرق آئے۔ لیکن فیضی کے خیالات کا اندازہ صرف اِس تفسیر سے نہیں ہوتا۔ اس کی تصانیف میں کئی اور بھی چیزیں ہیں۔ جو ملا صاحب کے نقطۂ نظر کی مخالف ہیں۔ ایک تو نلدمن کے نعتیہ اشعار تھے۔ ملّا صاحب نے انکی نسبت بھی لکھ دیا۔ "و نزدیک بموت بہ مبالغہ و الحاح بعضے آشنایاں بیتے چند در نعت و معراج حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نوشتہ درج کرد"۔ شمس العلما آزاد اس نعت کی بابت کہتے ہیں:۔

"ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ اب دونوں عالمِ آخرت میں ہیں۔ آپس میں سمجھ لیں گے...... اتنا تو پھر بھی کہوں گا۔ کہ نلدمن ہر کتب فروش کی دکان میں ملتی ہے۔ جس کا جی چاہے۔ دیکھ لے۔ پونے دو سو شعر کی نعت، مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی کے ساتھ لکھی ہے کہ انشا پردازی اُس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے۔ نعت کا مطلع ہی دیکھو، جواب ہو سکتا ہے؟ ؎ اَں مرکزِ دورِ ہفت جدول * گرداب پسین و موجِ اوّل"

لیکن تفسیر اور نلدمن کے متعلق تاویلیں لکھ دینے سے مُلا صاحب کی سب مشکلیں آسان نہیں ہوجاتیں۔ فیضی کے اشعار میں اور کئی چیزیں ہیں۔ جو ان کے الزامات کی تردید کرتی ہیں۔ شکر ہے۔ ان سب کی تاویلیں نہیں کر گئے۔ نعت میں کئی پُر اثر رباعیات ہیں ؎

سلطانِ رُسل، ماہِ عجم، شاہِ عرب — سنگِ درِ او قبلہ گہِ اہلِ عرب
از تابشِ قہرِ او کہ دُشمن سوز است — گر سنگ شود موم عجب نیست عجب

اور ؎

شاہے کہ درش قبلۂ عالم دانند — گردِ قدمش سپہر اعظم دانند
ہر دل کہ اثر پذیر نبود از وے — حقّا کہ ز سنگ خارہ اش کم دانند

اس طرح کی اور کئی رُباعیات نعت میں ہیں۔ حمد کے مضامین کو تو فیضی اِس خلوص اور جوش سے ادا کرتا ہے۔ کہ باید و شاید ؎

آں نیست کہ ما ارض و سما نشناسیم — سرِّ قدر و رازِ قضا نشناسیم
ایں ہژدہ ہزارِ عالم و آنچہ در اُوست — نشناختہ بہ، اگر نہ انشناسیم

یارب قدمے براہِ توحیدم دہ — شوقے بہ نہاں خانۂ تجریدم دہ
دِل بستگی بسرِّ تحقیقم بخش — آزادگئے ز قیدِ تقلیدم دہ

یارب من اگر مست و گر ہشیارم — گر خفتۂ غفلتم و گر بیدارم
ہنگامِ جزا چو با تو اُفتد کارم — بر نیّتِ من بہ بیں نہ بر کردارم

اب ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ بدایونی کے بیان کو حرف بحرف صحیح مانا جائے یا فیضی کے ان اشعار پر زیادہ اعتماد کیا جائے جو اس کے دل کے ٹکڑے اور اس کے نہانخانۂ دماغ کی تخلیق ہیں؟ واقعہ یہ ہے۔ کہ فیضی میں تحقیق و تدقیق کا مادہ بہت تھا۔ اور تقلید کی قید بھی طبعِ آزاد کو ناگوار تھی۔ لہٰذا وہ کئی ایسی باتیں کہہ جاتا ہوگا۔ جو بدایونی کے عقیدے کے خلاف تھیں۔ ملا صاحب تو شاید ہر شیعہ کو مُرتد اور واجب القتل سمجھتے تھے۔ انہیں خوش قسمتی سے وہ یقین اور اعتقاد حاصل تھا۔ جو منطقی دلیلوں اور عقلی جرح قدح سے ڈگمگاتا نہ تھا۔ جس کو یہ میسر آئے۔ اس کی خوش قسمتی اور نیک بختی کا کیا کہنا۔ لیکن اس یقین اور اعتقاد کی وجہ سے (جو زمانے کی ناموافقت سے اور پختہ ہو گیا تھا) انہیں اس کا خیال بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ جو شخص اسلام کے مروجہ عقائد سے کسی مسئلے میں اختلاف کرے ضروری نہیں۔ کہ وہ منافق اور خبیث ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ذہنی اُلجھنوں کی وجہ سے وہ راستے سے آوارہ ہو گیا ہو۔ لیکن صحیح راہ پانے کی مُسلسل کوشش کر رہا ہو۔ اور شائد خدا کی درگاہ میں یہ مخلصانہ کوششیں مروجہ عقائد پر ضد اور ہر مخالف کی تذلیل سے زیادہ مقبول ہوں! فیضی کی زندگی میں اس رُوحانی کشمکش اور اس سے نجات پانے کی پیہم کوششوں کے سُراغ ملتے ہیں۔ ہم اس کے وہ اشعار نقل کر چکے ہیں۔ جن میں دربار کی رسائی کے وقت اپنے باطنی نقصوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کے بعد دربار میں جو رنگ غالب آیا۔ اُس سے "چابکئے تعقل" میں اور اضافہ ہُوا۔ اور عقل اور تنقید کے رستے میں پہلے سے بڑھ چڑھ کے قدم مارنے لگے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ چونکہ مذہب سے بھی لگاؤ باقی تھا۔ اس لئے طبیعت کی

کشمکش اور بڑھ گئی۔ لیکن مذہب اور عقل کی یہ کشمکش دائمی نہیں رہ سکتی۔ ایک نہ ایک فریق کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اخیر عمر میں فیضی کو عقل کی کمزوریاں اور کوتاہیاں زیادہ نظر آنے لگیں۔ ایک رُباعی ہے ؎

چند انکہ بعقل گیرو دار است مرا　　صد گونہ گرہ بکار و بار است مرا
اے عقل برو کہ از تو کارم نشود　　وے بخت بیا کہ باتو کار است مرا

آہستہ آہستہ فیضی کو معلوم ہونے لگا۔ کہ روحانی اور وجدانی معاملات میں دِل کی دولت زیادہ ضروری ہے۔ دماغ اتنا کار آمد نہیں ؎

اے کہ بہ معراجِ عقل آمدۂ سر بلند　　رو کہ در دیوانِ عشق جائے تو پست آمدہ!

ایک فارسی رُباعی میں یہ حقیقت صاف صاف بیان کی ہے۔ خُدا سے خطاب ہے ؎

آں ذات کہ عقل از و نشاں دیدۂ نہ　　واں نُور کہ دیدہ گماں دیدۂ نہ
جز نُور نہ وَلے چو نیکو نگرم　　نُورے کہ بدیں دیدہ تواں دیدۂ نہ

ایک اور جگہ بارگاہِ خداوندی میں التجا کی ہے۔ کہ بار خدایا! مجھے "تاریکیٔ عقل" سے بچا اور وہ علم سکھا جس میں تیری رضا ہُوا۔

یارب ز کرم اُمیدِ بے بیم دہ　　علمے کہ رضائے تُست تعلیم دہ
تاریکیٔ عقل در کشا کش دارد　　از شمعِ رضا فروغِ تسلیم دہ!

معلوم ہوتا ہے۔ یہ دُعا قبول ہوئی۔ اور اخیر عمر میں فیضی کو نورِ ایمان حاصل ہوگیا جس کا نتیجہ اس کی تفسیر بے نقط اور نل دمن کی اس نعت میں ظاہر ہُوا۔ جن کی بدایونی لکھتا ہے۔ کہ اخیر عمر کی تصنیف ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ شائد اس وقت بھی

بعض باتوں میں فیضی کے ایسے خیالات تھے۔ جنہیں مُلّا بدایونی اور بعض متّقی مُسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن اگر ان باتوں کی بنا پر کسی کے کافر ہونے کا فتوےٰ دیا جاسکتا ہے۔ تو اسلام کے بڑے بڑے علما اور فضلا میں سے بہت سے دوسروں کو بھی دائرۂ اسلام سے خارج کرنا پڑے گا۔ اور پھر فیضی کی اپنی تفسیر اور دوسرے کلام کو نظر انداز کرکے بدایونی کے بیان کو اہمیت دینا نہ فنِ تاریخ نویسی کے موافق ہے۔ نہ اصولِ انصاف کے!

بدایونی کی نسبت آزادؔ لکھتا ہے۔ کہ ابوالفضل اور فیضی کا ذکر رشکِ منصبی سے متاثر ہو کر کرتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں فیضی کے اپنے دو شعر ہیں۔ فیضی نے انہیں پر عمل کیا ہے۔ اور ہم دُعا کرتے ہیں۔ کہ خُدا فیضی کے مخالفین کو بھی اس اہم اسلامی اصول پر عمل کرنے کی توفیق دے ؎

فیضی چو شنیدی از یکے بد — زنہار کہ بد مگوئی وے را
رَو گوش یقیں کشا و بشنو — ظنوا بالمومنین خیرا

ابوالفضل

ابوالفضل، اکبر کے نئے مذہب دینِ الٰہی کا خلیفہ تھا۔ اور شاید اکبر کی بے راہ روی میں جتنا دخل اسے تھا۔ فیضی کو نہ تھا۔ لیکن جب بدایونی نے اپنی تاریخ لکھی۔ اُس وقت ابوالفضل زندہ تھا۔ اس لئے مُلّا صاحب نے اس کا ذکر زیادہ احتیاط سے کیا ہے۔ اور اُسکے بیان میں طنز و ظرافت اور دُشنام گوئی کے وہ بے پناہ تیر نہیں چلائے۔ جو فیضی کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے ترکش سے نکلے ہیں۔

ابوالفضل کا ذکر ایک دو دفعہ تو ان بحثوں کے ضمن میں آتا ہے۔ جو مختلف

مذہبی یا فقہی مسائل (مثلاً متعہ یا رسولِ اکرمؐ کی شان میں بدگوئی کرنے والے کی سزا) کے متعلق اکبر کے سامنے کی گئیں۔ ان بحثوں میں ابوالفضل نے مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی مخالفت کی۔ لیکن چونکہ ہر ایک بات میں فقہا نے قرآن۔ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس لئے کوئی ایسی بات نہیں جس پر الحاد یا بدمذہبی کا فتوےٰ عائد ہو سکے۔ مخدوم الملک سے تو ابوالفضل کی خاندانی عداوت تھی۔ ہر بات میں ان کی مخالفت کرنا وہ فرائضِ فرزندانہ کی بجا آوری کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں مخدوم الملک اور ابوالفضل بلکہ ابوالفضل کے سارے خاندان کے خیالات میں بڑا فرق تھا۔ مخدوم الملک قدامت پسند علما کے سرگروہ تھے۔ اُن کے خیال میں ایک سُنّی۔ حنفی مسلمان بادشاہ کے عہدِ حکومت میں کسی مسلمان کو حق نہ تھا۔ کہ وہ اسلامی عقائدِ راسخہ سے، بلکہ ان عقائد و اطوار سے جنہیں مخدُوم الملک پسند کرتے تھے، بال برابر اِدھر یا اُدھر ہو۔ انہیں ابوالفضل کی آزاد خیالی ضرور ناپسند ہو گی۔ چنانچہ اُنہوں نے ابتدائی ایام میں ہی اپنے شاگردوں سے کہنا شروع کر دیا۔ کہ پتہ نہیں ابوالفضل سے کون کونسے فتنے برپا ہوں گے ؎

که چوں طفلیش بدیدم بنمودم اہلِ دیں را
که شود بلائے جان ہا، بشما سپردم ایں را

اس کے علاوہ بدایونی نے ابوالفضل سے ایک اپنی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ مجھ سے ابوالفضل کہنے لگا۔ کہ مجھے جملہ مصنفین سے دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیغمبرانِ سابق کے حالات اُنہوں نے تفصیل سے نہیں لکھے۔

دوسرے تذکرۃ الاولیا۔ نفحات الانس اور اِس طرح کی کتابوں میں ہر اہلِ حرفہ کے حالات لکھے ہیں۔ پتہ نہیں اہلِ بیت نے کیا گناہ کیا تھا۔ کہ ان کے حالات ان تذکروں میں نہیں ملتے۔ مُلا صاحب نے جو مناسب موقع جواب سمجھا دیا۔ پھر اپنی شوخیوں پر اُتر آئے۔ کہنے لگے۔ کہ اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ ان "مذاہبِ مشہورہ" میں سے تمہارا رجحان کس طرف ہے (کہ میل شما ازیں مذاہب مشہورہ بکدام بیشتر باشد) ابوالفضل نے کہا۔ کہ میرا تو جی چاہتا ہے۔ کہ چند روز وادیٔ الحاد کی تھوڑی سی سیر کر لوں (میخواہم۔ کہ روزے چند در وادیٔ الحاد سیرے بکنم) مُلا صاحب نے ایک اور چرکہ لگایا۔ کہ نکاح کی قید اُٹھا دو۔ تو خوب رہے۔ ابوالفضل اس کا کیا جواب دیتا۔ ہنس کر چپ ہو رہا۔

اس گفتگو سے ابوالفضل کے اسلوب خیال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ فیضی کی طرح ضرور تشکک کے صحرا میں سرگرداں رہا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ تمام مذاہب کے روشن پہلو دیکھ لے۔ لیکن اس گفتگو سے کبھی اس کے الحاد کا فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اس نے اس گفتگو میں الحاد کا لفظ اِستعمال کیا ہے۔ لیکن وہ بھی مُستقبل کی نسبت۔ یہ نہیں کہا۔ کہ مَیں اس وقت اسلام میں یا کسی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ اور پھر ہنسی ٹھٹھے کی گفتگو میں، جب فقرے بازی ہو رہی ہو انسان تول تول کر زبان سے لفظ نہیں نکالتا، مُلا صاحب کے اس استفسار پر کہ تم کونسا مذہب پسند کرتے ہو، ابوالفضل کا یہ کہنا کہ مَیں تو لامذہبی کا رنگ ڈھنگ بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ شوخ کلامی اور بذلہ سنجی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

نے ابوالفضل کے مذہب کے متعلق دربارِ اکبری میں ایک علیحدہ باب قائم کیا ہے۔ عام باتوں کی نسبت تو انہوں نے لکھا ہے۔ کہ ابوالفضل بادشاہ کا نوکر تھا۔ جو بادشاہ کا حکم ہوتا۔ بجا لاتا۔ لیکن باپ کی وفات پر اُس نے جو کیا۔ اسے انہوں نے خاص اہمیت دی ہے۔ عہدِ اکبری کی مذہبی بوالفضولیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"خیر، ان باتوں کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کے معاملات کچھ اور ہیں اور ملکی مصلحت کا مذہب جُدا ہے۔ ان میں اکبر پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اُس کے نوکر تھے۔ جو آقا کا حکم ہوتا تھا۔ بجالانا واجب تھا۔ یہاں تک مقدمہ سہل ہے۔ ہاں مشکل یہ ہے۔ کہ جب شیخ مبارک مر گئے۔ تو شیخ ابوالفضل نے مع بھائیوں کے بھدرا کیا۔"

مولانا آزاد کے زمانے میں شعائرِ اسلامی کی زیادہ پابندی تھی۔ لیکن آج تو شاید بھدرا کرنے کو ابوالفضل کے کفر کا بدیہی ثبوت نہ سمجھا جائے۔ ایک تو اس فعل کے متعلق بھی ظاہر ہے۔ کہ بادشاہ کی خوشنودی منظور ہو گی۔ قدیم سے بعض تورانی خاندانوں میں موت کے وقت یہ رسم بجالاتے تھے۔ اور اکبر نے اس رسم کو کچھ تو مغلیہ آئین کے خیال سے، اور کچھ ہندوانہ رسم کا پاس کر کے دوبارہ تازہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ، مانا کہ بھدرا اشعارِ اسلامی کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن کیا یہ اس قدر اصولی اور بُنیادی خلاف ورزی ہے۔ کہ اس پر عمل پیرا ہونے والا دائرۂ اسلام سے باہر نکل جاتا ہے؟ آج جبکہ ہندوستان اور ترکی کے بڑے بڑے "قائد" اور "غازی" بغیر کسی

بادشاہ کی خوشنودی کے خیال۔ بلکہ محض مغربی فیشن کی پابندی کے لئے "کرزن فلیشن" کر کے قریب قریب بھدرا کئے ہوتے ہیں' شائد ابو الفضل کا جرم 'گناہِ کبیرہ' یا کم از کم ناقابلِ معافی نہ سمجھا جائے!

جہانگیر نے ابو الفضل کا ذکر چھوٹی تزک میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ شیخ ابو الفضل نے میرے باپ (اکبر) کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی۔ کہ قران مجید' رسول اکرمؐ کا اپنا کلام ہے۔ ابو الفضل کے بارے میں جہانگیر معتبر راوی نہیں۔ اور اگر وہ واقعی کلام مجید کا منکر ہوتا۔ تو بدایونی ضرور اس کا ذکر کرتا۔ آخر ابو الفضل کی نسبت جہانگیر کو بدایونی سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ ابو الفضل کے اپنے رقعات سے اس خیال کی تغلیط ہوتی ہے۔ اور ان میں بڑے ادب اور ارادت سے اپنی نسبت "تلاوتِ قرآن مجید" کا ذکر ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال جہانگیر کا بیان درست ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ کلام مجید کے بارے میں ابو الفضل کا عقیدہ ایسا تھا۔ جس کی مسلمان عام طور پر مخالفت کریں گے۔ اور اس کے کفر کا فتوےٰ دیں گے۔ لیکن جب تک معلوم نہ ہو۔ کہ ابو الفضل کا صحیح طور پر اس بارے میں عقیدہ کیا تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مُلّا عبد القادر بدایونی نے اکبر کی عام بد مذہبی کے ضمن میں کہا تھا۔ کہ وحی سے انکار کیا جا رہا تھا۔ لیکن ابو الفضل کی تخصیص نہیں کی۔ جہاں تک وحی کا تعلق ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے۔ کہ وحی کی ترجمانی اسلام کے بعض بڑے بڑے علما نے عامتہ الناس سے الگ ہو کر کی ہے۔ موجودہ زمانے میں سرسید کو جانے دیجئے عہدِ شاہجہانی کے ایک مشہور عالم شیخ محب اللہ الہ آبادی نے ایک رسالہ کتاب تسویہ کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں وہ جبریل

وحی کے متعلق ذیل کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں :۔

"جبریلِ محمدؐ در ذاتِ محمد بود۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہمچنیں جبریل با ہر پیغمبرے در ذاتِ وے بود۔ و آں قوت وحی بر ایشاں نازل مے گردید۔ ولہذا جبریل باہر پیغمبرے بزبانِ وے سخن گفتہ"

علامہ بحر العلوم اپنے زمانے میں شاید ہندوستان کے سب سے بڑے معقولی عالم تھے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"جبرئیل کہ مشہور رسل علیہم السلام است۔ و وحی از جانب حق میرساند۔ آں حقیقت جبرئیلہ است۔ کہ قوتے از قوائے رسل بود متصور شدہ در عالمِ مثال بہ صورتے کہ مکنون بود در رسل مشہود مے شود و مرسل مے گردد۔ و پیغامِ حق مے رساند"

اس کے علاوہ ابو الفضل کے بارے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بسا اوقات وہ بحث کے دوران میں فریقِ مخالف کا نقطۂ نظر پیش کرتا۔ یا اپنے دل کے شبہاتِ پریشاں کو بیان کرتا۔ جو کبھی اس کے دماغ میں گزرتے تھے۔ لیکن جن کا وہ قائل نہ تھا۔ اور اس کے مخالف ان عارضی شبہات یا خیالی اعتراضات کو جو وہ فقط بحث کی غرض سے پیش کرتا۔ اس کے دلی اعتقادات سمجھ لیتے۔ وہ خود اپنے مخالفین کی نسبت کہتا ہے۔ "باز پرس اشتباہات را کامن معتقدات پنداشتہ بکیں توزی نشستند" یعنی بقول حاشیہ نگار انشائے ابو الفضل "سوالات شبہات مرا معتقداتِ پوشیدۂ من دانستہ بدشمنیٔ من نشستند"۔

ابو الفضل کے صحیح خیالات کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی اپنی

تصانیف پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ ابوالفضل کی تصانیف سے خیال ہوتا ہے۔ کہ فیضی کی طرح وہ بھی ایک مدت تک تشکک وشبہات کی وادی میں سرگرداں رہا۔ انشائے ابوالفضل کے تیسرے دفتر میں اس کی کئی تقریظیں درج ہیں۔ شیخ کا قاعدہ تھا۔ کہ جب فرصت ملتی۔ اپنا وقت صوفیائے کبار کی مشہور تصانیف اور شعرائے نامور کے کلام کے مطالعہ اور اُن سے اپنی پسند کا انتخاب مرتب کرنے پر صرف کرتا۔ ان منتخبات کے شروع یا اخیر میں اس نے اپنی تقریظیں لکھی ہیں۔ جو دفتر سوم میں جمع ہوئی ہیں۔ ان تقاریظ میں اصل کتاب کے متعلق تھوڑا سا ذکر ہے۔ زیادہ تر ابوالفضل نے اُن خیالات کو جو انتخاب مرتب کرتے وقت اس کے ذہن میں تھے۔ درج کیا ہے۔ ان عبارتوں سے شیخ کی ذہنی کشمکش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔ "اے ابوالفضل! شرمے از خود بدار۔ کہ از عبداللہی بعبدالعلمی آمدی و از آنجا افتاں وخیزاں بعبدالطبعی" لیکن اس گرداب سے نکلنے کی مسلسل کوشش جاری رہی۔ ایک اور جگہ خدا سے عرض کیا ہے:-

"نمیدانم کہ چہ کردہ ام۔ کہ مستوجب آں شدہ ام کہ از عبداللہی بعبدالطبعی آوردی۔ اگرچہ وثوق بر جلائل آلائے تو درجۂ اعلےٰ است۔ اما بر آستانِ کریمی، تو دریوزہ مے نمایم۔ کہ از عبداللہی بعبد الدراہمی والدنیا نیاری۔ چندگاہ است کہ فطرت با طبیعت من در نبرد است۔ و در کشمکش ابنائے زمانہ افتادہ ام۔ نہ قوت گریز و نہ قدرت پرہیز۔ رباعی

صبرے نہ کہ از عشق بپرہیزم من — بختے نہ کہ با دوست در آمیزم من
دستے نہ کہ با قضا در آویزم من — پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من"

شیخ ابوالفضل کے خیالات چند ایک باتوں میں عام مسلمانوں سے مختلف تھے۔ مثلاً ایک خط میں اپنی والدہ کو لکھتا ہے۔ کہ شریعت اسلامی کے ترجمانوں کے نزدیک بے نماز کے ساتھ نیکی کرنا بدی اور بدکرداری کی مدد کرنا ہے۔ اور دوزخ میں اپنی جگہ بنانا ہے۔ لیکن میرے نزدیک تمام مظلوموں اور ضعیفوں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ بے نماز اور فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح شیخ معقولات کو دین کے مخالف نہیں سمجھتا تھا۔ (اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتا ہے "معقولات را مخالفِ دین شمردہ") اور مذہب کی ترجمانی عقل و حکمت کے موافق کرتا۔ جس سے بعض اوقات اس کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے مختلف ہو جاتے۔ لیکن اگر اس کے حالاتِ زندگی دیکھیں تو خیال ہوتا ہے۔ کہ ایسا نیک نفس اور متدین انسان شائد ہی علما کی جماعت میں کوئی گزرا ہو۔ مآثر الامرا میں ذخیرۃ الخوانین کا بیان نقل کیا ہے۔ کہ شیخ رات کے وقت درویشوں کے گھر جاتا۔ اشرفیاں ان کی نذر کرتا۔ اور عرض کرتا۔ کہ ابوالفضل کی سلامتیٔ ایمان کی دعا کیجئے۔ اس کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ "آہ چہ باید کرد" یہ کہتا اور سرد آہیں بھر کر زانوؤں پہ ہاتھ مارتا۔ ناسزا لفظ اس کی زبان پر نہ آتا۔

ابوالفضل نے بدایونی کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کا اصول تھا۔ کہ جہاں تک ہو سکے ہر ایک کے ساتھ نیکی کی جائے۔ اکبر کے دربار میں اس نے بڑا اختیار پایا۔ لیکن اُس نے اسے صرف آفاقی خدمت اور لوگوں کے ساتھ بھلائی میں استعمال کیا۔ کوئی نہیں کہتا۔ کہ ابوالفضل نے

جمع اموال یا اپنا جاہ و جلال بڑھانے کے لئے کوئی کوشش کی ہو خیال کیجئے۔ کہ بدایونی سے زیادہ ابوالفضل فیضی کا کونسا بڑا دشمن تھا۔ اگر وہ جمع اموال کی کوشش کرتے۔ تو کیا بدایونی بھانڈا نہ پھوڑتا!

ابوالفضل کو قضا و قدر بادشاہ کے دربار میں لے گئی تھی۔ اور بڑے بڑے مہماتِ ملکی اُس کی رائے سے سرانجام پاتے۔ لیکن اصل میں وہ اہلِ علم اور اہل اللہ کا عاشق تھا۔ اس کا بس چلتا۔ تو وہ اپنا سارا وقت کتابوں کی ورق گردانی میں گزارتا۔ ایک خط میں شیخ معصوم بھکّری (مصنف تاریخ سندھ؟) کو لکھا ہے:-

"منکہ ملازمتِ شاہی را برخود لازم داشتہ ام۔ و کمرِ خدمت بر میانِ جاں بستہ ام۔ نہ برائے رفاہیتِ نفسِ شومِ خود۔ بلکہ بجہتِ دلجوئی و خیر خواہی طوائفِ انام خدمتِ ملوک اختیار نمودہ ام۔ و الّا خدا آگاہ است۔ و فرشتگان گواہ اند کہ نانِ فقر و جامۂ درویشی و گوشہ نشینی و زاویہ گزینی را از محصولِ تمام عالم بہتر میدانم۔ و بودن حجرۂ خانقاہ و مطالعۂ صفحۂ کتب دینی و رسائلِ یقینی را بخراجِ مملکت نمیدہم"۔

اپنے مرشد شیخ ابو اسحاق دہلوی کو ایک خط میں لکھا ہے۔ کہ ظلِ سبحانی کی کرم فرمائی سے آسودہ حالی ہے۔ اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ لیکن اب بھی بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے۔ کہ بے فکری تھی۔ حجروں میں گوشہ نشین تھے۔ کتابوں کے صفحے اُلٹتے تھے۔ اور راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتے تھے:-

"خوش باشبہائے طفولیت و آسائش ہائے اوقاتِ کوچکی و بے نیازیہائے

لیالیِ خوردی و گوشہ نشینی ہائے حجرہ و صفحہ شماری ہائے آوانِ مطالعہ و
شب بیدار یہائے عبادتِ ایزدی و سحر خیز یہائے بذوق و آرامِ دِل ،
داغ سینۂ بے کینہ شدہ است "۔

لیکن درباری تعلقات کے باوجود، جتنا وقت ملتا، کتابوں کے مطالعہ، اہل اللہ کی صحبت، تلاوتِ قرآن مجید اور یادِ الٰہی میں صرف ہوتا۔ ابوالفضل کے وسعتِ مطالعہ پر اُس کی تقریظیں گواہ ہیں۔ وہ خود کئی خطوط میں اپنے مشغلوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک خط میں شیخ جوہر سرہندی کو لکھا ہے۔ کہ خُدا کا شکر ہے۔ کہ اِس نیاز مند نے دُنیا کی ہزاروں اُلجھنوں کے باوجود روزِ آخرت کو نہیں بھُلایا۔ اور دُنیا و مافیہا کی محبت کے زنگ کو آئینۂ دل سے یک قلم ترک کر دیا ہے۔ وقت کا اکثر حصّہ دینی کتب و رسائل کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ نیک۔ متقی اور پرہیزگار لوگوں کی صحبت رہتی ہے۔ شام سے لے کر صبح تک ان عُلما و فُضلا کا جو زمانہ بھر میں سب سے ممتاز ہیں ساتھ رہتا ہے۔ اور قال اللہ وقال الرسول کے سوا کسی بات کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے۔ ان بزرگوں کی خدمت اور خبر گیری کے لئے کرتا ہوں۔ دربارِ شاہی سے ہر ایک کے لئے یومیہ مقرر کر دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ وظیفہ و مدد معاش کا بندوبست کیا ہے۔ تاکہ یہ بزرگوار دلجمعی سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہیں۔ اسی طرح کا ایک خط قاضی عبدالستار کے نام ہے :۔

"باوجودِ مشغلۂ دُنیا و تقیدِ آمد و رفتِ دربار و پرستارے شہریار و بار و
ازدحام رجوعاتِ خلق اللہ و خدماتِ وضیع و شریف و وابستگئ تعلقات

ولواحقاتِ عالمِ فانی وسرائے ظلمانی وعوارضاتِ جسمانی وتلبیساتِ شیطانی وتموجاتِ طوفانی، اصلاً وقطعاً طیلسانِ تعبدِ حق جل سبحانہ، از دوش نکشیدہ وشربتِ غفلت بکام سہولت نچشیدہ بلکہ بچشمِ خیال ندیدہ وبگوشِ تصور نشنیدہ ...... از مطالعۂ کتبِ ہدائت نمائے شرلعبت آرا، حقیقت افزا غافل و ذاہل نہ نشستہ۔ وبوسع امکان سعادتِ درس علوم وحقائقِ اسرار وتعلیم رسائل حکمت وتصوّف از دست ندادہ ..... وخلاصۂ وقت را بتلاوتِ قرانِ مجید وفرقان حمید بسر بُردہ شب بیداری وسحر خیزی را بخود از جملہ اوراد وعادات قرار دادہ وابوابِ عبودیتِ حق تعالےٰ بر روئے دل کشادہ"

شیخ کے دو خطوں میں حج کی طرف اشارہ ہے۔ ایک خط قدیمی مخالف شیخ عبد النبی کے نام ہے۔ اور اس زمانہ میں لکھا گیا۔ جب شیخ حج کے لئے جا رہے تھے۔ اس میں کہا ہے۔ کہ مَیں نے بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت مانگی۔ مگر منظور نہ ہوئی۔ اب معاملہ اگلے سال پر رہا۔ اگلے سال پھر اجازت مانگوں گا۔ اگر مِل گئی۔ تو حج کا احرام باندھوں گا ؎

یارب این آرزوئے من چہ خوش است تو بدین آرزو مرا برسان

دوسرا خط شیخ نظام پانی پتی کے نام ہے۔ جو حج کے لئے گئے ہوئے تھے انہیں لکھا ہے۔ کہ جب آپ بیت الحرام کی زمین بوسی کریں۔ اور روضۂ نبوی کی زیارت سے فیض یاب ہوں تو اس آستاں پر ان نارا ستوں کو بھی یاد کریں ؎

اے مرغِ شاخسارِ عنائت کہ دمبدم از روئے اصطفا رسدت نکہتِ وصال
خوش مے پری بلند۔ فراموشیت مباد از حالِ ما کہ بستہ پریم وشکستہ بال

اس خط میں پھر اپنی حج اور زیارتِ روضۂ نبوی کی خواہش کو دُہرایا ہے۔
اور ایک قطعہ درج کیا ہے ؎

کے بود یا رب کہ رُو در یثرب و بطحا کنم	گہ بمکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم
بر کنارِ زمزم از دل بر کشم یک زمزمہ	وز دو چشم خونفشاں آں چشمہ را دریا کنم
یا رسول اللہ بسوئے خود مرا راہے نما	تا ز فرقِ خود قدم سازم، ز دیدہ پا کنم

مآثر الامرا میں لاہور کے مشہور بزرگ شاہ ابوالمعالی قادریؒ کا بیان درج ہے۔ کہ مَیں ابوالفضل کے کاموں کا مخالف تھا۔ ایک روز خواب میں دیکھا۔ کہ رسُول اکرمؐ کی مجلس برپا ہے۔ اس میں ابوالفضل کو لایا گیا۔ اور آنحضرت نے اپنا خاص جبۂ مبارک شیخ کے سر پر ڈالا اور کہا۔ کہ یہ شخص دُنیا میں چند دِن افعالِ ناشائستہ کا مرتکب ہوا۔ لیکن اس کی وہ مُناجات، جس کا پہلا فقرہ ہے۔ "الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرافرازی بخشی و بداں را بمقتضائے کرم دلنوازی کنی"۔ اس کی نجات کا باعث ہو گئی۔

ابوالفضل، فیضی سے عمر میں چھوٹا تھا۔ لیکن اُس کی طبیعت زیادہ ہموار اور اپنے قابو میں تھی۔ فیضی شاعر تھا۔ اور شاعروں کی وارستگی اور لااُبالی کی جھلک اس میں بھی موجود تھی۔ ابوالفضل کو کئی خط فیضی کے نام پند و نصیحت میں لکھنے پڑے۔ ان میں اس پند گوئی کے لئے معذرت بھی کی ہے۔ (قبلہ من۔ از من وعظ و پند بہ نسبتِ شما زیرہ بکرمان بُردنست۔ بدیہی است۔ کہ شپرہ را در حضرتِ نیّرِ اعظم چہ یارائے گستاخی و گستاخ روئی و قدرتِ وعظ گوئی) لیکن فیضی کے نام رقعاتِ ابوالفضل میں جتنے خط ہیں۔ ان سب میں وعظ و نصیحت کا عنصر

غالب ہے۔ زیادہ تر کلام مجید کی آیات درج کر کے نصیحت کی ہے۔ کہ ان چند روزہ زندگی کو اس طرح گزارو۔ کہ آباؤ اجداد کا طریقہ ترک نہ ہو۔ اور روزِ قیامت شرمساری نہ اُٹھانی پڑے۔ یادِ خدا پر بہت زور دیا ہے:۔

"در خلاء و ملا نام حضرت بے چوں را بہ زباں مے رانده باشند۔ کہ مقصود از آفرینشِ عالم و آدم ہمیں است۔ کہ او را بشناسد۔ و فراموشی را شعار خود نسازند...... مثنوی ؎

ہر آنکہ غافل از وے یکزمان است — در آں دم کافر است، اما نہان است
اگر آں غافلی پیوستہ بودے — درِ اسلام بر وے بستہ بودے"

آگے چل کر نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی اور گناہوں سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔

"عزیزِ من۔ معرفتِ الٰہی را مرأت قلب خود دانستہ پنج وقت نمازِ جماعت ادا مے نموده باشند۔ و از گناہانِ صغیرہ و کبیرہ اجتناب فرمایند۔ و از جمیع مناہی خود را کنار کشیده ثابت مے بوده باشند"۔

دوسری نصیحت صُلحِ کل، اور ہر فردِ بشر سے نیک سلوک کرنے کے متعلق ہے:۔

"عزیزِ من، بہر صنفے از اصنافِ انسان بنوع باید سلوک نمود۔ کہ او را ہمچناں متوقع گردد۔ کہ ایں از منست و با منست و یاور من است..... اگر احیاناً از دُشمن بدی رسد۔ کہ ضرر جاں در و باشد در قصور آں فی الفور تصدیع نرسانند تا جاں دارند۔ باوے سازش (یعنی موافقت) فرمایند۔ و اگر آں ہم نتواں نمود ناگزیرش بغضب شیطان و حوادثِ دوراں حوالت نمایند"

عرفی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ یہ شعر ایک کم عمر شاعر کا ہے۔ لیکن

اچھی بات جہاں سے ہو، حاصل کر لینی چاہیئے۔ اور مجھے تو یہ شعر بے حد پسند ہے ؎

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن
مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

اس کے علاوہ محتاجوں کی حاجت روائی پر بڑا زور دیا ہے۔ جو ابوالفضل کی زندگی کا مسلکِ اعلےٰ تھا۔ وہ بار بار کہا کرتا تھا۔ کہ غریب پُرسی ترجمۂ خدا پرستی است۔ و مسکین نوازی لازمۂ حق پرستی۔ یعنی خدا کی عبادت کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ اُس کی مخلوقات سے نیک سلوک کیا جائے۔ فیضی کو لکھا ہے۔ "و مہما امکن سعی نمایند۔ کہ بہ زیر دستانِ مظلوم و شکستہ دلانِ مجہول تظلم راہ نیابد۔ و ترحم بوقوع آید۔ و بناحق دلِ نامراداں را نہ رنجانید۔ کہ نارضائی ایشاں ترجمۂ نارضائی ایزد متعال است۔"

رقعاتِ ابوالفضل سے خیال ہوتا ہے۔ کہ بعد میں اکبر نے جو آئین، مذہب اور معاشرت کے بارے میں شرعِ محمدی کے خلاف وضع کئے تھے۔ وہ ابوالفضل کو ناگوار تھے۔ لیکن درباداری کی مُہر زبان پر لگی ہوئی تھی فیضی کو لکھا ہے:-

"و احکامِ بادشاہی کہ بشرعِ محمدی منفق نیفتد۔ از اں اجتنابِ تمام فرمایند۔ و تا توانند در رفع و دفع آں کوشش مالا کلام بکار برند۔ و بنوعے مطالب خلائق را بعرضِ اشرف رسانند۔ کہ در اں صوبہ حبۂ فرو گذاشت نشود۔ و مہمات در کارِ خلق نیز باحسن وجوہ ساختہ گردد۔ چہ قصورے دفتورے در طرفین راہ نیابد۔ آں بوسیلۂ خدا ترسی و آں بصیغۂ نمک حلالی۔"

بدایونی کے نزدیک تو شائد ابوالفضل مُلحد اور کافر تھا۔ لیکن ہم نے اس کے

خطوط اور تصانیف سے طویل اقتباسات دئے ہیں۔ ناظرین انہی سے اندازہ لگالیں۔ کہ اسے کافر سمجھا جائے۔ یا خدارسیدہ، نیک نفس، آزاد خیال مسلمان!!

مُلا عبدالقادر بدایونی

گذشتہ اوراق میں مُلا عبدالقادر بدایونی کا نام بار بار آیا ہے۔ عہدِ اکبری کی مذہبی تاریخ کی عمارت کے لئے اینٹ پتھر آپ کی کتاب "مُنتخب التواریخ" سے ہی ملتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ آپ کا بھی کچھ حال لکھ دیا جائے۔

اسلامی ہندوستان کی فارسی تاریخوں میں جتنی شہرت بدایونی کی کتاب کو حاصل ہے۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ فرشتہ کا نقطۂ نظر بڑا وسیع تھا۔ اس کی کتاب بڑی جامع ہے اور اس نے صرف سلاطینِ دہلی کا تذکرہ نہیں لکھا۔ بلکہ دکن۔ کشمیر۔ سندھ۔ گجرات وغیرہ کے تمام مسلمان فرمانرواؤں کا بھی حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا قلم اتنا ہموار ہے۔ کہ جو کوئی تمام اسلامی ہندوستان کی تاریخ جاننا چاہے۔ اُسے فرشتہ کو ترجیح دینی پڑے گی۔ لیکن صحتِ واقعات اور شستگیٔ بیان کے باوجود فرشتہ میں وہ چٹکیاں اور گدگدیاں کہاں۔ جو بدایونی کی تاریخ کو زعفران زار بنا دیتی ہیں۔ بدایونی کی کتاب سے دو چار سال پہلے اُس کے دوست مرزا نظام الدین نے طبقاتِ اکبری لکھی۔ اور اُس کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا بدایونی کا۔ بلکہ بدایونی خود کہتا ہے۔ کہ اس نے اپنی کتاب کی بنا طبقاتِ اکبری پر رکھی مرزا نظام الدین کا علمی اور منصفانہ نقطۂ نظر ایک اور وجہ فضیلت ہے۔ لیکن

کیا طبقاتِ اکبری کو وہ شہرت اور اہمیت نصیب ہوئی ہے - جو بدایونی کی تاریخ کو حاصل ہے؟

بدایونی کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کا طرزِ تحریر ہے۔ "اس کی ہر بات چٹکلہ اور ہر فقرہ لطیفہ ہے" - اس کی تحریر میں عبارت آرائی اور انشا پردازی کو دخل نہیں - لیکن وہ الفاظ کچھ ایسے منتخب کر کے لاتا ہے - اور انہیں اس ڈھب سے بٹھاتا ہے - کہ فقروں میں جان پڑجاتی ہے اور عبارت چمک اٹھتی ہے - یہ صحیح ہے - کہ اس شوخ نویسی کی ایک وجہ ان کی طنزیں ہیں، جو لطیف یا کثیف پیرائے میں ساری کتاب میں جاری رہتی ہیں - کہیں کسی پر چھری چلتی ہیں - کہیں نشتر اور کہیں فقط سوئی چبھوئی جاتی ہے - اور وہ اس طرح کہ نہ صرف پڑھنے والا بلکہ جس غریب پر وار ہوتا ہے، وہ بھی داد دئے بغیر نہیں رہتا - لیکن اس طنز نگاری کے علاوہ بدایونی کو ایک اور ملکہ بھی حاصل ہے - وہ مختصر الفاظ میں افراد اور واقعات کی اس طرح تصویر کھینچ دیتا ہے - کہ دل میں کھب جاتی ہے - ناظرین نے مغلیہ مصوری کے نمونے دیکھے ہوں گے - نہایت مختصر پیمانے پر تصویریں بناتے ہیں - لیکن نہایت واضح اور صاف اور روشن - بدایونی کا کمال بھی انہیں کا ملا ان فن سے ملتا ہے - موقلم کے دو تین ہاتھ مارتا ہے - اور دو چار ایسی جزئیات نمایاں کر دیتا ہے - جن سے تصویر کے خد و خال روشن ہو جاتے ہیں - اور اس طرح نہیں - کہ آپ پھر انہیں بھول جائیں -

لیکن بدایونی فقط ایک آرٹسٹ ہی نہیں - وہ ایک قابلِ عزت مورخ بھی ہے - اور مشرقی مورخین میں بالکل انوکھا - وہ اپنا زورِ قلم مہمات اور فتوحات کی تفصیل پر

صرف نہیں کرتا۔ جن سے ایشیائی تاریخیں پُر ہیں۔ وہ ان جزئیات پر بھی نظر رکھتا ہے۔ جنہیں دُوسرے مورخین بے خبری سے یا مصلحتاً نظر انداز کر جاتے ہیں۔ عہدِ اکبری میں اسے اس کا بڑا موقع حاصل تھا۔ وہ دربارِ شاہی سے متعلق تھا۔ اور جو کچھ وہاں گذرتا تھا۔ اُسے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ ملک میں واقع ہوتا تھا۔ سنتا تھا۔ مُلک میں کونسی بڑی ہستی ہو گی۔ جو دار الخلافے میں ایک آدھ دفعہ آئی نہ ہو۔ یا جسے بدایونی نے لشکرِ شاہی کے ساتھ پھرتے پھراتے دیکھا نہ ہو۔ ان سب معلومات کا خزینہ اس کی کتاب ہے۔ جس میں ان معلومات کو بڑے قرینے اور سلیقے سے سجایا ہے۔ خوبیٔ تحریر اور اہم جزئیات سے واقفیت کے علاوہ بدایونی کی نسبت یہ بھی کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ ایک صاحب ہوش انسان تھا۔ اُس میں وہ غائر نظر اور چشمِ بصیرت نہ تھی۔ جو سارے کے سارے واقعات کو شروع سے اخیر تک ایک نگاہ میں دیکھ لیتی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھیں بند نہ تھیں۔ اور جہاں تک ان کی پہنچ تھی۔ وہاں تک انہیں سب جزئیات نظر آجاتی تھیں۔ اور باوجودیکہ اس کی کتاب میں مورخانہ غیر جانبداری کا شائبہ نہیں۔ لیکن اس کی رائے اور خیال کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ صحت واقعات کا بھی اسے خیال تھا۔ جن لوگوں سے اُسے شکایتیں تھیں (اور ان کے ہمعصروں میں کوئی ہی خوش قسمت ہو گا۔ جس سے وہ خوش ہوا) اُن پر اُس نے اس طرح وار کئے ہیں کہ مشرقی تاریخ نویسی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ابھی تک کسی نے نہیں کہا۔ کہ بدایونی نے واقعات اپنی طرف سے گھڑ لئے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ اس کی

---

[1] البتہ اس امر کی شہادت ضرور ملتی ہے۔ کہ بعض واقعات کو اس نے موڑ توڑ کر پیش کیا۔ مثلاً (صفحہ آئندہ پر)

کتاب پڑھتے وقت دل گواہی دیتا ہے۔ کہ اس نے کوئی بات جھوٹ نہیں لکھی۔ لیکن واقعات کو اس طرح بٹھایا ہے۔ اور اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح کے شوشے چھوڑے ہیں۔ کہ اُن کی نیکیاں بھی بُرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اور بُرائیاں تو خیر بُرائیاں ہیں ہی!

بدایونی کی تاریخ نویسی میں کچھ اس طرح کی دلآویزی ہے۔ اور فنی نقطۂ نظر سے اس میں اتنی خوبیاں ہیں۔ کہ اس کے عیب نظر نہیں آتے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ جہاں اس مورخ میں اتنی قابلِ تقلید اور قابلِ اخذ خوبیاں تھیں۔ وہاں اس میں دو تین بڑے عیب بھی تھے۔ جنہوں نے اِس کتاب کی قدر و قیمت بہت گھٹا دی ہے۔ بدایونی کا سب سے بڑا عیب تنگ خیالی اور سنگدلی ہے۔ اس کی کتاب میں سینکڑوں نہیں ہزاروں انسانوں کا ذکر ہے۔ لیکن کوئی ہی قسمت کا دھنی ہوگا۔ جو اُس کی تیغِ زبان کا گھائل نہ ہُوا ہو۔ ہنود اور شیعوں کی تضحیک و تذلیل کو تو وہ شاید فریضۂ مذہبی سمجھتا تھا۔ اور اس کی بجا آوری میں نہ انصاف کا خیال رکھتا۔ نہ تہذیب و اخلاق کا۔ بیربل کا ذکر آتا ہے۔ تو لفظ "حرامزادہ" لکھ کر اپنی خوش اخلاقی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ بیربل کی نسبت تو شائد کہا جائے۔ کہ اُسے اکبر کی بدمذہبی میں دخل تھا۔ اور مُلّا صاحب اُس سے بجا ناراض تھے لیکن ٹوڈرمل کو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۵)

شاہزادہ دانیال کی نسبت اس کا بیان ہے۔ کہ اکبر نے اسے پرتگیزی پادریوں کے پاس مسیحیت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ پرتگیز پادریوں کی کتابیں چھپی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاہزادہ ان کے پاس پرتگیزی زبان سیکھنے کے لئے آیا تھا۔

تو اکبر کے مذہبی عقائد سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی اور راجہ بھگوانداس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"در ۹۹۸ھ ثمان و تسعین و تسعماۃ راجہ تودرمل و راجہ بھگوانداس امیرالامرا کہ در لاہور ماندہ بودند بمستقر جحیم و سقر شتافتہ در درک اسفل طعمہ حیات و عقارب گشتند۔ سقر ہما اللہ نگفتا، تودر و بھگوان مردند تاریخ یافتند"۔

مشرقی اخلاق کا ایک مسلمہ اصول[1] ہے۔ کہ مُردوں کا ذکر، چونکہ وہ تنقید و اعتراضات کا جواب دینے سے عاجز ہوتے ہیں۔ خاص طور پر خوش اخلاقی اور شرافت سے کرنا چاہیئے۔ لیکن بدایونی کے سب سے زہریلے نشتر ان لوگوں پر چلے ہیں، جو سوء قسمت سے اُس کی زندگی میں وفات پا گئے، ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اکبری عہد کی مذہبی اختراعات بدایونی کو سخت ناپسند تھیں۔ اور ان کی ترویج میں ابوالفضل اور فیضی کے نام آتے ہیں۔ ابوالفضل تو اکبر کا خلیفۂ اعظم تھا۔ اور نئے مریدوں کی تعلیم و تلقین اس کے سپرد تھی۔ قرین قیاس ہے کہ بدایونی کو اُس سے فیضی کی بہ نسبت زیادہ شکایت ہوگی۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ منتخب التواریخ کی تدوین کے وقت زندہ تھا۔ اور فیضی مر چکا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے ابوالفضل پر تو فقط ایک آدھ جگہ اور وہ بھی رُک رُک کر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن فیضی کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے خلاف اس طرح زہر اُگلا ہے۔ کہ خوش اخلاقی "الامان" کہتی ہے۔ اور تہذیب کانوں میں اُنگلیاں ڈال لیتی ہے۔ صرف

---

[1] اور یہ فقط مشرق تک محدود نہیں ہے۔ مغرب میں بھی کہتے ہیں *Nil Nisi Bonum* یعنی مُردوں کی صرف نیکیاں بیان کرو۔

ایک شعر سے بدایونی کے اندازِ تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

فیضیٔ بیدیں چو مُرد، سالِ وفاتش فصیح
گفت سگے از جہاں، رفت بحالِ قبیح

یہی طریقہ اُس کا اپنے زمانے کے دوسرے مشاہیر کے متعلق تھا۔ اور جس کثرت اور بے دردی سے مذمت آمیز تاریخیں بدایونی نے معاصرین کے مرنے کے بعد اُن کی وفات کا سن دیتے ہوئے اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ اسکی مثال کہیں نہیں ملتی۔ راجہ ٹوڈر مل اور امیر الامرا بھگوانداس کی وفات پر جو تاریخیں اس نے درجِ کتاب کی ہیں۔ ان کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ٹوڈر مل کی وفات پر اس نے ایک رباعی بھی درج کی تھی ؎

تودر مل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم
چوں رفت سوئے دوزخ خلقے شدند خرم
تاریخِ رفتنش را از پیرِ عقل جستم
خوش گفت پیرِ داناوے رفت در جہنم

اسی طرح کشمیر کے دیوان، قاضی علی بغدادی کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے۔ "موذی مُرد"۔ عرفی کی وفات کی تاریخ ہے "دُشمنِ خُدا"۔ شیخ ابراہیم چشتی کے مرنے کی تاریخ ہے۔ "ذمیم الاوصاف" اور "شیخ لئیم"

مُلا صاحب خوش تو کسی سے نہ تھے۔ لیکن جو نظرِ عنائت ان کی شیعوں کے حال پر تھی۔ وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ مُلا محمد یزدی عہدِ اکبر کے ایک مشہور عالم گزرے ہیں۔ جنہوں نے اکبر کی بدمذہبی پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ دیا۔ اور اس حق گوئی کی پاداش میں دولتِ شہادت پائی۔ چاہیئے تو تھا۔ کہ بدایونی جو اکبر کے مذہبی خیالات سے اتنا متنفر تھا۔ اُن کا احترام کرتا۔ اور

سمجھتا۔ کہ دربار میں جاکر بادشاہ کی طریقے طریقے سے خوشامد کرتے، اور گھر آکر اس کے خلاف چھپ چھپ کر منتخب التواریخ میں زہر اگلنے کے بجائے، صحیح اسلامی اور مردانہ طریقہ یہی ہے۔ کہ بادشاہ کو مُلّا محمد یزدی کی طرح علے الاعلان اس کی غلطیوں سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن مُلّا یزدیؒ شیعہ تھے۔ وہ اسلام کی حمایت میں بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ کریں۔ ان کا شیعہ ہونا ہی اتنا بڑا گناہ تھا۔ کہ اس کی تلافی خونِ شہادت کے چھینٹوں سے بھی نہ ہوئی۔ بدایونی نے ایک لفظ ان کی تعریف میں نہیں کہا۔ بلکہ ایک جگہ لکھا ہے۔ "مُلّا محمد یزدی کہ اورا یزیدی میگفتند" حالانکہ مُلّا صاحب کو معلوم ہوگا۔ کہ ایک شیعہ کے لیئے سب سے بڑی گالی یہ ہے۔ کہ اُسے امام حسین علیہ السلام کے جانی دشمن، اور شیعوں کے نزدیک بدترین انسان یزید سے نسبت دی جائے۔ شیعوں کی خوبیوں سے جس طرح ملا صاحب آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ بلکہ ان کی خوبیوں کو بھی بُرائیوں کے رنگ میں ظاہر کرتے کرتے تھے۔ اُس کی نمایاں مثال میر فتح اللہ شیرازی کے حال میں ملتی ہے۔ میر فتح اللہ غالباً عہدِ اکبری کے سب سے بڑے معلّم اور فاضل تھے دوست دشمن ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اسلامی ہندوستان میں معقولات کو پہلی مرتبہ انہیں نے فروغ دیا۔ وہ نہ صرف بقول مُلّا صاحب "الٰہیات و ریاضیات وطبعیات وسائر اقسام عقلی و نقلی وطلسمات و نیرنجات و جر اثقال" میں بے نظیر تھے۔ بلکہ فرائض مذہبی کے بھی پورے پابند تھے۔ اور بادشاہ کے عین دیوانِ خاص میں (جہاں مُلّا صاحب اور اسلام کے

دوسرے ترجمان تو شائد خدا اور رسول کا نام لینے بھی ڈرتے تھے) علی الاعلان نماز پڑھا کرتے تھے ۔ چاہئے تو تھا ۔ کہ ملا صاحب اس مذہبی حمیت کی قدر کرتے ۔ لیکن میر صاحب شیعہ تھے ! بدایونی نے اس واقعہ کو اپنی تاریخ میں درج کیا ہے ۔ لیکن اس طرح کہ مدح سے زیادہ ذم کا پہلو نمایاں ہے ۔ اور لکھا ہے ۔ کہ میر صاحب اتنے متعصب شیعہ تھے ۔ اور اپنے طریقے کا اتنا خیال رکھتے تھے ۔ کہ بادشاہ کے دیوان خانہ خاص میں جہاں دوسروں کے پر جلتے تھے ، وہ علانیہ طور پر شیعہ طریقے سے نماز پڑھتے تھے :-

"باکمال حب دجاہ دنیاداری و امراپرستی دقیقہ از دقائق تعصب در دین فرونگذاشت ۔ و درعین دیوان خانہ خاص ، کہ ہیچکس یارائے آں نداشت ، کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند ۔ نماز بفراغ بال و جمعیت خاطر بمذہب امامیہ میگذارد"

ملا محمد یزدی اور شاہ فتح اللہ شیرازی کے ساتھ ملا صاحب نے جو انصاف پسندی روا رکھی ہے ۔ اس کی مثالیں تو اس زمانے کے دوسرے مورخین میں بھی مل جائیں ۔ لیکن جو گندگی انہوں نے شیعہ مورخ ملا احمد کے حالات میں اچھالی ہے ۔ اس کا جواب کسی مہذب تاریخ میں نہیں ملے گا ۔ ملا احمد عہد اکبری میں کے ایک شیعہ تھے ۔ اور تاریخ الفی کی تالیف میں ملا صاحب کے شریک ، بلکہ شریک غالب تھے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ عقائد کے بارے میں متعصب تھے ۔ اور علانیہ صحابہ کرام کی مذمت کیا کرتے تھے ۔ اسی سے متاثر ہو کر ایک رات میرزا فولاد بیگ برلاس ان کے مکان پر گیا ۔

بہانے سے انہیں باہر بُلایا۔ اور جب وہ باہر آگئے۔ تو انہیں ہلاک کر دیا۔ مقتول زخموں سے جانبر نہ ہُوا۔ اور قاتل کو اکبر نے سزائے موت دی۔ اس واقعہ کو مُلا صاحب کی زبانی سُنئیے۔ اور ان کے تاثراتِ باطنی کا اندازہ لگائیے۔ صفر ۹۹۶ھ کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"دریں ماہ میرزا فولاد بیگ برلاس نیم شبے ملا احمد رافضی را کہ سبِ صحابہ علانیہ میکرد۔ بہ بہانہ از خانہ برآوردہ کُشت۔ و تاریخ آں زہے خنجرِ فولاد یافتہ شد و دیگرے خوک سقری گفت۔ اما الحق آں سگ زبانے کہ نزع داشت۔ فقیر روئے او را بعینہٖ چوں روئے خوک دید۔ و دیگراں نیز ہمچنیں میدیدند نعوذ باللہ من شرور انفسہا، میرزا فولاد را بپائے فیل بستہ در شہر لاہور گردانیدند۔ تا بدرجۂ شہادت سید ..... مقتول بعد از قاتل بسہ چہار روز بمقرِ اصلی شتافت وشیعیان در وقتِ غسل بنا بر قاعدۂ مذہبِ خویش، میگویند کہ میخے در مقعد او کردہ درمیانِ دریا ہا غوطہ ہا دادند۔ و بعد از دفنِ او شیخ فیضی و شیخ ابو الفضل بر قبرش محافظان گماشتند۔ و باوجود آں سالے کہ بسیرِ کشمیر رفتند۔ اہلِ لاہور شبے جثۂ کثیفِ او را برآوردہ سوختند۔"

مولینا آزاد دہلوی، جنہوں نے عہدِ اکبری کے واقعات کو اپنی کتاب میں بڑے سلیقے سے سجایا ہے۔ بدایونی کے اس اندراج کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"دل چاہتا تھا۔ کہ جیسے مُلا صاحب پاک نویس مورخ ہیں۔ ویسا ہی اُن کا آئینۂ دل بھی داغِ تعصب سے پاک نظر آئے۔ مگر افسوس کہ اُنہوں نے

مُلّا احمد مظلوم کے باب میں جو فحش و فضیحت کی نجاست اچھالی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ قلمِ تحریر مارے شرم کے سر نہیں اُٹھاتا۔ اور مجھے قانونِ تہذیب اجازت نہیں دیتا۔ کہ دامنِ ورق کو اس کی نقل سے نجس کروں۔ مَیں شیعہ بھائیوں کی بدزبانی پر خونِ جگر کھاتا تھا۔ اِس سُنّی بھائی نے دل جلا کر خاک کر دیا۔"

ہم نے اس معاملے میں مولانا آزاد کی پیروی ضروری نہیں سمجھی۔ اور بدایونی کی تحریر کا اُردو ترجمہ نہیں۔ لیکن اصل فارسی عبارت درج کر دی ہے۔ اس عبارت کی فحاشی اور بدزبانی ضرور افسوسناک ہے۔ اور اسے درج کرتے وقت ہمیں دُکھ ہُوا ہے۔ لیکن عہدِ اکبری کی تاریخ میں بدایونی کا خاص مرتبہ ہے۔ کئی ایسے واقعات ہیں۔ جن کا وہ واحد راوی ہے یہ اس کے ساحرانہ قلم کا ہی اعجاز ہے۔ کہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا دور جس میں اسلامی حکومت کی بُنیادیں پہلی دفعہ مُستحکم طریقے پر رکھی گئیں۔ اور اسلامی علم وفضل، اور ادبیات کی ترقی کے راستے کھلے۔ وہ اب عام مُسلمانوں کے نزدیک کفر والحاد کا دَور سمجھا جانے لگا ہے۔ اس لئے اس اَمر کی ضرورت ہے۔ کہ بدایونی کی خوبیوں اور خامیوں کا پُورا جائزہ لیا جائے۔ تاکہ یہ فیصلہ ہو سکے۔ کہ وہ کس قسم کا انسان تھا۔ اور اسے کن باتوں میں اور کس حد تک معتبر راوی سمجھا جا سکتا ہے!

نواب مرتضیٰ خاں شیخ فریدؒ

گماں مبر کہ بہ یک شیوہ عشق مے بازند
قبا بدوش گل و لالہ بے جنوں چاک است

اکبر کے آخری ایام اور جہانگیر کی تخت نشینی کے سلسلے میں شیخ فریدؒ کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن انہوں نے اتنے اہم کام سرانجام دئے۔ کہ ان کے حالات تفصیل سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ اس زمانے کے مورخین سے اس کام میں بہت تھوڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ فرید کا ستارہ اس وقت چمکا۔ جب عہدِ اکبری کے مشہور مورخ مثلاً بدایونی، اور خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقاتِ ناصری، بلکہ ابوالفضل اور فیضی بھی وفات پا چکے تھے۔ اور عہدِ جہانگیری کے مورخین بیشتر ان کی ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے سارے کارنامے کسی نے بھی نہیں گنوائے۔ ہم کچھ حضرت مجددؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مکتوبات اور ملفوظات سے اور کچھ مآثر الامرا اور دوسری تاریخی کتب سے پھول پتی جمع کر کے اس فخرِ روزگار کے مزار پر اعتراف و عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

شیخ فرید بخاری سید تھے۔ حکومت اسلامی کے دوران میں سادات و مشائخ کی قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے آبا و اجداد کو بھی مدد معاش ملتی تھی اور اسی پر ان کا گزارہ تھا۔ شیخ کے جدِ چہارم سید عبدالغفار دہلوی کو خیال ہوا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی۔ کہ مدد معاش ترک

کر دینی چاہیئے۔ اور نوکری، سپاہگری اختیار کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اسی پر
اُن کی اولاد کا عمل رہا۔ شیخ فرید صغر سنی میں اکبر کے ملازم ہوئے۔ اور اپنی
معاملہ فہمی۔ ذہانت۔ دیانتداری۔ اور بہادری کی وجہ سے جلد ہی شہرت
حاصل کر لی۔ چنانچہ اکبر نے انہیں کئی اہم کام سرانجام دینے پر مامور کیا۔
۱۵۹۸-۹۹ء میں جب ہندوستان میں سخت قحط پڑا۔ تو لوگوں میں روپیہ
اور اشیائے ضروری تقسیم کرنے کے لئے بادشاہ نے انہیں مقرر کیا۔ اور
سرکاری مدد کے علاوہ انہوں نے اپنے پاس سے بھی غریبوں اور محتاجوں
کی بے انتہا مدد کی۔ اس کے بعد جب ۱۶۰۰ء میں اسیر گڑھ کے معرکے کے
وقت حاکمِ خاندیش سے اکبر کے نمایندوں کی گفت و شنید ہو لی تھی۔ تو شیخ فرید
نے ہی اس موقع پر شہنشاہ کی نمائندگی کی۔ شیخ فرید کا منصب بہت بڑا نہ
تھا۔ (اکبر کے چالیسویں سال جلوس میں وہ ابھی ڈیڑھ ہزاری تھے) لیکن
چونکہ دیانتداری اور کارگزاری مسلّمہ تھی۔ اس لئے انہیں اکثر ذمہ داری کے
کام سونپے جاتے۔ جب انہیں میر بخشی بنایا گیا۔ تو ان کا اثر اور اقتدار اور بھی
بڑھ گیا۔ بلکہ دیوان کے بھی کئی اختیارات ان کے متعلق ہو گئے۔ (اقبال نامۂ
جہانگیری) اس کے علاوہ اکبر ان کا بڑا پاس کرتا تھا۔ بلکہ بعض قرائن سے
خیال ہوتا ہے۔ کہ اکبر کے آخری ایام میں شیخ فرید سے زیادہ معتمد منصب دار
دار الخلافہ میں کوئی نہ تھا۔ اور کئی اہم موقعوں پر انہیں پیچیدہ معاملات ہاتھ میں
لینے پڑے۔ اکبر نامہ کے تتمہ میں جو ابوالفضل کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ درج
ہے۔ کہ جب ابوالفضل کے قتل کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی۔ تو کسی کو ہمت نہ

پڑتی تھی۔ کہ بادشاہ سے جاکر حقیقت حال کہے۔ اور شیخ فرید کو یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا۔ اسی طرح جب اکبر کے مرضِ موت میں حکیم علی گیلانی کے معالجے سے بادشاہ اور تمام بیگمات ناراض تھیں۔ بلکہ جہانگیر بھی کہتا تھا۔ کہ میرے باپ کو حکیم علی نے غلط علاج سے ہلاک کر دیا۔ تو حکیم نے شیخ فرید کے گھر جاکر پناہ لی۔ اکبر نامہ کا تتمہ نگار شیخ کے اس فعل کی شکایت کرتا ہے۔ کہ انہوں نے کیوں حکیم علی کو امان دی۔ لیکن شیخ کے اثر و رسوخ کا اس بات سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمام بیگمات اور نئے بادشاہ کے غیض و غضب کے باوجود انہوں نے حکیم کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا!

عہدِ جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا۔ اور وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیانِ سلطنت سے بازی لے گئے۔ (اعتبار و رتبہ او از اقران و امثال بلکہ جمیع اعیان و ارکانِ سلطنت بر گذشت) اس کے باعث ان کے دو اہم کام تھے۔ جو انہوں نے بڑی خوبی سے سرانجام دیئے۔ ایک تو جہانگیر کی تخت نشینی کا اہتمام۔ جس سے خوش ہوکر جہانگیر نے "صاحب سیف و قلم" کا خطاب دیا۔ اور ایک ہی جست میں ان کا منصب ڈیڑھ ہزاری سے بڑھاکر پانچ ہزاری کر دیا۔ دوسرا اہم کام خسرو کی شکست تھا۔ جس کی تعریف کرنے کے لئے بادشاہ خود شیخ کے خیمے میں گیا۔ اس سے بغل گیر ہوا۔ جس جگہ (بھیروں وال میں) یہ واقعہ ہوا تھا۔ اس کا نام شیخ کی درخواست پر فتح آباد رکھا۔ اور شیخ کو نواب مرتضےٰ خاں کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ واقعہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں ہوا۔ اس کے چار سال بعد

شیخ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اور اسی عہدے پر انہوں نے ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں وفات پائی۔ بادشاہ نے انہیں قلعہ کانگڑہ کی فتح پر مامور کیا ہوا تھا۔ کہ پٹھانکوٹ میں انہیں موت کا بلاوا آن پہنچا۔ حسب وصیت نعش کو دہلی میں لاکر ان کے بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

شیخ فریدؒ اسلامی ہندوستان کے اُن مایۂ ناز امرا میں سے ہیں۔ جنہوں نے امیری کے بھیس میں فقیری کی ہے۔ اور مذہبِ حقہ کے لئے استحکام میں فقرا و مشائخ سے بھی زیادہ مدد دی ہے۔ یُوں تو الشرع تحت سیف کے مطابق چونکہ قانونِ شرع کی ترویج ظاہری حکومت کے استحکام پر منحصر ہے اس لئے جو کوئی اسلامی حکومت کے استحکام میں مدد دیتا ہے۔ اسلام کی خدمت کرتا ہے۔ لیکن جو کوئی اس سے بڑھ کر اپنی طاقت و ہمت، خلقِ خدا کی خدمت، عدل و انصاف کی ترویج اور نیک اور صحیح طریقوں کی حمائت میں خرچ کرے۔ اس کا مرتبہ اور بھی بلند ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے نیکدل بزرگوں کی کوئی کمی نہیں۔ جنہیں خود تو لذائذ دنیوی سے نفرت تھی۔ اور اگر وہ اپنے طبعی رجحانات کی پیروی کرتے۔ تو گوشۂ عزلت سنبھالتے۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا۔ کہ خلقِ خُدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت اس سے نہیں ہو سکتی تو اُنہوں نے علائقِ دنیوی کو اختیار کیا۔ اپنے ذاتی جوہر سے اس دُنیاوی نظام میں بھی ایک بلند درجہ حاصل کیا۔ اور اپنی تمام ترقیوں اور طاقتوں کو خُدا اور خلقِ خُدا کی خدمت کے لئے وقف رکھا۔ افسوس کہ بعض صوفیہ نے اِس نُکتے کی اہمیّت نہیں سمجھی۔ کہ خلقِ خُدا کی خدمت ہی خدا کی بہترین عبادت ہے

اور رسولِ اکرمؐ کی اپنی زندگی اور صریح ارشادات (لارہبان فی الاسلام) پر بھی نظر نہیں رکھی بلکہ تمام دُنیاداروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا چاہا ہے لیکن ان میں سے جو دیدہ ور بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ نعمت متعدی نعمتِ لازم سے کہیں بہتر ہے۔ حضرت مجدّد نے کئی خطوط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ جو کام ایک صاحبِ سطوت انسان سے ہو سکتا ہے۔ وہ فقرا و مشائخ سے بآسانی ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ نواب خان جہاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہی خدمت جو اب آپ کر رہے ہیں۔ اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کر لیں۔ تو گویا انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کام کریں گے۔ جس سے دین منوّر و معمور ہو جائے گا۔ ہم فقیر اگر سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کریں۔ تو بھی آپ جیسے بہادروں کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے"

ایک اور خط میں ان لوگوں کی خوش قسمتی کی تعریف کی ہے۔ جو خلقِ خدا کی خدمت کر سکیں۔ اور خلقِ خدا کی خدمت کی ترغیب دی ہے خواجہ ابُو المکارم[1] کو لکھتے ہیں:۔

"یہ کس قدر اعلےٰ دولت ہے۔ کہ عطیات کا بخشنے والا حضرت حق جلشانہٗ اپنے کسی بندہ کو بعض بزرگیوں اور فضیلتوں کے ساتھ مخصوص کر کے اپنے بندوں کی حاجتوں کی کنجی اس کے دستِ تصرّف کے حوالے کر دے۔ اور اُس کو ان لوگوں کا ملجاو ماوےٰ بنادے۔ اور یہ کس قدر اعلےٰ نعمت ہے۔ کہ بہت سی مخلوقات کہ جس کو اللہ تعالےٰ نے کمال کرم سے اپنا عیال فرمایا ہے۔ اُسکے متعلق کرے۔ اور ان کی تربیت اُس کے سپرد فرمائے۔ وہ شخص بہت ہی

---

[1] شیخ مُبارک کے بیٹے اور ابوالفضل و فیضی کے بھائی تھے؂

سعادتمند ہے۔ جو اس دولت کی حمد میں قیام کرے۔ اور وہ شخص بہت ہی ہوشمند ہے۔ جو اس نعمت کا شکر ادا کرے۔ اور اپنے مالک کے عیال کی خدمتگذاری کو اپنی سعادت جانے۔ اور اپنے مولٰے کے غلاموں اور لونڈیوں کی تربیت کو اپنا شرف سمجھے"۔

شیخ فرید کے نیک کاموں کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ حضرت مجدد ایک خط میں ان کی تعمیر مسجد کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں:۔

"ایک درویش لاہور کی طرف سے آیا ہُوا تھا اس نے بیان کیا۔ کہ شیخ جیو پرانی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اور میاں رفیع الدین نے آپ کی التفات کے اظہار کے بعد کہا کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی تھی (یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نواب شیخ فرید لاہور کے گورنر تھے) الحمد اللہ علےٰ ذالک۔ حق تعالےٰ آپ کو زیادہ توفیق عنائت فرمائے۔ مخلصوں اور یاروں کی اس قسم کی باتیں سُنکر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے"۔

شاہ ولی اللہؒ نے انفاس العارفین میں ایک ضیافت کا ذکر کیا ہے۔ جو نواب شیخ نے کسی رفاہ عام کی عمارت بنانے کے سلسلے میں منعقد کی تھی۔ اور جس میں شہر کے سارے مشائخ کو دعوت دی تھی:۔

"شیخ فرید بخاری کہ از اعاظمِ امرائے آں زماں بود و جامع بود درمیانِ نجابت وصلاح واعتقادِ مشائخِ صوفیہ، عمارتے تعمیر داد کار وانسرائے مشہور یادگیرے"۔

ماثر الامرا میں ان کی داد و دہش کی داستان تفصیل سے لکھی ہے جسے دیکھکر

خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید اسلامی ہندوستان کی ساری تاریخ میں اس پایہ کا سخی اور عالی حوصلہ امیر کوئی نہیں ہوا۔[1] نواب شاہنواز خاں لکھتے ہیں:-

"شیخ ظاہر و باطن آراستہ داشت۔ شجاعت را با سخاوت جمع نمودہ۔ بخشش علم او در فیض بروے خلق باز کردہ۔ ہر کہ باو رسیدے۔ چہرۂ ناکامی در آئینۂ خیال ندیدے"۔

آگے چل کر ان کی فیاضی کی تفصیلات دی ہیں۔ لکھا ہے۔ کہ وہ دربار تک پہنچنے تک قبا اور کمبل اور چادر اور پا افزار راستے کے درویشوں میں تقسیم کرتے اور اشرفیوں اور روپوں کی ریزگاری اپنے ہاتھ سے خیرات کرتے۔ ایک دفعہ ایک درویش نے سات مرتبہ آن کر اُن سے خیرات لی۔ آٹھویں بار پھر آیا۔ اس وقت شیخ نے آہستہ اُس سے کہا۔ کہ سات دفعہ جو کچھ لے گئے ہو۔ اُسے چھپا کر رکھنا۔ کہیں دوسرے درویش تم سے چھین نہ لیں۔ شیخ نے بیواؤں اور اہلِ خانقاہ اور اربابِ توکّل و احتیاج میں سے کسی کا سالیانہ مقرر کیا ہوا تھا۔ جو، خواہ وہ حاضر ہوں یا یا غیر حاضر، انہیں باقاعدہ پہنچتا رہتا تھا۔ جو لوگ ان کی ملازمت میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے بچوں کے لئے شیخ نے مناسب ماہانہ مقرر کر رکھا تھا۔ اور اُستاد مقرر کر کے ان کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بچے شیخ کی گودی میں اس طرح

---

[1] اقبالنامۂ جہانگیری میں شیخ کی نسبت لکھا ہے۔۔۔۔"اگرچہ اسمِ بخشی داشت۔ لیکن بخشیٔ بود وزیر نشان۔ و چند سال دفتر تن را، کہ لازمۂ خدمت دیوانی است۔ از بے رشدیٔ دیوان بجانبِ خود کشیدہ، محالِ جاگیر را بار بابِ طلب تنخواہ مے نمود۔ ظاہر و باطن شیخ بغایت آراستہ و سنجیدہ بود۔ بزرگی و دولت از و قدر و شرف داشت۔ نہ او از بزرگی و دولت۔ شجاعت را بہ سخاوت فراہم آوردہ خیر بالذات بود"۔

کھیلتے۔ کہ گویا ان کے اپنے بچے ہیں۔ گجرات میں اُنہوں نے سادات کی فہرست بنا کر ان کے بچوں کے لیئے شادی کے اخراجات اپنی سرکار سے مقرر کئے تھے لیکن شیخ بھاٹوں اور میراثیوں کو جو امرا کی تعریف میں کبت پڑھ کر اُن سے روپیہ بٹورتے ہیں۔ کچھ نہ دیتے۔ اُنہوں نے کئی مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ احمد آباد میں بخارا نام کا ایک محلہ تعمیر کیا۔ شاہ وجیہہ الدین کا روضہ اور مسجد بھی انہی کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ دہلی میں فرید آباد اور اس کی عمارتیں اور تالاب شیخ کی یادگار ہیں۔ (حضرت سُلطان المشائخ کے مزار پر اُنہوں نے صندل کا چھپر کھٹ بنوایا تھا۔ اور اس پر سیپ کی جڑ کاری کرائی تھی) لاہور میں بھی ایک محلہ اُنہوں نے بنوایا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے سے جہانگیر کے زمانے تک شیخ حویلی کے اندر نہیں گئے۔ بلکہ مکان کے باہر ہی رہتے۔ سپاہ کی تنخواہ اپنے رُوبرو تقسیم کرواتے۔ ہر روز ایک ہزار آدمی کو ان کی سرکار سے کھانا ملتا۔ پانسو کا کھانا تو ان کے گھر پر بھجوایا جاتا۔ اور پانسو کے ساتھ شیخ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لوگ کتنا بھی شور مچاتے۔ لیکن شیخ کی پیشانی پر شکن نہ آتا۔

نواب شاہنواز مصنف مآثر الامرا نے بڑے بڑے امرا دیکھے تھے۔ وہ خود نظام الملک آصف جاہ کے زمانے میں برار کے دیوان اور پھر نواب ناصر جنگ کے وزیر رہ چکے تھے۔ سادات بارہہ اور دوسرے عظیم الشان امرا کی فیاضیوں سے واقف تھے۔ لیکن وہ افسوس کرتے ہیں۔ کہ شیخ فرید کے پائے کا انسان اس زمانے میں نہیں ملتا۔ وہ شیخ کا ذکر کر کے کہتے ہیں۔ کہ وہی دن ہے اور وہی رات اور وہی ستاروں کی گردش، لیکن مُلک اِس قسم کے انسانوں سے خالی ہو گیا ہے۔

شاید وہ لوگ کہیں دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ "سبحان اللہ! اگرچہ ہماں تقلب لیل و نہار است وسیر کواکب و دورِ سپہر لیکن دریں جزوِ زماں ایں ولائت ازیں مردم خالی است۔ شائد کہ بحصۂ دیگر مملکتے رفتہ اند" نواب شیخ فرید فوت ہوئے۔ توان کی تاریخ ہوئی۔ داد۔ خورد۔ بُرد یعنی اس نے لوگوں میں اپنا مال وزر تقسیم کردیا۔ خود خرچ کیا۔ اور دارین کی سعادتیں ساتھ لے گیا۔ جب اُن کی وفات کے بعد اس امیر کبیر کا اثاثہ گنا جانے لگا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ چونکہ اس حاتمِ ثانی نے اپنی زندگی میں ہی اپنا سب کچھ لوگوں کی حاجت روائی میں خرچ کردیا ہے۔ اثاثہ میں ایک ہزار اشرفی کے سوا کچھ نہیں!

عدیم النظیر فیاضی اور خدماتِ مُلکی کے علاوہ شیخ فرید کا بڑا کام طریقۂ نقشبندیہ کی حمائت اور سرپرستی ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کا صحیح آغاز حضرت مجدد الف ثانی کے مُرشد حضرت خواجہ محمدؒ باقی نے کیا۔ جو اپنی وفات سے دو تین سال پہلے دہلی تشریف لائے تھے۔ اس قلیل مدت میں ان کا سلسلہ بڑا وسیع نہ ہوتا۔ لیکن شیخ فرید نے ان کی اور ان کے سلسلے والوں کی کمال خدمت کی۔ خانقاہ کے اخراجات اپنے ذمے لئے۔ اور درویشوں اور دوسرے متعلقین کے لئے معقول وظیفے مقرر کردیئے۔ تاکہ وہ بے فکری سے اللہ اللہ کریں۔ اور ارشاد و ہدائت میں مشغول رہیں۔ شیخ فریدؒ اور حضرت خواجہؒ کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے۔ کہ حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ہی نکتہ چین کہتے تھے۔ کہ حضرت خواجہؒ کی کامیابی شیخ فرید کی وجہ سے ہے۔ یہ اعتراض کسی نے حضرت خواجہؒ تک بھی پہنچایا۔ لیکن آپ شیخ فرید کی عظمت وفضیلت سے واقف تھے۔ آپنے اس پر

کوئی دھیان نہ دیا۔ بلکہ شیخ فرید کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کے ملفوظات میں لکھا ہے :۔

"ایک عزیز نے حضور کی خدمتِ اقدس میں بیان کیا۔ کہ بعض کوتاہ بیں سیاہ دِل کہتے ہیں۔ کہ حضور کی مشیخت کا مدار (یگانۂ زمانہ، مرجعِ خلق) نواب قدس القاب شیخ فرید سلمہ اللہ تعالےٰ کی دوستی پر ہے۔ اور ہمیشہ رقعات میں جو شیخ کی طرف لکھتے ہیں۔ ان کا سرنامہ قبلہ گاہی سلامت باشند تحریر فرماتے ہیں۔ فقرا سے اس قسم کی خوشامد اچھی نہیں۔ حضور نے اس کے جواب میں فرمایا۔ کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں۔ اور ان کے وجود کی برکت سے ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔ اب بھی ہمیں کوئی ایسی وجہ شرعی معلوم نہیں ہوتی۔ جس کے باعث شیخ موصوف سے دوستی کا تعلق قطع کرلیں۔"

حضرت مجدد الف ثانی بھی ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں۔ "حضرت قبلہ گاہی قدس سرہٗ (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ رح) فرمایا کرتے تھے۔ کہ شیخ جیو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمعیت کا باعث آپ ہی ہیں"۔ یہ مکتوب حضرت مجدد نے شیخ موصوف کو مرشد کی وفات پر لکھا تھا۔ اس میں حضرت خواجہ کی وفات پر اظہار افسوس کر کے لکھتے ہیں :۔

"لیکن اللہ تعالےٰ کی حمد اور احسان ہے۔ کہ اس ہولناک حادثہ اور وحشتناک واقعہ کے باوجود ان بے سروسامان فقرا کا مربّی اور مددگار بھی دین و دُنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلبیت سے مقرّر ہُوا ہے۔ (شیخ فرید کی سیادت کی طرف اشارہ ہے) جو اس سلسلۂ علیہ کے انتظام

اور نسبتِ نقشبندیہ کی جمعیت کا وسیلہ ہے۔

ہاں یہ نسبت عُلیہ بھی، جو اس مُلک میں بہت غریب ہے۔ اور اس نسبت والے لوگ ان مُلکوں میں بہت تھوڑے ہیں۔ چونکہ اہلبیت کی نسبت کی طرح ہے۔ تو اس کا مربّی بھی اہلبیت ہی سے ہونا مناسب ہے اور اسکی تقویت کے لئے بھی انہی نسبت والوں سے ہونا بہتر ہے۔ تاکہ اس بڑی دولت کی تکمیل غیروں کے حوالے نہ کی جائے جس طرح اُس بڑی نعمت کا شکر فقرا پر واجب ہے۔ اسی طرح اس دولت کا شکر بھی ان کے ذمے لازم ہے۔ انسان جس طرح باطنی جمعیت کا محتاج ہے۔ اسی طرح ظاہری جمعیت کی بھی اس کو احتیاج ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں شک نہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کی توفیق سے ان فقرا کی ظاہری جمعیت کے ضامن اور کفیل آپ ہی ہیں "

ایک اور خط میں حضرت مجددؒ لکھتے ہیں :۔

"ہر کسے کہ شکر آدمی بجا نیارد شکر خدائے عزوجل بجا نیارد۔ پس بر ما فقیراں ذکرِ احسانِ شما لازم است۔ اولاً سبب جمعیّتِ خاطر حضرتِ خواجہ ما (حضرت خواجہ باقی باللہ) شما بودہ اید۔ بطفیل شما دراں جمعیت طلبِ حق سبحانہٗ و تعالےٰ کردیم و حظہائے وافر بُردیم۔ و ثانیاً چوں بحکم کُبّرت و بموت الکبراء نوبت بایں طبقہ رسید۔ واسطۂ اجتماع فقرا و باعثِ انتظام طالبان نیز شمائید۔ جزاکم اللہ

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے
یک شُکرِ تو از ہزار نتواں کرد"

حضرت خواجہ باقی باللہ بیرنگ قدس سرہ

ہم اس سوانگ کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو دینِ الٰہی کے نام سے اکبر کے دربار میں کھیلا جا رہا تھا۔ یہ تماشہ اکبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لیکن ابھی ان بزرگوں کا ذکر باقی ہے۔ جن کی کوششوں سے نہ صرف عہدِ اکبری کی مذہبی بدعنوانیوں کی بلکہ عام صوفیوں کی بے قاعدگی کی اصلاح ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ ان بزرگوں کا سرچشمۂ فیض "بخارا اور سمرقند" کی وہی مقدس سرزمین ہے۔ جہاں سے اکبر کے آباو اجداد آئے تھے۔ اور مغلیہ سلطنت کے بانی "بابر" کو اس سلسلے سے بڑی عقیدت رہی ہے۔

اس سلسلے کے بانی حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ تھے۔ جو بخارا کے قریب ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ع) میں پیدا ہوئے۔ اور ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ع) میں وفات پا گئے۔ انہوں نے طریقۂ خواجگاں میں جو ان سے پہلے ترکستان میں رائج تھا۔ اصلاح و اضافہ کیا۔ اور طریقۂ نقشبندیہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ شرعی احکام کی تعمیل پر بڑا زور دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ خوارق و کرامات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ کام کی بات تو سنت کی پیروی اور اس پر استقلال ہے۔ آپ کے بعد طریقۂ نقشبندیہ ترکستان میں مقبول ہوا۔ اور خواجہ عبیداللہ احرارؒ نے اسے بڑا فروغ

دیا۔ ان کے مریدوں میں مشہور شاعر جامی اور انوارِ سہیلی کے مصنف ملا حسین واعظ کاشفی تھے۔ لیکن حضرت خواجہ نے فقط اہلِ علم کو ہی مسخر نہ کیا۔ بلکہ اپنے زمانے کے فرمانرواؤں مثلاً عمر شیخ مرزا پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ عام طور پر اہلِ تصوف اربابِ اقتدار سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ لیکن خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے تھے۔ کہ بادشاہ کی حیثیت ملک میں مثل دل کے ہوتی ہے۔ اس کی اصلاح میں ملک کی اصلاح مضمر ہے۔ چنانچہ وہ بادشاہوں اور دوسرے امراء اکابر سے روابط قائم کر کے ان کے خیالات پر نیک اثر ڈالتے۔ اور عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتے۔ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی نے ان کا ایک ارشاد کئی مکتوبات میں نقل کیا ہے :-

"اگر ما شیخی مے کردیم۔ دریں روزگار ہیچ شیخ مرید نمے یافت۔ لیکن ما را کارِ دیگر فرمودہ اند۔ کہ مسلمانان را از شر ظلمہ نگاہداریم۔ بواسطۂ ایں بپادشاہاں بایست اختلاط کردن ونفوسِ ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسطِ ایں عمل مقصودِ مسلمین بر آوردن۔"

مغلیہ سلطنت کا بانی بابر، خواجہ عبید اللہ احرار کے خلیفہ مولانا محمد قاضی کا مرید تھا۔ اور مغلیہ سلطنت کے آغاز میں خواجہ احرارؒ کے خاندان کے بعض بزرگوں (مثلاً خواجہ عبد الشہید نقشبندیؒ) کے ہندوستان میں آنے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جس بزرگ نے اس ملک میں نقشبندی سلسلے کی مستحکم طریقے سے بنیاد رکھی۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ تھے۔ وہ خود نقشبندی تعلیمات کے متعلق فرماتے ہیں۔ "ایں تخمِ پاک را از زمین سمرقند و بخارا آوردیم

و در زمینِ برکت آئینِ ہند کیشتم۔ الحمد اللہ شجرۂ طیبہ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماءُ ظاہر شد۔"

خواجہ باقی باللہ ۵ ماہ ذی الحجہ ۹۷۱ھ ۱۲۶۳ء کو بمقام کابل پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، قاضی عبد السلام خود اہلِ علم تھے۔ اس لئے انہوں نے شروع سے آپ کی تعلیم و تدریس پر نظر رکھی۔ جب ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔ تو آپ مُلّا صادق حلوائی کی خدمت میں پہنچے۔ جو اس زمانے کے مشہور فاضل اور خوشگوار شاعر تھے۔ ان کا وطن سمرقند تھا۔ لیکن، جب وہ ۹۷۸ھ میں حج سے واپس آئے۔ تو اکبر کے چھوٹے بھائی، مرزا حکیم، نے جو کابل کا حکمران تھا۔ انہیں آمادہ کیا۔ کہ وہ کابل میں کچھ عرصہ قیام فرما کے وہاں سلسلہ تدریس شروع کریں۔ خواجہ باقی باللہ ان دنوں ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے۔ اور جب وہ کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے۔ تو خواجہ بھی ساتھ تھے۔

خواجہ صاحب نے علومِ متداول بڑی تیزی سے حاصل کرنے شروع کئے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک دفعہ جب وہ درسی کتب کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ تو ایک مجذوب نے آکر اندازِ خاص میں کہا ؎

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست!

اس کے بعد کتابوں سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ اور مرشدِ راہ نما کی تلاش شروع ہوئی۔ پہلے پہل اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائی اور ماوراء النہر اور افغانستان میں جو صوفی اور مشائخ تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیۂ نفس کی کوشش شروع کی۔ لیکن دل کا مقصود حاصل نہ ہوا۔ حضرت خواجہ کی

جو روحانی سرگزشت ان کے ملفوظات میں ملتی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ نگاہ بڑی اونچی تھی۔ اور چونکہ ابھی جوانی کا عالم تھا۔ اور طبیعت میں استقامت نہیں آئی تھی۔ اس لئے خاطر خواہ صفائے قلب اور تسکین میسر نہ آتی تھی۔ پہلے خواجہ عبیدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر گناہوں سے توبہ کی۔ لیکن اس پہ اپنے کڑے معیار کے مطابق قائم نہ رہ سکے۔ پھر حضرت افتخار شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اصلاحِ حال کی کوشش شروع کی۔ "وہ بزرگ راضی نہ تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ تم جوان ہو۔ لیکن چونکہ حضرت ایشاں کا ارادہ پکا تھا۔ اسلئے چارہ ناچار فاتحہ پڑھا۔ اور دُعا فرمائی۔ کہ خدا تعالےٰ استقامت بخشے۔ لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اور طرح طرح کی خرابیاں آپڑیں۔" اس کے بعد آپ نے امیر عبداللہ بلخیؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر از سرِ نو توبہ کی۔ اور اب طبیعت کو استقامت حاصل ہوئی۔ آئینۂ طبیعت صاف ہو گیا۔ اور مدارجِ رُوحانی میں ترقی شروع ہوئی۔ لیکن ہمت غضب کی تھی۔ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی دل نہ مانتا تھا۔ کہ کسی فیض کے سرچشمے سے محرُوم رہ جائیں ؎

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ مے چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

زبدۃ المقامات میں آپ کی نسبت لکھا ہے:-

"وتفرید ایشاں را آں پایہ بود۔ کہ از بدایت تا نہایت ہیچ یک از احوال بلند و مکاشف ارجمند بسرِ ہمت ایشاں فرود نمے آید[1]۔ درعینِ بحر یافت

---

[1] طریقۂ باقویہ [جسے شاہ ولی اللہؒ نے اپنے والد سے اخذ کیا۔ اور جس کا فیض شاہ صاحب اور ان کے جانشینوں کی بدولت دیوبند کے کئی بزرگوں کو پہنچا] اور طریقۂ مجددیہ میں ایک لطیف فرق

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

دم از نایافت زدہ خشک لب بودند ۔ ایں رباعیہ شریفہ نیز دلالت بر حالِ ایشاں مے نماید۔ رباعی

در راہِ خدا جملہ ادب باید بُود — تا جاں باقیست در طلب باید بُود
دریا دریا اگر بکامت ریزند — کم باید کرد و خشک لب باید بُود"

چنانچہ پیرانِ کامل کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں آپ ہندوستان آئے اور مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے ملفوظات میں کشمیر جاکر بابا ولی کشمیری سے فیض یاب ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ خوارزم کے رہنے والے تھے۔ ۹۹۹ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ لیکن مرزا یادگار نے سن ۱۰۰۱ھ میں انہیں زہر دلوا دیا۔ حضرت خواجہ اس دوران میں کشمیر آکر ان سے مستفید ہوئے۔ اسکے بعد آپ دہلی آئے۔ اور چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ عبد العزیز کی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ اور اُن کے صاحبزادے شیخ قطب العالم رح کی خدمت میں رہ کر یادِ حق کرنے لگے[1]۔ شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ قطب العالم پر منکشف ہوا۔ کہ حضرت خواجہ کا حصہ بخارا میں ہے۔ وہ اسی وقت باہر آئے۔ اور حضرت خواجہ سے کہا۔ کہ آپ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں۔ اسی وقت روانہ ہو جائیے۔

(بقیہ نوٹ ص ۱۰۷) اس نقطۂ نظر کا ہے۔ جو یہ بزرگ اپنے احوال اور مدارجِ روحانی کی نسبت رکھتے تھے

[1] شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں "بعد ازانکہ خواجہ محمد باقی قدس سرہ بطریقہ نقشبندیہ مشغول شدند۔ شیخ قطب العالم بسیار بخدمت مے رسید۔ و فیضِ صحبت کہ عمدہ دریں طریقہ ہماں است۔ حاصل میکرد۔ اگرچہ در مبادئے حال خواجہ باقی بخدمت شیخ تلمذ کردہ اند۔ و در خانقاہِ ایشاں مُدتے مجاورت نمودہ اند۔"

اُس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ فقط ایک ازار تھی۔ حضرت خواجہ نے اسی کو بطور دستار کے سر پہ لپیٹا۔ اور بخارا روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ خواجہ امکنگی کی خدمت میں پہنچے۔ وہ خواجہ محمدؒ درویشؒ کے جو مشائخ نقشبندیہ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں، صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ اُنہوں نے کمال محبت اور محنت سے آپ کو نقشبندی سلسلے کی تعلیم دی اور ارشاد کیا۔ کہ مملکتِ ہند کو تمہاری ضرورت ہے تم وہاں جاؤ۔ اور خلقِ خدا کو فیض یاب کرو۔

چنانچہ حضرت خواجہ نے پھر رختِ سفر باندھا سمرقند سے منزلیں طے کرتے ہوئے پہلے پشاور تشریف لائے۔ وہاں سے لاہور۔ اس شہر میں پورا ایک سال قیام کیا۔ اس کے بعد دہلی آئے۔ فیروز شاہ کے قلعہ میں قیام فرمایا۔ اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ افسوس کہ آپ کو طویل عمر نصیب نہیں ہوئی۔ دہلی میں آپ کا قیام تین چار سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور آپ ابھی اکتالیس سال کے ہی تھے۔ کہ ۲۵ رجمادی الآخرہ سنہ ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء کو رُوح مُبارک قیدِ جسم سے آزاد ہو گئی۔

حضرت خواجہ کی ہمت اور کارشناسی کی داد دینی چاہئے۔ کہ اگرچہ انہیں ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔ اور اس مدت میں طبیعت نحیف ہی رہی۔ لیکن اس قلیل عرصے میں اُنہوں نے نقشبندیہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے اس مُلک میں رکھدی۔ آپ کو خوش قسمتی سے ایک تو مرید حضرت مجدّد الفِ ثانی جیسا میسّر آیا۔ جس کے فیض سے اس سلسلے کا مُستحکم ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن ان کے علاوہ، آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا۔ جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقا کا سامان ہوا۔ بلکہ اس مُلک میں

اسلام کو تقویت ہوئی۔ اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا ازالہ شروع ہوا۔

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا اصول تھا۔ کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کے بجائے، ان سے ربط بڑھاتے۔ اور انہیں مسخر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگؒ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے۔ اور جب وہ ہندوستان تشریف لائے۔ تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ دین الٰہی اور اکبر کے دوسرے احکام نے عام مسلمانوں کو متاثر نہ کیا تھا۔ لیکن اونچے طبقوں میں، جو دربار سے قریب تھے، خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس لئے اس طبقے کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا۔ اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔ بدقسمتی سے ان کے تفصیلی حالات صحیح طور پر جمع نہیں ہوئے۔

---

[1] جب حضرت خواجہ باقی باللہ، بارِ دوم دہلی تشریف لائے۔ تو اس وقت عہدِ اکبری کے تمام مشہور مورخین مثلاً میر نظام الدین مصنف طبقاتِ اکبری۔ ملا عبدالقادر بدایونی وفات پا چکے تھے۔ اس لئے ان کے حالات کتبِ تواریخ میں پورے طور پر درج نہیں۔ خافی خاں آپکی نسبت لکھتا ہے :۔ "دیگر از واصلان، حضرت خواجہ باقی باللہ دراں عہد مقتدائے زماں بود۔ صفاتِ ذاتی وکسبی وخوارقِ ایشاں زیادہ ازاں است۔ کہ بزبانِ قلم دادہ شود۔ اکثر در انزوا گزرانندہ یا مخلوق کم ہمجوشیدند۔ و از اکثر علوم عقلی ونقلی بہرۂ تمام داشتند۔"

ان کے جو مکتوبات موجود ہیں۔ اُن میں سے اکثر کے متعلق کہا نہیں جا سکتا۔ کہ وہ کس کی طرف لکھے گئے۔ مطبوعہ نسخوں سے اتنا ہی پتہ چلتا ہے۔ کہ کسی امیر کے نام، یا کسی "مخلص کے نام" لکھے گئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتہ لگانا دشوار نہیں۔ کہ حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں عہدِ اکبری کے بڑے بڑے سردار اور اُمرا شامل تھے۔ نواب مرتضےٰ خاں، جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے سب مراحل طے ہوئے۔ حضرت خواجہ کا بڑا معتقد تھا۔

ہم حضرت خواجہ اور نواب مُرتضےٰ خاں کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن حضرت خواجہ کے تعلقات فقط نواب مُرتضےٰ خاں تک محدود نہ تھے۔ معاصرانہ تذکروں (مثلاً زُبدۃ المقامات) کا بیان ہے۔ کہ طبقۂ امرا میں ان کے کئی معتقد ("اُمرائے مخلص") تھے۔ جو انہیں زر و سیم بھیجتے رہتے۔ اور حضرت خواجہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک خاص معتقد عبدالرحیم خانخاناں تھا۔ ("بہ حضرت خواجہ عقیدت و ارادت تمام داشت") جس نے یہ سن کر کہ حضرت خواجہ کو حج پر جانے کی بڑی خواہش ہے۔ ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھجوایا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ کہ اس طرح دوسروں سے پیسے لے کر حج پر جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صدرِ جہاں بھی آپ کا عقیدت مند تھا۔ حضرت مجددؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جناب صدرِ جہاں نے ذکر و مراقبہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذکر تو بتلا دیا گیا۔ لیکن چونکہ اس گروہ کا خاص مراقبہ درس اور بیان کی قسم سے نہیں ہے اور ان کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اس لئے یہی مناسب دیکھا گیا۔ کہ آپ کی

خدمت میں اس کی صحت کرے ..... اب فقیر پر ضعف بہت غالب ہے
صحبت کی فرصت اور توجہ کی طاقت نہیں رہی "

ایک اور خط (رقعہ ۲۴) میں شائد مرزا کوکہ (خانِ اعظم) کی طرف اشارہ ہے۔ مطبوعہ مکتوبات میں ایسے رقعے کئی ہیں۔ جن کے متعلق لکھا ہے۔ "ایک امیر کی طرف لکھا" "ایک عالیشان امیر کی طرف لکھا"۔ بعض میں حاجتمندوں کی سفارشیں ہیں۔ بعض میں فقط ارشاد و ہدائت۔ ان کا ایک دلچسپ رقعہ ہے "ایک دوست کے نام" اس کے نصف اوّل سے (جسے حضرت مجدد کے تمام معتقد نقل کرتے ہیں۔) ایک تو حضرتِ مجدد کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے اُس مردِ دیدہ ور کی فہم و فراست سے واقفیت ہوتی ہے۔ جس کی نگاہِ دُوربین نے اپنے مرید کی آیندہ عظمت کا صحیح اندازہ لگا لیا۔ نصفِ ثانی سے (جسے حضرت مجدد کے تمام معتقدین نظر انداز کر دیتے ہیں!) خواجہ صاحب کی اس کوشش کا پتہ لگتا ہے۔ جو وہ اپنے مریدوں مثلاً حضرت مجدد کی اصلاح و امداد کے لئے ہر پہلو میں کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"سرہند میں شیخ احمد نام ایک آدمی بڑے علم والا اور قوی عمل والا ہے۔ چند دن فقیر کی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اور اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں مشاہدہ کیں۔ اُمید ہے۔ کہ وہ ایسا چراغ روشن ہوگا۔ جس سے تمام جہاں روشن ہو جائے گا۔ اس کے احوال کاملہ یقینی ہیں۔ اس کے کامل احوال دیکھ کر میرا پختہ یقین ہے۔ کہ وہ ایسا ہی ہوگا۔ الحمدللہ۔ شیخ مذکور کے جتنے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں۔ سب کے سب

نیک اور عالم آدمی ہیں۔ اس دُعاگو نے بعض سے مُلاقات کی ہے۔ سب بیش قیمت موتی ہیں اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزند جو اپنے بچے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے اسرار ہیں۔

غرض سب کے سب شجرہ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں۔ لیکن عیال کی کثرت اور فقر اور تنگدستی کی زیادتی اور وجہ معاش کے نہ ہونے کے باعث ان سب کے اوقات میں پراگندگی آرہی ہے۔ اگر ہر سال چالیسواں حصہ (زکوٰۃ) کے طور پر ان لوگوں کے لئے کچھ معین ہوجائے۔ اور تقسیم کرنے والا منتظم ان کے درمیان مناسب طور پہ بانٹ دیا کرے۔ تو بہت ہی اچھا ہے۔ اور بہت ہی نیکی اور اجر کا باعث ہے۔ تھوڑا بہت جس قدر بھی مقرر ہوجائے۔ خیرات اور نیکیوں کا رکنِ عظیم ہوگا۔ فقرا اللہ تعالےٰ کے دروازے ہوتے ہیں۔ اور بہت ہی عجب دِل رکھتے ہیں۔ زیادہ لکھنا بے ادبی ہے۔"

حضرت خواجہ کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ طبیعت میں مسکنت بے حد تھی۔ اور تالیفِ قلوب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک اہم خط کے اخیر میں، جس کا ایک حصہ ان کے ملفوظات میں نقل ہوا ہے فرماتے ہیں۔" اے اللہ، تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ۔ اور مسکین ہی مار۔ اور مسکینوں کے گروہ میں اُٹھا۔" فروتنی اور کسرِ نفسی ان کی رگ رگ میں تھی۔ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی اتنی تعریف کی ہے۔ کہ بعض کوتاہ فہم، سخت غلطی، بلکہ بے انصافی اور بے ادبی میں مُبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ اگر حضرت خواجہ کے ان ارشادات سے

جو اُنہوں نے حضرتِ مجدّد کی نسبت فرمائے ہیں۔ اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں اپنے مُرید کی تھی۔ تو اس بلند ہمت مُرشد کی بھی تعریف کرنی چاہیئے جو ایک ہونہار مرید کی خوبیاں سراہنے سے نہ ہچکچایا!

بعض مجدّدی حضرات نے اپنے احوال و مکاشفات کا جس طرح اشتہار دیا دیا ہے اور اِن کی بنا پر دوسروں کی گمراہی کا باعث ہُوئے ہیں۔ اور اپنی مزید رُوحانی ترقی کے دروازے بند کر لئے ہیں۔ اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ اس معاملے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ ان کی عین ضد تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے واقعات اور رُوحانی مدارج کو چھپاتے۔ اور انتہائی رُوحانی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی عالی ظرفی "ہل من مزید" کا نعرہ لگاتی۔ ان کے سب سے قدیمی تذکرے میں ان کی جس خصوصیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ "سترِ احوال" اور "غایت اِنکسار" ہے۔ زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:۔

"شیوۂ مرضیہ حضرت خواجۂ ما قدس سرہٗ ہمگی سترِ احوال و اخفا دخمول و انزوا بود۔ و از غایت انکسار ہمیشہ دیدِ قصورِ احوال و متہم دانستنِ نیات نصبِ عینِ ایشاں"۔

حضرت خواجہ اس معاملے میں اِتنا غلو کرتے۔ کہ جب کوئی طالب ان کے پاس بیعت کی غرض سے آتا۔ تو وہ کسرِ نفسی سے یہی کہتے۔ کہ میں اس کارِ عظیم کے لائق نہیں ہوں۔ کہیں دوسری جگہ طلب کا دامن بڑھاؤ۔ اور اگر مردِ کامل کا پتہ ملے تو مجھے بھی خبر دینا۔ تاکہ اس کی خدمت میں پہنچوں۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ یہی ماجرا پیش آیا۔ اور وہ آپ کی عذر معذرت سے مجبور ہو کر مُرشد کی تلاش میں

آگھرے گئے۔ وہاں وہ سراسیمہ اور حیران پھر رہے تھے۔ کہ ایک جگہ سے قوالی کی آواز آئی۔ آپ نے کان لگا کر سُنا۔ تو قوال یہ شعر گا رہے تھے ؎

تو خواہی آستیں افشاں وخواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکانِ حلوائی

چنانچہ آپ پھر حضرت خواجہ کی خدمت میں واپس آگئے۔ اور بڑے اصرار کے بعد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ اسی طرح کا واقعہ ایک خراسانی نوجوان کو پیش آیا۔ جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر معتکف تھا۔ اور کسی زندہ مُرشد کے ملنے کا طالب تھا۔ اسے خواب میں اشارہ ہوا۔ کہ نقشبندیہ سلسلہ کے ایک مردِ کامل اس شہر میں آئے ہیں۔ تو جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پوچھتا پوچھتا ان کی خدمت میں پہنچا۔ اور اپنی خواب کا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے کہا۔ کہ میں مردِ کامل کہاں؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے! یہ کہا اور کثرتِ انکسار سے اس طرح معذرت کی۔ کہ وہ نوجوان بھی پلٹ گیا۔ دوسری رات اسے پھر اشارہ ہوا۔ کہ وہ بزرگ وہی ہیں۔ جن کی خدمت میں تم پہنچے تھے اور ان کی عاجزی تو ان کا زیور ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان پھر واپس آیا۔ اور جب تک آپ نے اس کی راہنمائی قبول نہ کر لی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

"غایتِ انکسار" کے علاوہ تذکرہ نگار آپ کی جس صفت پر زور دیتے ہیں۔ وہ "شفقت و ترحم" ہے۔ جس سال آپ لاہور میں تھے۔ وہاں سخت قحط سالی کا زمانہ تھا۔ اور لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ آپ نے بھی اپنی غذا کم کر دی۔ کئی کئی دن روزے سے رہتے۔ اور جو طعام آپ کے ہاں پکتا۔ وہ غریبوں کی شکم پُری

کے لئے بھیج دیتے۔ آپ کے تحمّل اور بُردباری کی اتنی مثالیں تذکروں میں ملتی ہیں۔ کہ اگر ہم چند مستند واقعات کو ہی جمع کرنا شروع کریں۔ تو ایک دفتر کی ضرورت ہو۔

غمِ زلف و رخت را شرح دادن　　شبے باید دراز و ماہتابے!

لیکن ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ آپ کی خوبیاں فقط منفیانہ قسم کی تھیں۔ آپ کو علمی دُنیا میں وہ پایہ حاصل نہیں۔ جو آپ کے ایک معتقد شیخ عبدالحق محدّث کو میسّر تھا۔ اور نہ ہی آپ کو اپنے دوسرے جلیل القدر شاگرد، حضرت سرہندی کا زورِ قلم اور جلال نصیب ہُوا۔ لیکن جہاں تک اپنے اصل کام یعنی ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے۔ آپ اپنے زمانے میں منفرد تھے۔ اور ہندوستان کی تاریخِ تصوّف میں آپ کی جگہ حضرت خواجہ بزرگ، حضرت سلطان المشائخ اور حضرت مجدّد کے ساتھ ساتھ ہے۔ جو اس مُلک میں اہم نئے سلسلوں کے مؤسس ہُوئے۔

جس سُرعت سے آپ نے تین چار سال کے قلیل عرصے میں نقشبندیہ سلسلے کی بنیادیں مستحکم طور پر اس ملک میں رکھ دیں۔ وہی آپ کی رُوحانی عظمت کا بین ثبوت ہے۔ اور شروع سے تذکرہ نگار اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی لکھتے ہیں:۔

"شاہدِ عظیم بر علوِّ رتبۂ ایشاں ہمیں بس۔ کہ در سہ سال بر مسندِ مشیخت بودند دریں مدتِ قلیلہ چہ مردم کہ از خوانِ دولتِ ایشاں روزی مند گردیدند۔ و چہ برکات و آثار کہ در کشورِ وسیع ہندوستان از ایشاں انبساط گرفت۔ و ایں سلسلۂ طریقۂ نقشبندیہ کہ دریں دیار غریب بود، تروّیجِ تمام یافت۔ باآنکہ بسیار از مشائخِ ایں سلسلہ آمدہ سالہائے بسیار دراں دیار ماندہ بودند۔

اما برکاتِ ایں درسہ سالہ دراں سالہا کجا بود؟"

آپ کے رُوحانی کمالات کا اور فنِ ارشاد و ہدایت میں کامل الفن ہونے کا ایک اور طریقے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت مجدّد نے آپ کے نام متعدد خطوط لکھے ہیں۔ جو غالباً مکتوبات میں تاریخی ترتیب سے درج ہیں۔ یا جنہیں کم ازکم، نفسِ مضمون یا دوسرے معاصرانہ شواہد کی بنا پر تاریخی ترتیب سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان خطوط کو اس ترتیب سے دیکھیں۔ تو ان میں حضرت مجدّد کا رُوحانی ارتقا آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور اس مرشدِ کامل کی بالغ نظری اور قوتِ رُوحانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو اس رُوحانی عروج میں مرید کی راہنمائی کر رہا تھا!

لیکن حضرت خواجہ کی شانِ تربیت کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی ثانوی طریقے ضرور نہیں۔ ان کے سب سے نامور مُرید نے اپنی ایک تصنیف میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اور حضرت کے طریقۂ تعلیم اور مرشدانہ شان کی اس پُر زور انداز سے تعریف کی ہے۔ کہ اس سے زیادہ زور دار اظہار تصوّر میں نہیں آسکتا۔

حضرت مجدّد الف ثانی، مبدا و معاد میں لکھتے ہیں:۔

"ما چہار کسے بودیم در ملازمت حضرتِ خواجۂ خود کہ پیشِ مردم درمیانِ سائر یاراں امتیازے داشتیم۔ وہرکدام مارا نسبت بحضرتِ خواجہ قدس سرہ اعتقادِ علیحدہ ومعاملۂ جُدا بود۔ ایں حقیر بہ یقین میدانست۔ کہ مثلِ ایں صحبت اجتماع و مانند آں تربیت و ارشاد بعد از زمانِ آں سرورِ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات ہرگز بوجود نیامدہ است و شکر ایں نعمت بجا میباید آورد۔ کہ اگرچہ بشرفِ

صحبت خیر البشر علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام مشرف نشدیم ۔ بارے
از سعادتِ ایں صحبت محروم نماندیم!"

حضرت مجدد الف ثانی کے علاوہ آپ کے کئی اور خلفا تھے ۔ جن میں سے
شیخ تاج الدین سنبھلی، شیخ الہ داد، خواجہ محمد نور اور مرزا حسام الدین احمد
خاص طور پر مشہور ہیں ۔ ان میں سے مرزا حسام الدین کے حالات لکھنے کو جی چاہتا
ہے ۔ ان کے والد قاضی نظام الدین بدخشی مخاطب بہ غازی خاں اکبر کے درباری
تھے ۔ بلکہ بدایونی کہتا ہے ۔ کہ "سجدۂ زمیں بوس" انہی کی اختراع تھا ۔ مرزا حسام الدین
خود، شیخ مبارک کے داماد تھے ۔ اور ابو الفضل ۔ فیضی کی بہن ان سے بیاہی تھی ۔
باپ کی وفات پر موروثی منصب انہیں ملا ۔ اور خانخاناں کے ساتھ دکن کی مہم کو
گئے ۔ وہاں محبتِ الٰہی کا جذبہ ایسا غالب ہوا ۔ کہ ترکِ دنیا کا فیصلہ کیا خانخاناں
نے مخالفت کی ۔ آپ نے اس سے کہا کہ اگر ترکِ منصب کی درخواست دوں گا ۔
تو منظور نہ ہو گی ۔ میں دیوانہ ہو جاتا ہوں اور قیودِ دنیوی سے رہائی پا کر باقی عمر
سلطان المشائخ کے مزار پر گزار دوں گا ۔ خانخاناں نے منتیں کیں ۔ لیکن
آپ نہ مانے ۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر پھینک دئے ۔ بدن کو کیچڑ ملا ۔
اور دیوانوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرنے لگے ۔ خانخاناں نے اب بھی انہیں
روکنا چاہا ۔ دوسرے امرا کو ساتھ لے کر بڑے اعزاز سے انہیں اپنی قیامگاہ پر بلایا ۔
اور پھر وعظ و نصیحت شروع کی ۔ انہوں نے جواب تک نہ دیا ۔ ناچار خانخاناں نے
ان کی عرضی بادشاہ کے پاس بھیجی ۔ وہاں سے دلی آنے کی اجازت ہوئی ۔ یہاں
پہنچے ۔ تو خواجہ باقی باللہ کی زیارت نصیب ہوئی ۔ اُن کے مرید ہوئے ۔ اور

انہی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ کہ جب مُرشد دم توڑ رہا تھا۔ تو مرزا حسام الدین کے سوا کوئی دوسرا خدمت میں موجود نہ تھا!

جب حضرت خواجہ نے وفات پائی۔ تو ان کے دو بیٹے خورد سال تھے۔ خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجۂ کلاں اور خواجہ عبد اللہ المعروف بہ خواجہ خُرد۔ ان دونوں کی عمر دو دو تین تین سال سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت خواجہ نے اپنی زندگی میں انہیں حضرت مجدّد سے توجہ دلائی تھی۔ اور ایک طرح سے انہیں اُن کے سپرد کیا تھا۔ لیکن ان کی خبر گیری کی سعادت مرزا حسام الدین احمد کے حصے میں آئی۔ حضرت مجدد خود ایک خط میں اپنے مُرشد کے احسانات کا ذکر کر کے اپنے مُرشد زادوں کو لکھتے ہیں:-

"ہر گاہ ایں طور دولتے رفیع القدر از حضرت ایشاں بدیں فقیر رسیدہ باشد اگر مدتِ عمر سرِ خود را پامال اقدام خدمۂ عتبہ عالیا شما کردہ باشد۔ ہیچ نکردہ باشد۔ از تقصیراتِ خود چہ عرض نماید و از شرمندگیہائے خود چہ اظہار نماید۔ اما معارف آگاہ خواجہ حسام الدین حق سبحانہ، از ما جزائے خیر دہاد۔ کہ مونتِ ما مقصراں برخود التزام نمودہ کمرِ ہمت را در خدمتِ عتبہ عالیہ بستہ اند۔ و ما دور افتادگاں را فارغ ساختہ"

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی وفات کے بعد مرزا حسام الدین احمد کا رشتہ عقیدت مجدد الف ثانی سے اُستوار ہو گیا۔ چنانچہ ان کے اور ان کے صاحبزادے خواجہ جمال الدین حسین کے نام کئی خطوط مکتوبات امام ربانی میں موجود ہیں۔ ان کی وفات ۱۰۴۳ھ میں ہوئی۔ ان کی بی بی نے بھی ان کے نیک کام جاری رکھے۔

اپنے بھائیوں اور خویشوں سے مُنہ موڑ لیا۔ اور جو کچھ زر و زیور اپنے پاس تھا۔ شوہر کے اشارے سے فقرا میں تقسیم کر دیا۔ اور جب تک جیتی رہی ۔ ۱۲ ہزار روپے سالانہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے بھیجتی رہی ۔ مندرجہ بالا حالات کا ماخذ مآثر الامرا ہے ۔ شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں :۔

"مخفی نماند۔ کہ خواجہ حسام الدین در اوائل حال در سلک امرائے وقت انتظام داشتند۔ والدِ ایشاں از اعاظم امرائے زماں بود۔ چوں بصحبتِ خواجہ رسیدند۔ و جذبِ طریقہ بالیشاں تاثیر کرد ہمہ را ترک کردند۔ و طوعاً و رغبتہً از ہمہ برآمدند۔ چوں اقاربِ ایشاں نمی گذاشتند کہ وضع فقرائے بخود قرار دہند۔ خود را بدیوانگی انداختند۔ و در مجمع بر مزبلہ نشستند و خود را ملوث ساختند۔ ازاں باز دستِ تشویشِ آنجماعہ از ایشاں کوتاہ شد۔ آنقدر مراعات جانبِ خواجہ در بارۂ اولادِ ایشاں و اتباعِ ایشاں و طریقۂ ایشاں و اشغال ایشاں کہ ازیں دو عزیز (خواجہ حسام الدین و شیخ الہ داد) بظہور پیوست۔ از دیگراں (حضرت مجدد؟؟) بوقوع نیامد"

خواجہ باقی باللہ کے دو صاحبزادوں کی نسبت شاہ صاحب اپنے والد کی زبانی لکھتے ہیں :۔

"حضرت ایشاں مے فرمودند۔ کہ خواجہ خرد و خواجہ کلاں ہر دو صغیر بودند کہ خواجہ محمدؐ باقی وفات یافتند۔ بعد ازاں چوں بسنِ بلوغ رسیدند۔ بخدمت شیخ احمد سرہندی رفتند۔ و اجازت یافتند۔ بعد ازاں باز گشتند۔

واز خواجہ حسام الدین و شیخ الہ داد کہ ہر دو خلیفۂ خواجہ بودند استفاضہ و استرشاد نمودند"

خواجہ خُرد سے شاہ ولی اللہؒ کے والد شیخ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے۔ اور انکی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالرحیم، خواجہ محمدؐ باقی کے بڑے مداح اور ان کے خاص طریقے کے پیرو تھے۔ وہ اسے غالباً طریقۂ مجددیہ پر فضیلت دیتے تھے[1] شاہ ولی اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"مخفی نماند کہ حضرت ایشاں از شعبات طریقۂ نقشبندیہ آنقدر شعبۂ حضرت خواجہ محمدؐ باقی را پسند میکردند و میل مینمودند۔ کہ مثل این میل بدیگر شعب نبود۔ ہمہ ارشاد و تربیت ایشاں بایں شعبہ بود است۔ شیخ تاج سنبھلی کہ اوّل خلفائے حضرت خواجہ بودند۔ و در آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہمانجا مدفون شدند و ایں فقیر از متاخران مشائخ اہلِ ہند ہیچ کس راندید۔ کہ اہلِ مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد او باشند۔ کرامات وے روائت کنند۔ (والدمن) درمیان اشتغال شعبِ باقویہ کہ ہماں طریقۂ نقشبندیہ است بے افراط و تفریط۔ رسالۂ عربیہ دارند۔ و حضرتِ ایشاں در ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند ملتقطانہ عباراتِ سلف۔ ایں فقیر ایں ہر دو را بخدمتِ حضرتِ ایشاں گذرانده والحمدللہ"۔

شیخ تاج الدین کی نسبت علامہ مرتضےٰ زبیدی نے جن کی عمر کا بیشتر حصہ یمن، حجاز اور مصر میں گذرا، "نفحۃ القدوسیہ" میں لکھا ہے۔ کہ انہوں نے بصرہ۔

---

[1] شاہ صاحب نے طریقۂ نقشبندیہ کا ذکر کرتے ہوئے کئی جگہ (مثلاً لمحات میں) طریقۂ باقویہ اور طریقۂ احمدیہ (مجددیہ) کو جدا جدا ظاہر کیا ہے۔

یمن - احساء - نجد اور خود حجاز میں طریقۂ نقشبندیہ کو پھیلایا - اور ان ممالک میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی ۔

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ

ابتدائی حالات

حضرت مجدّد الف ثانی ۲۶ رجب ۱۵۶۴ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے - آپ کا نام شیخ احمد تھا - لقب بدر الدین کنیت ابو البرکات اور عرف امام ربانی - آپ کے والد ماجد مخدوم شیخ عبد الاحد حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے مرید اور ایک صاحب علم بزرگ تھے - شیخ احمد سرہندی نے پہلے اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی - بعد ازاں سیالکوٹ تشریف لے گئے اور مولینا کمال کشمیری سے معقولات کی بعض کتابیں پڑھیں - حدیث میں آپ کے اُستاد مولینا یعقوب کشمیری تھے - دوسری کتابیں آپ نے قاضی بہلول بدخشانی سے پڑھیں - اور انہی سے تفسیر واحدی مع دیگر مولفات واحدی اور تفسیر بیضاوی مع دیگر مصنفات قاضی بیضاوی اور صحیح بخاری مع متعلقات ثلاثیات وغیرہ اور مشکوٰۃ المصابیح و ترمذی شریف مع شمائل اور جامع صغیر و قصیدہ بردہ اور حدیث مسلسل بالاولیت کی اجازت حاصل کی " سترہ برس کی عمر میں جب آپ تحصیلِ علم سے فارغ ہو گئے تو اپنے والد ماجد کے حضور میں طالبعلموں کو پڑھانا شروع کیا - اس کے کچھ عرصہ بعد آپ اکبر آباد تشریف لے گئے - اور وہاں

درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

سوانح نگار لکھتے ہیں۔ کہ قیامِ اکبر آباد کے دوران میں آپ کو ابو الفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا موقع ہوا۔ اور بعض اختلافات کے باوجود دونو بھائی آپکے علم و فضل کے بڑے معترف تھے۔ آپ کے ایک مشہور خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں لکھتے ہیں :۔ (ترجمہ)

چونکہ ابو الفضل اہلِ علم میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور اہلِ علم کو بھی بعض مجبوریوں کی بنا پر اس سے ملنا پڑتا تھا۔ اس لئے حضرت مجدد کئی بار اس کی مجلس میں آئے اور چونکہ وہ بھی آپ کی متعدد خوبیوں سے واقف تھا۔ اس لئے وہ آپ کا خاص پاس کرتا۔ چنانچہ اس کے ایک شاگرد نے راقم الحروف سے بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ ابو الفضل کسی دوست کو چند باتیں لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک واقعہ درج کیا۔ جو اس نے حضرت شیخ (مجدد) سے سنا ہوا تھا۔ اور اس ضمن میں حضرت کی بڑی تعریف لکھی۔

ابو الفضل کا ایک اور مصاحب مجھ سے کہتا تھا۔ کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد ابو الفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابو الفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی۔ اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا۔ کہ علمائے اسلام کی توہین مفہوم ہوتی تھی۔ حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالےٰ سے نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے فرمایا۔ کہ امام غزالی قدس سرہ نے رسالۂ شریفہ منقذ عن الضلال میں لکھا ہے۔ کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعوےٰ کرتے ہیں۔ ان میں سے جو کام کے ہیں۔ مثلاً ہیئت۔ نجوم۔ دہبت۔ طب۔ وہ انہوں نے قدیم انبیا کی

کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں۔ اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں۔ مثلاً ریاضی وغیرہ۔ وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابوالفضل یہ سن کر جوش میں آگیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا برا مانا۔ فوراً ابوالفضل کی مجلس سے اٹھے۔ اور فرمایا۔ کہ اگر اہلِ علم کی صحبت کا شوق ہے۔ تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالنے چاہئیں۔

یہ کہکر وہ مجلس سے باہر چلے گئے۔ اور پھر کئی روز تک ابوالفضل کے پاس نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور بلا منگایا۔

ایک روز حضرت (مجدد)، ابوالفضل کے بھائی ابوالفیض فیضی کے مکان پر گئے۔ وہ تفسیر غیر معجمہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا۔ تو بڑا خوش ہوا اور کہا۔ کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لئے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی۔ لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت، باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھدی۔ کہ فیضی حیران رہ گیا۔

حضرات القدس میں بھی جو حضرت مجدد کی دوسری معاصرانہ سوانح عمری ہے۔ مولینا بدرالدین سرہندی نے لکھا ہے۔ کہ آپ نے تفسیرِ بے نقط کی تحریر میں فیضی کی بڑی مدد کی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصہ اسے لکھ کر دیا تھا۔

فیضی اور ابوالفضل کی مصاحبت سے آپ کو ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ جو اسلام کو عقل اور فلسفہ اور ملکی مصلحتوں کے ترازو میں

تولتے تھے۔ اور چونکہ دار الخلافہ، علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ یقین
ہے۔ کہ اکبر آباد کے قیام میں آپ کو اپنی معلومات بڑھانے اور اپنا علمی پایہ بلند
کرنے کا موقع ملا ہوگا۔

جب آپ کو اکبر آباد رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا۔ تو آپ کے والد ماجد آپ کو
آگرہ سے جاکر بلا لائے۔ واپسی پر راستے میں تھانیسر کے رئیس شیخ سلطان کی
کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوگئی۔ اس شادی سے آپ کو مال و دولت بکثرت
ملا۔ اور وطن مالوف واپس جاکر آپ نے ایک نئی حویلی بنوائی۔ اور اس کے قریب
ایک نئی مسجد تعمیر کی۔

علومِ باطنی

آپ نے اس وقت علومِ ظاہری سے پوری واقفیت حاصل
کر لی تھی۔ علومِ طریقت آپ نے اپنے والد ماجد سے حاصل
کئے۔ اور ان سے خرقۂ خلافت چشتیہ (جو انہیں شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے
ملا تھا) حاصل کر کے طریقہ وسلوک میں ان کے جانشین ہوئے۔ کہا جاتا ہے۔
کہ طریقۂ چشتیہ کے علاوہ آپ نے طریقۂ سہروردیہ اور طریقۂ قادریہ بھی اپنے
والد بزرگوار سے حاصل کئے۔ اور طریقۂ کبرویہ میں اپنے اُستاد شیخ یعقوب کشمیری
سے استفادہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود طبیعت کو پورا اطمینان نصیب نہ ہُوا۔
اور ہمت کسی آنے والے اُستادِ کامل کی منتظر رہی۔ طریقۂ چشتیہ کے متعلق کہتے
ہیں، کہ باوجودیکہ اس میں سماع عام ہے۔ اور باوجودیکہ آپ نے اس سلسلہ میں
بیعت کی تھی، آپ نے سماع کبھی اختیار نہ کیا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ آپ نے علومِ ظاہری
بدرجۂ کمال حاصل کئے تھے۔ اور طبیعت میں غور و فکر اور جرح و تنقید کا مادہ

تھا۔ اس لئے ان کے جوہر کسی ایسے سلسلے میں ہی کھل سکتے تھے۔ جس میں شرع کی پیروی بھی کامل طور پر ہوتی ہو۔ اس کا موقع خواجہ محمدؒ باقی باللہؒ کی عنایت سے میسر آگیا۔ جنہوں نے انہی دنوں دہلی میں اقامت اختیار کر کے سلسلۂ نقشبندیہ کا فیض جاری کیا تھا۔

حضرت خواجہ محمدؒ باقی باللہ کی بیعت سے آپ ۱۰۰۸ھ میں مشرف ہوئے تذکرہ نگار لکھتے ہیں۔ کہ آپ حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں دہلی تھا۔ جب آپ وہاں پہنچے۔ تو مولینا حسن کشمیری نے جو آپ کے دوستوں اور حضرت خواجہ کے مخلصوں میں سے تھے۔ آپ سے حضرت خواجہ کے کمالات کا اظہار کر کے ملاقات کی تحریک کی۔ اور آپ ان کے ہمراہ خدمتِ عالیہ میں پہنچے۔ ”حضرت خواجہ صاحب کی یہ عادت نہ تھی۔ کہ کسی سے کوئی اپنی خواہش ظاہر فرماتے۔ البتہ آپ سے حضرت خواجہ صاحب نے خلافِ عادت خانقاہ شریف میں چند روز قیام کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ آپ نے ایک ہفتہ قیام کا وعدہ کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک ماہ دو ہفتہ کی نوبت پہنچ گئی۔ ابھی دو روز بھی نہ گزرے تھے۔ کہ آثار تصرف و کشش حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کے نمودار ہوئے۔ اور آپ پر شوقِ انابت و اخذ طریقۂ خواجگان علیہ الرحمۃ نے غلبہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ سے بیعت کے لئے درخواست کی۔ بمجرد عرض کرنے کے بلا استخارہ (خلافِ عادت) حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نے آپ کو خلوت میں طلب فرما کر مرید کیا۔ ذکرِ قلبی تعلیم فرمایا۔ فوراً آپ کا دل ذاکر ہو گیا۔ اور آرام و حلاوت ذکرِ قلبی و التذاذ تمام حاصل ہوا۔ یوماً فیوماً ترقیات عالیہ و

عروجات متعالیہ ظاہر ہوتے رہے"۔ خواجہ صاحب کی توجہ سے آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں، مثلاً مقامِ حیرت۔ مقامِ فنائے حقیقی۔ شرح صدر۔ مقامِ حق الیقین تھوڑے ہی عرصے میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت، حوصلہ اور رُوحانی استعداد نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب اپنے خطوں میں آپ کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"شیخ احمد نام مردیست از سرہند، کثیر العلم وقوی العمل۔ روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد۔ عجائبِ بسیار از روزگار اوقاتِ او مشاہدہ نمود۔ بآں ماند۔ کہ چراغے شود۔ کہ عالمہا ازو روشن گردد۔"

ارشاد وہدائت

حضرت خواجہ باقی باللہ، اپنے بلند اقبال مرید کے جوش اور ذوق وشوق کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اور انکی نسبت ذیل کی ابیات پڑھا کرتے تھے ؎

عشقِ معشوقاں نہاں است و ستیر	عشقِ عاشق باد و صد طبل ونفیر
لیک عشقِ عاشقاں تن زہ کند	عشقِ معشوقاں خوش وفربہ کند

تعلیم وتلقین کے بعد مُرشد نے آپ کو اجازتِ سفر دی۔ اور آپ سرہند تشریف لے گئے۔ اور عبادتِ الٰہی وسیرِ مقامات میں مشغول ہوئے۔ اس کے بعد آپ دو دفعہ اور مُرشد کی زندگی میں دہلی تشریف لائے۔ آخری وقت حضرت خواجہ باقی باللہ نے آپ کو حکم دیا۔ کہ آپ شہر لاہور میں جاکر ارشاد وہدائت کی مشعلیں روشن کرو۔ چنانچہ جب ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ کو حضرت خواجہ نے وصال فرمایا۔ تو حضرت مجدد، لاہور میں ہی تھے۔ آپ فوراً وہاں سے دہلی روانہ ہوئے۔ راستے میں

سرہند تھا لیکن آپ وہاں نہ رُکے۔ بلکہ مکان کی شکل تک نہ دیکھی۔ اور شبانہ روز چل کر دہلی پہنچے۔ اور مُرشد کے مزار پُرانوار کی زیارت کی۔

دہلی میں بدقسمتی سے آپ کے اپنے بعض پیر بھائیوں سے عارضی اختلافات ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ممتاز خلفا میں سے غالباً آپ سب کے بعد آئے تھے۔ لیکن فطری صلاحیتوں کی وجہ سے سب سے آگے نکل گئے۔ صاحبِ نظر مرشد تو آپ کی خوبیاں سمجھتا تھا۔ لیکن سب خلفا پر وہ ابھی پُوری طرح روشن نہ ہوئی تھیں۔ اور دوسرے شاید ان خلفا اور حضرت مجدّد کی طبیعت اور طور طریقوں میں بھی اختلاف تھا۔ ان خلفا کے سرگروہ، حضرت خواجہ باقی اللہ کے سب سے قدیمی خلیفہ شیخ تاج الدین سنبھلی تھے۔ جو بعد میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ یہ اختلافات تو ختم ہوگئے۔ لیکن حضرت مجدّد نے مُرشد کی خانقاہ کا انتظام دُوسروں کو سونپا۔ اور خود سرہند جاکر ارشاد و ہدایت شروع کی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کو بہت دن جینا نصیب نہیں ہُوا۔ لیکن وفات سے پہلے اُنہوں نے نقشبندیہ سلسلے کی مُستحکم بنیاد رکھ دی تھی۔ اس زمانے کا سب سے متدین امیر شیخ فرید آپکا معتقد تھا۔ اور کئی دُوسرے امراوا کابر بھی آپکے قائل تھے حضرت مجدّد نے اس سلسلے کو وسعت او راستحکام دیا۔ جب جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید کا اثر و رسُوخ بڑھا۔ تو نقشبندیہ سلسلے کو اور سہولتیں مِل گئیں۔ حضرت مجدّد نے شیخ فرید اور دیگر اراکین سلطنت کیساتھ اپنے تعلقات بڑھائے۔ اور انہیں پُر زور خطوں میں ترویجِ شریعت کی تلقین کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور چونکہ ان کی زبان میں تاثیر اور قلم میں طاقت تھی۔ اس لئے جوق جوق لوگ آپ کے معتقد ہونے شروع ہوئے۔

ترویجِ شرع کی حمایت، اور صُوفیانہ مقامات کی توضیح کے علاوہ آپ نے شیعہ عقائد کی بھی مخالفت کی۔ اس وقت ایران میں شیعہ مذہب رائج ہو چکا تھا۔ اور ایران سے باثر لوگ ہندوستان آرہے تھے۔ شیعہ عقائد کے متعلق سنّی علما جو اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ، اس زمانے کے علما سمجھتے تھے۔ کہ ایک نئے فرقے کے آغاز سے قوم میں مخالفت اور اختلاف کا دروازہ کھُل جائے گا۔ جو آئندہ خطرے کا موجب ہوگا۔ چنانچہ اُنھوں نے اکثر شیعہ عقائد کی پُرزور مخالفت کی۔ شیخ مجدّدؒ نے اس سلسلے میں ردِّ روافض کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں آپ نے خلفاء راشدین کے فضائل، حدیث و تاریخ سے ثابت کئے۔ مکتوبات میں بھی آپ نے اس مسئلے پر بڑی قابلیت سے اظہارِ خیال کیا۔ اور شیعہ عقائد کی اشاعت کو روکا جو جہانگیر کے وزیر آصف خاں اور اس کے ساتھیوں کی وجہ سے عام ہو چلے تھے۔

۱۶۱۹ء میں جب آپ کی مجدّدانہ مساعی کو کئی سال ہو چکے تھے۔ اور آپ کے مرید اور خلفا تمام ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی پھیل چکے تھے۔ آپ نے ایک پُرجوش مرید شیخ بدیع الدین کو جہانگیر کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لئے بھیجا۔ چنانچہ لشکر کے بہت سے آدمی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

مکتوبِ یازدھم کی مخالفت

لیکن اس زمانے میں آپ کے بعض مکتوبات مرتب ہو کر عام ہو گئے تھے۔ اور ان میں سے ایک دو پر معترضین اعتراض کرتے تھے۔ سب سے زیادہ اعتراض اس خط پر

---

[1] زبدۃ المقامات کی عبارت سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ رسالہ قیامِ اکبر آباد کے دوران میں تصنیف ہُوا۔

تھا۔ جواب دفترِ اول میں مکتوب یازدھم ہے۔ اور جس میں حضرت مجددؒ نے اپنے عروج روحانی کا ذکر کیا ہے۔ زیادہ اعتراض ذیل کی عبارت پر تھا:۔ (ترجمہ)

"دوسری عرض یہ ہے۔ کہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقام ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت ذی النورینؓ کا مقام ہے۔ اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے۔ اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے۔ تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں۔ اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے۔ اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے۔ اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا۔ اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا۔ اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ سوائے عبور اور مقام اور مرور اور ثبات کے کچھ فرق نہیں ہے۔ اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا۔ ظاہر ہوا۔ اور وہ مقام اس مقام سے

تھوڑا سا بلند تھا۔ جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں۔
اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے۔ اور وہ مقام رنگین اور منقش
تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا"۔
شیخ بدیع الدین تک بھی یہ اعتراض پہنچائے گئے۔ اور کہا گیا۔ کہ تمہارا پیر تو
اپنے آپ کو صدیق اکبرؓ سے بھی افضل سمجھتا ہے۔ شیخ صاحب نے ایک عریضہ
خدمت میں ارسال کر کے اس عبارت کی توضیح چاہی۔ چنانچہ دفتر اول کا مکتوب
شمارہ ۱۹۲ اسی خط کے جواب میں ہے۔ اس میں حضرت مجدد لکھتے ہیں۔ کہ
میں نے یہ خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا۔ اور اس سلسلے کا یہ اصول ہے۔ کہ
مرید کو جتنے بھی واقعات پیش آئیں۔ صحیح ہوں یا سقیم۔ بے تحاشا انہیں اپنے
مرشد کے حضور میں عرض کر دینا چاہیئے۔ تاکہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں ان کی
تعبیر ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے۔ معترضین کی اس سے تشفی نہ ہوئی۔ اور آپ کے
کئی مریدوں (مثلاً مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام) نے مکتوب یازدہم کی بناء پر
آپ کے طریقہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس پر آپ نے ایک مفصل مکتوب مرزا
فتح اللہ کو لکھا۔ جس میں ظاہر کیا۔ کہ میں قطعاً اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؓ سے
افضل نہیں سمجھتا۔

"وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیقؓ سے افضل جانے۔ اس کا امر
دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ زندیق محض ہے۔ یا جاہل......
وہ شخص جو حضرت امیرؓ کو حضرت صدیق سے افضل کہے اہل سنت و الجماعت کے
گروہ سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے۔ جو اپنے آپکو افضل جانے"۔
(ترجمہ)

دربارِ جہانگیر میں طلبی

حضرت مجدد کی تشریح سے معترضین کی تسلّی ہوجانی چاہیئے تھی۔ لیکن پتہ نہیں یہ تشریح بہتوں تک پہنچی یا نہ۔ بہرکیف علماء نے جہانگیر کے حضور میں شکایت کی۔ کہ سرہند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھتا ہے۔ اور ایسے دعوے کرتا ہے۔ جن سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے علاوہ آصف خان اور دوسرے مخالفوں نے نمک مرچ بھی لگائی ہوگی۔ کہ شیخ احمد نے مجددیت کا دعوےٰ کیا ہے۔ ہزاروں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ عجب نہیں کہ اُس کا اثر حکومت کیلئے مضر ثابت ہو۔ چنانچہ جہانگیر نے حاکم سرہند کی معرفت حضرت مجدد کو بُلا بھیجا۔

جہانگیر نے اس واقعہ کی نسبت تو زک جہانگیری میں کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیالات کیا ہے۔ بدقسمتی سے اُسے اس قدر بہکایا گیا تھا۔ کہ اُس نے اپنی رائے بڑی بے ادبی سے ظاہر کی ہے[2]۔ حضرت مجدد کی نسبت اس نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ حضرت مجدد کے تمام معتقدوں بلکہ تاریخ کے غیر جانبدار ناظرین کو بھی معیوب معلوم ہوں گے لیکن چونکہ جہانگیر کے بیان کی تاریخی اہمیت بہت ہے اس لئے ہم نقلِ کفر کفر نباشد کے ذیل میں اس کا بیان درج کرتے ہیں۔

جہانگیر چہار دہم سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"دریں ایام بعرض رسید۔ کہ شیخ احمد نام شیادے در سرہند دامِ زرق و سالوس فروچیدہ بسیارے از ظاہر پرستانِ بے معنی را صید خود کردہ۔ و بہر شہرے و دیارے یکے از مریدانِ خود را کہ آئینِ دُکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگراں پختہ تر داند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ و مزخرفاتے را

---

[1] تذکرہ علمائے ہند

[2] عجب نہیں۔ کہ اس طرزِ بیان میں ایک شیعہ مرزا ہادی جامع تزک جہانگیری کے اندازِ تحریر کو بھی دخل ہو۔

کہ بمریدان و معتقدانِ خود نوشتہ، کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ۔ ودراں جُنگ مہملات بسا مقدماتِ لاطائل مرقوم گشتہ کہ بکفر و زندقہ منجر مے شود۔ از انجملہ درمکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گذارم بمقامِ ذی النورین اُفتاد۔ مقامے دیدم بغائت عالی و خوش بصفا۔ از انجا درگذشتم بمقامِ فاروق پیوستم واز مقامِ فاروق بمقامِ صدیق عبور کردم وہر کدام را تعریفے درخورِ آں نوشتہ واز انجا بمقامِ محبوبیت واصل شدہ، مقامے مشاہدہ اُفتاد۔ بغائت منوّر و ملوّن۔ خود را بانواعِ انوار والوان منعکس یافتم یعنی استغفر اللّٰہ از مقامِ خلفا درگذشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم۔ و دیگر گستاخیہا کردہ۔ کہ نوشتن آں طولے دارد واز ادب دُور است۔ بنابریں حکم فرمودم۔ کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و ازہرچہ پرسیدم جوابِ معقول نتوانست سامان نمود باعدمِ خرد و دانش، بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاحِ حالِ او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد تا شوریدگیِ مزاج و آشفتگیِ دماغش قدرے تسکین پذیرد شورشِ عوام نیز فرو نشیند لاجرم بہ انی رائے سنگدلن حوالہ شد۔ کہ در قلعۂ گوالیار مقیّد دارد"۔

حال کے تذکرہ نویسوں نے اس واقعہ کو ذرا اور تفصیل سے لکھا ہے۔

مشاہیر اسلام میں مولوی محمد دین فوق لکھتے ہیں۔ کہ جب آپ دربار میں تشریف لائے تو بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا تم اپنے آپ کو حضرت صدیق سے افضل سمجھتے ہو؟" آپ نے فرمایا۔ "جب ہم حضرت علیؓ کو جو خلیفۂ چہارم ہیں حضرت صدیقؓ

سے افضل نہیں جانتے۔ تو ہم خود کس شمار و قطار میں ہیں۔ کہ ان سے افضل ہونگے؟"
بادشاہ نے کہا۔ "تمہارے مکتوب کیا کہتے ہیں؟"
فرمایا۔ "مکتوبات وہی کہتے ہیں۔ جو اُستاد اور پیر و مُرشد نے بتایا ہے۔
ان میں سلوک اور عروجِ مقامات کا جو ذکر ہے۔ یہ عروج صرف لحظہ بھر کا ہے۔"
بادشاہ نے پوچھا "وہ کس طرح؟"
فرمایا۔ "بعینہٖ اسی طرح جس طرح تم کسی شخص کو اپنے پاس بُلا کر سرگوشی کرو۔ تو ضرور ہے۔ کہ یہ شخص مقامِ ہفت ہزاری اور پنج ہزاری وغیرہ طے کرتا ہُوا آئیگا اور لحظہ بھر کی سرگوشی کے بعد پھر اپنے اصلی مقام پر واپس آجائے گا۔ اِن عبُورِ مقامات سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکل سکتا کہ وہ شخص اب ہفت ہزاری وغیرہ مراتب سے بڑھ گیا ہے۔ ہمارا عروج بھی اس طرح کا تھا۔ لحظہ بھر کے بعد ہم پھر اپنے مقام پر آگئے۔"
معلوم ہوتا ہے۔ اس جواب سے بادشاہ کی تسلّی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اُسی وقت کسی نے بادشاہ سے کہا۔ کہ "شیخ کا غرور دیکھو۔ کہ تم ظلّ اللہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس نے آئینِ دربار کے مُطابق سجدہ نہیں کیا۔" بادشاہ کو یہ سُنکر طیش آیا۔ اور اُسی وقت حکم دیا۔ کہ شیخ کو گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا جائے۔
تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے۔ کہ شاہجہان نے جو حضرت شیخ کا معتقد تھا۔ ان کے دربار میں آنے سے پہلے ہی افضل خان اور خواجہ عبدالرحمان مفتی کو ان کے پاس بھیج کر پیغام دیا تھا۔ کہ "علما سجدۂ تحیّت جہتِ سلاطین جائز داشتہ اند۔ شمارا باید کہ وقتِ ملاقات بادشاہ را سجدہ کنید۔ و من ضامن میشوم کہ از سلطان

بشما ضررے نخواہد رسید"۔

لیکن حضرت مجددؒ اس سجدہ دربار کو گناہ سمجھتے تھے۔ آپ نے جواب دیا۔

"غرضیت آنست کہ بجز خدائے عزوجل دیگرے را سجدہ مکردہ شود"۔

حضرت مجددؒ کی محبوسی جہانگیر کا ایک ایسا فعل ہے جس کی کسی صورت میں حمایت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ اس امر کا اظہار کر دیا جائے کہ حضرت مجددؒ کو جہانگیر نے اس لئے نہیں طلب کیا تھا۔ کہ اسے حضرت سے کوئی ذاتی عناد تھا۔ بلکہ اس طلبی کی اگر ایک وجہ ملکی مصلحتیں تھیں[1]۔ تو دوسری وجہ جہانگیر کی مذہبی حمیت تھی۔ اس نے مکتوبات کے جن اندراجات کی تزک جہانگیری میں شکائت کی ہے۔ ان پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسے بزرگ معترض تھے۔ بلکہ خزینۃ الاصفیا میں تو لکھا ہے۔ کہ بعض علما نے حضرت مجددؒ کے قتل کا فتوے دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مجددؒ کے خلاف ایک عام شورش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جہانگیر حضرت مجددؒ کی قید کا ایک مقصد یہ بھی بتاتا ہے۔ کہ شورش عوام ٹھنڈی پڑ جائے۔

---

[1] شاید مغل بادشاہ نہ چاہتے تھے۔ کہ مذہبی راہنماؤں کا اثر حد سے زیادہ بڑھ جائے۔ تزک جہانگیری میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "بمن خبر رسید کہ شیخ ابراہیم بابا افغانی دکان شیخی و مریدی در یکے پرگنہ از پرگنات لاہور ترتیب دادہ چنانچہ طریقۂ او باش است۔ جمع کثیرے از افغاناں وغیرہ بر دگرد آمدہ اند۔ فرمودم کہ او را حاضر آوردہ بہ پرویز سپارند کہ در قلعۂ چنار نگاہ دارند۔ تا ایں ہنگامہ باطل برہم خوردہ" شاہجہان نے بھی حضرت مجددؒ کے خلیفۂ اعظم شیخ آدمؒ بنوری کو حج پر چلے جانے کیلئے مجبور کیا تھا۔

سُنّتِ یوسفی

حضرت مجدّد تقریباً ایک سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ تو شیخ بدیع الدین کا، جن کی طبیعت میں جوش زیادہ تھا، استقامت کم۔ ذوق وشوق بالکل مُردہ ہو گیا۔ (نوشتہ بودند کہ از وقتِ ظہورِ فتنہ نہ ذوق ماندہ است و نہ حال) لیکن حضرت مجدد کے ذوق وشوق میں اور اضافہ ہُوا۔ اُنھوں نے دفترِ سوم میں کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ محبُوب کی جفا، اس کی مہربانی سے زیادہ دلآویز ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بعض لحاظ سے واقعۂ قید حضرت مجدد کے لئے زیادہ ترقیات اور روحانی اصلاح کا باعث ہوا۔ جہانگیر پندرھویں سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"دریں ایام شیخ احمد سرہندی را کہ بجہتِ دُکان آرائی وخود فروشی وبیہرفہ گوئی روزے چند در زندانِ ادب محبوس بود بحضور طلب داشتہ خلاص ساختم خلعت وہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ در رفتن وبودن مختار گردانیدم۔ او از روئے انصاف معروض داشت۔ کہ این تنبیہ وتادیب در حقیقت ہدائتے وکفائتے بود۔"

جہانگیر کے بیان کی تائید خود حضرت مجدد کے مکتوبات سے ہوتی ہے۔ ایک مفصّل خط میں میر محمدؐ نعمان کو لکھتے ہیں:۔ (ترجمہ)

"پوشیدہ نہ رہے۔ کہ جبتک اللہ تعالےٰ کی عنائت سے اس عنائت نے حق تعالےٰ کے جلال وغضب کی صورت میں تجلّی نہ فرمائی۔ اور قید خانے کے قفس میں قید نہ ہُوا۔ تب تک ایمان شہودی کے تنگ کوچے سے کلّی طور پر

نہ نکلا۔ اور ظلال و خیال و مثال کے کوچوں میں سرگرداں رہا۔ ایمان بالغیب کی شاہراہ میں مطلق العنان ہوکر نہ دوڑا۔ اور حضور سے غیب کے ساتھ اور عین سے علم کے ساتھ اور شہود سے استدلال کے ساتھ کامل طور پر نہ ملا۔ اور ذوقِ کامل اور وجدانِ بالغ کے ساتھ دوسروں کے ہُنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہُنر نہ معلوم کیا۔ بے ننگی اور بے ناموسی کے خوشگوار شربت اور رسوائی اور خواری کے مزہ دار مُربّے نہ چکھے اور خلق کے طعن و ملامت کے جمال سے حظ نہ پایا۔ اور لوگوں کے بلاد جفاء کے حسن سے محظوظ نہ ہُوا۔ اور کلّی طور پر اپنے ارادہ و اختیار کو ترک نہ کیا اور آفاقی اور نفسی تعلقات کے رشتہ کو کامل طور پر نہ توڑا اور تضرّع و التجا انابت و استغفار و ذلّت و انکسار کی حقیقت حاصل نہ ہوئی۔ اور حق تعالےٰ کے استغنا کی رفیع الشان بارگاہ کو جس کے گرد، عظمت و کبریا کے پردے تنے ہوئے ہوئے ہیں۔ مشاہدہ نہ کیا۔ اور اپنے آپ کو بندۂ خوار و زار و ذلیل و بے اعتبار و بے ہُنر و بے طاقت اور کامل محتاج اور فقیر معلوم نہ کیا۔"

ان ایام میں حضرت مجدّد کے خیالات میں جو ترقی اور تبدیلی ہوئی۔ اس کا کچھ اندازہ مکتوبات کے دفترِ اول اور دفترِ سوم کا موازنہ کرنے سے ہوتا ہے۔ دفترِ اول میں ایامِ جوانی کے خطوط ہیں۔ اور دفترِ سوم میں واقعۂ قید اور اسکے بعد کے۔ پہلے دفتر میں جوش و ولولہ بلکہ انانیت کا زور ہے۔ تیسرے میں پختگی، ملائمت، اور ژرف نگہی ہے۔ ایک میں شانِ جلالی جلوہ گر ہے۔ تو

دوسرے میں شانِ جمالی۔ اس تفاوت کی ایک وجہ تو عمر اور تجربے کے ساتھ علم اور طبیعت کی پختگی ہے۔ لیکن دوسری وجہ ان واقعات کا ظہور ہے جو حضرت مجدّد کی کامیاب زندگی میں پہلی مرتبہ وقوع پذیر ہوئے۔

قید خانے سے رہائی کے بعد جہانگیر نے حضرت مجدّد کو اجازت دی تھی۔ کہ وہ چاہیں۔ تو لشکر کے ساتھ رہیں۔ اور چاہیں۔ تو گھر چلے جائیں۔ آپ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ اس طرح آپ کو سارے لشکر میں، بلکہ ساری مملکت میں جہاں جہاں لشکر جاتا، تلقین وہدایت کا موقع ملتا۔ اس سے پہلے بھی جب آپ جیل خانے میں محبوس تھے۔ تو آپ نے اپنے رفقائے زنداں میں سے کئی بُت پرستوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں آپ کو بادشاہ کو تلقین کرنے کا بھی موقع ملتا۔ چنانچہ دفتر سوم میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے۔ اور ایک خط میں اُس گفتگو کا ذکر ہے۔ جو آپ نے مجلسِ شاہی میں کی تھی۔ لکھتے ہیں[۱]:- (ترجمہ)

"عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں سرِمو سُستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی۔ اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہُوا کرتی ہیں اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہِ رمضان کی

---

[۱] مکتوبات کا یہ اور دوسرے ترجمے، اُس ایڈیشن سے ماخوذ ہیں۔ جو ملک فضل الدین خیر الدین نے لاہور سے شائع کیا

سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدّد اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی اقتدا اور تراویح کی سنّت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنّوں اور اجنّنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہُوا۔ بڑی خوشی سے سنتے رہے۔ اس اثناء میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہُوا۔ اور اقطاب اور اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہُوا۔ اللہ تعالےٰ کا احسان ہے۔ کہ سب کچھ قبول کرتے رہے۔ اور کوئی تغیّر ظاہر نہ ہُوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شائد کوئی اللہ تعالےٰ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز ہوگا"۔۔۔۔۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہانگیر آپ کا بڑا معتقد ہوگیا تھا۔ وہ رہائی کے تین سال بعد اپنی سالگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

"بدستور ہر سال خود را بہ طلاو اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقاں مقرّر فرمودم۔ از انجملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنائت شُد"

حضرت مجدد رہائی کے بعد تقریباً تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ اس دوران میں اُنھوں نے کئی خط لکھے۔ جو جلدِ سوم میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سوانحی واقعات بہت تھوڑے ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا حضرت مجدّد

بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگڑہ بھی گئے۔ لیکن تزکِ جہانگیری کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے۔ کہ ان تین چار سالوں میں جہانگیر کو تدریجِ شریعت کا خاص خیال رہتا تھا۔ اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔ عجب نہیں۔ کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کو بھی دخل ہو۔ جہانگیر پندرھویں سالِ جلوس کے واقعات میں یعنی جس سال حضرت کو رہائی ملی علاقہ راجوری (کشمیر) کے بعض مسلمان راجپوتوں کی نسبت لکھتا ہے:۔

"زمینداران اینجا را راجہ مے گفتند۔ سلطان فیروز مسلمان کردہ۔ و مع ذالک خود را راجہ مے گویانند و ہنوز بدعتہائے ایامِ جہالت درمیان آنہا مستمر است از جملہ، چنانچہ بعضے از زنانِ ہند و باشوہر خود مے سوزند۔ اینہا را زندہ باشوہر در گور مے آرند۔ شنیدہ شد کہ درہمیں ایام دخترے دہ دوازدہ سال باشوہر خود کہ ہمسال باو بود۔ زندہ بقبر در آوردند۔ دیگر آنکہ بعضے از مردم بے بضاعت را کہ دختر بوجود مے آید۔ خفہ کردہ مے کشند۔ با ہنود پیوندِ خویشی مے کنند دختر مے دہند و مے گیرند۔ گرفتن خود خوب۔ اما دادن!! نعوذ باللہ۔ فرمان شد۔ کہ بعد ازیں پیرامونِ ایں امور نگردند۔ و ہر کس کہ مرتکب ایں بدعتہا شود۔ او را سیاست کنند"۔

پھر اگلے سال فتح کانگڑہ کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

"متوجہ سیر قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میرِ عدل و دیگر علماء اسلام

لہ جہانگیر کے بیان سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے میں بھی مسلمان عوام جوالامکھی کی پرستش کرتے تھے۔ "قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئینِ آنہاست۔ گروہ گروہ از اہلِ اسلام مسافت بعید طے نمودہ نذورات مے آرند۔ و پرستش ایں سنگِ سیاہ مے نمایند"۔

کہ در رکاب بودہ۔ آنچہ شعایرِ اسلام وشرائطِ دینِ محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ بتوفیقِ ایزد سبحانہٗ، بانگ نماز و خواندن خطبہ وکشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود ہمہ را در حضورِ خود بعمل آوردم۔ سجداتِ شکر ایں موہبت عظمٰی کہ ہیچ بادشاہے توفیق بداں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ، حکم فرمودم کہ مسجد عالی درونِ قلعہ بنا نہند۔"

یہ امر غیر اغلب نہیں۔ کہ "علمائے اسلام" جو رکابِ شاہی میں سے تھے ان میں حضرت مجدّد بھی ہوں!

جہانگیر کی بادشاہت میں آصف خاں کو بڑا دخل تھا۔ اور حضرت مجدّد کو یہ ضرور ناگوار ہوتا ہوگا۔ لیکن قیامِ لشکر کے دوران میں حضرت مجدّد کو پُوری آزادی تھی۔ آپ ایک خط میں خواجہ حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں:۔

"اُس طرف کے فقرا کے احوال و اوضاع حمد کے لائق ہیں۔ کہ عین بلا میں عافیت اور عین تفرقہ میں جمعیت حاصل ہے۔ وہ فرزند و دوست جو ہمراہ ہیں۔ ان کے اوقات بھی جمعیت سے گزر رہے ہیں۔ اور ان کے احوال میں ترقی ہو رہی ہے۔ غرض لشکر ان کے حق میں خانقاہِ مشخّص ہے۔۔۔۔ الحمد للہ کہ باوجودیکہ بابِ تفرقہ سے بہت میل جول ہے لیکن اللہ تعالےٰ کے کرم سے ہمراہیوں میں سے کسی کو ابھی تک تفرقہ کی نوبت نہیں پہنچی۔ اور مطلب سے نہیں روکا۔"

لشکر کے ساتھ ہی آپ ۱۰۳۲ھ میں اجمیر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی۔ دیر تک وہاں مراقبہ کیا۔

اور بڑا فیض حاصل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کہ خواجہ صاحب نے حقِ مہمانی ادا کیا۔ طرح طرح کی ضیافتیں کیں۔ اور بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہُوا۔ اسی جگہ مزار کے خادموں نے حاضر ہو کہ حضرت خواجہ کے مزار کا قبر پوش آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ جسے آپ نے ادب کے ہاتھوں سے لیا۔ اور فرمایا کہ چونکہ یہ لباس حضرت خواجہ سے بہت نزدیک رہا ہے۔ اس لئے اسے میرے کفن کے لئے سنبھال رکھنا چاہیئے۔

اب آپ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ ضعفِ جسمانی غالب آرہا تھا۔ اور سمجھتے تھے۔ کہ رحلت کا وقت قریب آرہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ سے اجازت لی۔ اور سرہند تشریف لائے۔ جہاں پہنچ کر آپ نے خلوت اختیار کی ان ایام میں کئی دفعہ آپ اپنی موت کا ذکر کرتے تھے۔ اور ایک دفعہ تو ہندی کا یہ دوہا پڑھتے تھے ؎

آج ملاوا کنت سوں، سکھی، سب جگ دیواں وار

یعنی آج وصال کا دن ہے اے سکھی۔ میں اس خوشی پہ تمام دُنیا کو نثار کر دوں!

تھوڑے ہی عرصے بعد موت کا پیغام آن پہنچا۔ اور آپ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ مُطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو انتقال فرما گئے +

کیا حضرت مجدّد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا؟

حضرت مجدّد کی مذہبی خدمات پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔ کہ حضرت مجدّد کا اکبری الحاد کے خاتمہ میں کس قدر حصّہ تھا +

آج سے تیس چالیس سال پہلے سوائے مجددیہ حضرات کے کوئی اہلِ علم

اس امر کا قائل نہ تھا۔ کہ حضرت مجدد نے عہدِ اکبر کی بدمذہبی کا خاتمہ کیا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ روضتہ القیومیہ اور حضرت مجدد کی بعض سوانح عمریوں میں جو ان کی وفات کے بہت بعد، ان کے معتقدوں نے لکھیں۔ اس امر کا دعوٰی کیا گیا تھا۔ لیکن علمی حلقوں میں اس خوش اعتقادی کو اُسی قدر اہمیت دی جاتی جس قدر علاء الدین خلجی کے متعلق نظامی حضرات کے اس دعوے کو، کہ اس کی فتوحات میں حضرت سلطان المشائخ کا ہاتھ تھا، یا مغلوں کے متعلق، شطاریوں کے اس بیان کو، کہ سُور افغانوں پر انہیں فتح حضرت غوث گوالیاری کی مدد سے ہوئی۔ حضرت مجدد کے متعلق ان کے بعد، ہمارے بہترین علما و صلحا مثلاً شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالحق محدث اور مرزا جانجاناں مظہر نے اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں۔ اور یہ خیالات عقیدتمندانہ تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار نہیں دیا۔ علمی حلقوں میں یہ دعوٰے سب سے پہلے، آج سے تیس سال قبل، مولینا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ اُنہوں نے تذکرہ میں لکھا:۔

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کہ ان کی (یعنی حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کی) تجدید، محض ردِ بدعات جہال صوفیہ، و تحقیق بعض معارفِ تصوف، و اعلان و اشتہار توحید شہودی میں منحصر ہے۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔"

اور پھر آگے چل کر "مفاسدِ وقت کی اصلاح و تجدید" کے سلسلے میں حضرت مجدد کے کارنامے اس جوش و ولولے سے بیان کئے۔ کہ خاص و عام کو یقین آگیا۔

کہ عہدِ اکبری کی بدعات کے قاطع حضرت مجدّد ہی ہیں!

اس کے بعد کسی مورخ نے اس مسئلے پر محققانہ نظر نہیں ڈالی۔ اور چونکہ اقبال کے فلسفہ اور ہماری روحانی زندگی کے موجودہ رجحانات کی وجہ سے، تمام وہ حضرات، جنہوں نے اخلاقی جرأت اور جلالی شان دکھائی، خاص و عام میں مقبول ہیں۔ اس لئے مولٰینا ابوالکلام آزاد کے نقطۂ نظر کی بڑی خوشی سے پیروی ہوئی۔ اور آج عوام الناس ہی نہیں، بلکہ اہلِ علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع حضرت مجدّد کو قرار دیتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں مولٰینا ابوالکلام آزاد کی رائے جس ادب و احترام کی مستحق ہے۔ ظاہر ہے لیکن کئی قوی قیاسات اور شواہد ایسے ہیں۔ جن کی بنا پر ہمارا خیال ہے۔ کہ حضرت مجدّد کے متعلق ان کا دعوےٰ محل نظر ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت شاہ ولی اللہ یا شیخ عبدالحق محدث یا شیخ نورالحق جو حضرت مجدّد کے ہمعصر یا قریب العہد تھے وہ حضرت مجدّد کو اکبری الحاد کا قاطع نہیں کہتے۔ وہ حضرت سرہندی کی دوسری خوبیوں اور کارناموں کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا امر، جو اگر امرِ واقعی ہو، تو حضرت سرہندی کی دوسری سب خوبیوں سے اہم ہوگا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت مجدّد کے رسالہ ردِّ روافض کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کے شروع میں عہدِ اکبری کے مذہبی رجحانات پر تبصرہ ہے۔ اور حضرت مجدّد کے تمام احسانات و کارنامے ایک ایک کر کے تفصیل سے

گنائے گئے ہیں۔ اس بحث میں شاہ صاحب نے رسالہ اثبات النبوت اور ان مکتوبات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر معتقدین، حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار دیتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے ان چیزوں کی جتنی اہمیت تھی۔ وہ بتادی ہے نہ زیادہ۔ نہ کم۔ اور حضرت مجدد کے تمام کارنامے گنانے کے باوجود کہیں یہ نہیں کہا۔ کہ انہوں نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا۔

اگر حضرت مجدد نے واقعی اکبر کی بدمذہبی کا ازالہ کیا۔ تو کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ یہ سب بزرگ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ آخر انہیں آج کے علما کی نسبت واقعات کو جاننے کا زیادہ موقع تھا!

لیکن لطف یہ ہے۔ کہ نہ صرف کوئی ہمعصر یا قریب العہد مستند عالم، حضرت مجدد کے اس تجدیدی کارنامے کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے زمانہ کے بہترین اور پاکیزہ ترین علما ان کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث کے اکبری بدمذہبی کی نسبت جو خیالات ہوں گے۔ ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ان کا تھوڑا بہت اظہار انہوں نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ بدایونی لکھتا ہے۔ کہ فیضی ان کا بڑا قدردان تھا۔ لیکن وہ اس کے مذہبی خیالات سے برگشتہ ہو کر فتح پور سیکری چھوڑ گئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص اس بدمذہبی کا ازالہ کرتا۔ تو کیا شیخ عبدالحق محدث اس کے سامنے سرِ عقیدت نہ جھکاتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مکتوبات کے اندراجات کی بنا پر حضرت مجدد کے مخالفین میں پیش پیش تھے۔ اور جب تک انہیں حضرت مجدد کے خلوص اور روحانی مراتب کا یقین نہ ہو گیا۔ وہ ان کے منکر رہے۔

جہانگیر اکبر کا جانشین تھا۔ اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت جو اس کی رائے تھی۔ اس کا اندازہ اس اظہار سے ہو سکتا ہے۔ جو اس نے ابوالفضل کے متعلق کیا۔ پھر تخت نشین ہوتے ہی اس نے دینِ الٰہی اکبر شاہی کا خاتمہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اکبری الحاد کا مخالف ہوگا۔ اب اگر حضرت مجدّد نے اس الحاد کا قلع قمع کیا۔ تو کیا یہ امر عجیب نہیں۔ کہ جہانگیر نہ صرف ان کے کارناموں سے ناواقف ہے۔ اور ان کا خاص احترام نہیں کرتا۔ بلکہ اُلٹا انہیں زندانِ ادب میں ڈال دیتا ہے جہانگیر نے حضرت مجدّد کی طلبی اور قید کا واقعہ بڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ حضرت کی حراست کی ایک وجہ اُن کا غرور و تفاخر تھی۔ (یعنی اُنہوں نے سجدۂ دربار نہ کیا) اور دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ انہیں چند دن قید میں رکھنے سے، ان کے خلاف جو عوام کی شورش تھی۔ وہ تھم جائے (شورشِ عوام فرونشیند)

عوام کی اس شورش سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ معاصرین کی رائے حضرت مجدّد کے متعلق کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ کسی معاصرانہ اور مستند تاریخ یا تذکرہ میں اس امر کا ذکر نہیں۔ کہ حضرت مجدّد نے اکبری بدمذہبی کا قلع قمع کیا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ نظریہ جو تذکرہ سے اخذ کیا جاتا ہے۔ مستبعد، بلکہ ناقابلِ قبول معلوم ہوتا ہے لیکن مولانا غالباً ان مکتوبات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جن میں حضرت مجدّد نے اکابرِ عہد کو شرع کے استحکام اور مذہب کی استواری کی تلقین کی ہے۔ اس لئے واقعات کو پرکھنے کے لئے ان مکتوبات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

ان مکتوبات کی نسبت ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے۔ کہ اگر ان کی بنا پر یہ تسلیم کیا جائے۔ کہ شیخ فریدؒ خان اعظم اور دوسرے اکابر کو حضرت مجددؒ کی یاددہانی اور وعظ و تلقین کی وجہ سے، حفاظتِ مذہب کا خیال پیدا ہُوا۔ اور پھر انہوں نے اس امر کے لئے کوششیں کیں۔ تب بھی بہ نظرِ انصاف ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ وعظ و نصیحت آسان ہوتی ہے۔ اور اس پر عمل پیرائی کہیں زیادہ مشکل ہے[۱]۔ اس وعظ و نصیحت کی وجہ سے ہمیں شیخ فرید اور دوسرے اکابرِ عہد کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنی چاہیئے۔ جنہیں بادشاہ کو قائل کرنے، پُرانے طریقے بدلنے، اور شعائرِ اسلامی کے سر بلند کرنے میں جو عملی مشکلات تھیں ان کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ان مکتوبات کے بغیر ہی مُسلمان امرا کو اپنے فرض کا احساس تھا۔ بلکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ ان مکتوبات کے لکھے جانے سے پہلے ہی اصل مراحل طے ہو گئے تھے۔ اور اکبری الحاد کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

ان مکتوبات میں سے سب سے زیادہ شیخ فرید کے نام ہیں۔ ہم شیخ فرید کے حالات ذرا تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اور اس کی نسبت حضرت مجددؒ الف ثانی کے

---

[۱] حضرت مجددؒ اس اہم فرق کو خوب سمجھتے تھے۔ خان جہاں کو ایک خط میں شرع مبین کی تابعداری اور دُشمنانِ دین کی مخالفت کی تلقین کر کے لکھتے ہیں "یہی خدمت جو اب آپ کر رہے ہیں۔ اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کریں۔ تو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سا کام کریں گے۔ جس سے دین منور و معمور ہو جائیگا۔ ہم فقیر اگر سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کریں تب بھی آپ جیسے بہادروں کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتے"۔ ایسا اظہارِ خیال کئی خطوط میں ہے۔

مرشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور خود حضرت مجدّد کے جو عقیدتمندانہ خیالات تھے وہ نقل کر چکے ہیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی باانصاف انسان نہیں کہے گا۔ کہ حضرت مجددؒ کی یاددہانی کے بغیر شیخ فرید کو اپنے فرائض کا خیال نہ ہوتا!

لیکن حضرت مجدد کے مکتوبات سے ہی خود اس امر کی شہادت ملتی ہے۔ کہ وہ اُس وقت لکھے گئے۔ جب اکبر کے ساتھ دینِ الٰہی اکبرشاہی ختم ہو چکا تھا۔ جہانگیر مذہبی امور میں اکبر کا ہم خیال نہ تھا۔ جب اکبر مرا، تو اس کی تجہیز و تکفین و تدفین بطور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے ہوئی۔ ہر نگیز مشفری باکراہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اکبر ایک راسخ لعقیدہ مسلمان کی طرح مرا۔ اور جہانگیر نے تخت نشین ہونے سے پہلے اس امر کا وعدہ کیا۔ کہ وہ شعائرِ اسلامی کی پابندی کرے گا۔

یہ سب مرحلے طے ہو گئے ہیں۔ اور جہانگیر تخت نشین ہو چکا ہے۔ اس وقت حضرت مجدّد سرہند سے شیخ فرید کے نام خط لکھتے ہیں:۔

"امروز کہ نویدِ زوالِ مانع دولتِ اسلام و بشارتِ جلوسِ بادشاہ اسلام بگوشِ خاص و عام رسید۔ اہلِ اسلام برخود لازم دانستند۔ کہ ممد و معاونِ بادشاہ باشند۔ و بہ ترویج شریعت و تقویتِ ملت دلالت نمائند۔"

اس کے بعد، بادشاہوں کو علماء سو سے بچانے کی ضرورت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں (ترجمہ)

یہ فقیر بے سروسامان بھی چاہتا ہے۔ کہ اپنے آپ کو دولتِ اسلامیہ کے مددگار گروہ میں داخل کرے۔ (کہ خود را در جرگہ ممدّانِ اسلام اندازد) اور اس بارے میں کوشش کرے۔ من کثر سواد قوم فھو منھم کے موافق ہو سکتا ہے۔ کہ (آپ) اس فقیر کو ان بزرگوں کی جماعت میں داخل

کرلیں۔ فقیر اپنے آپ کو اس بڑھیا کی طرح خیال کرتا ہے۔ جو اپنا تھوڑا سا
سُوت لے کر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں
شامل ہوگئی تھی ؂"

اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جرگۂ ممدان اسلام پہلے سے موجود تھا۔ اور
حضرت مجدد اپنے مقابلے میں دوسرے اہلِ دل مسلمانوں کے کام کی قدر و قیمت
بھی سمجھتے تھے۔

حضرت مجدد کے دل میں اسلام کا درد تھا۔ اور ترویجِ شریعت اور اسلام
کی پُرجوش خواہش۔ اس لئے جہاں ذرا بھی گنجائش ہوتی۔ وہ اس کا اظہار بڑے
زور اور ولولے سے کرتے لیکن ان کے مکتوبات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے
سے خیال ہوتا ہے۔ کہ ان کے بعض خطوط، کسی معمولی مقصد مثلاً کسی حاجتمند
کی سفارش کے لئے لکھے گئے۔ لیکن چونکہ انہیں عروجِ اسلام کی خواہش ہر وقت
دامنگیر رہتی تھی۔ اس لئے اس کا بھی ساتھ ساتھ اظہار ہو گیا۔ مثلاً مکتوباتِ
جلد اوّل میں ایک مکتوب (شمارہ ۱۹۵) صدر جہاں کے نام "شریعت کی ترقی
پر ترغیب دینے اور اسلام اور اہلِ اسلام کی کمزوری پر افسوس ظاہر کرنے کے
بیان میں" ہے۔ اس میں بڑے زور اور جوش سے امورِ شرعی کی کمزوری پر آنسو
بہائے ہیں۔ اور یہ شعر درج کیا ہے ؂

آنچہ از من گمشدہ، گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

لیکن جس مقصد کے لئے یہ خط لکھا گیا۔ اس کا اندازہ اس اندراج سے ہوتا ہے۔

جو اس شعر کے فوراً بعد آتا ہے۔ (ترجمہ)

اسلامی شعائر میں سے ایک نشان اسلامی شہروں میں قاضیوں کا مقرر کرنا ہے۔ جو گذشتہ زمانہ میں محو ہو گیا تھا۔ سرہند میں جو اسلام کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ کئی سال سے کوئی قاضی نہیں ... حامل رقعہ ہذا قاضی یوسف کے باپ دادا، جب سے سرہند آباد ہوا ہے۔ قاضی ہوتے آئے ہیں .... اگر بہتر سمجھیں۔ تو اس عظیم الشان کام کو اس کے حوالہ فرمائیں۔"

غالباً اسی موقعہ پہ ایک خط، شیخ فرید کے نام گیا تھا:۔ (ترجمہ)

"مدت گزری ہے۔ کہ سرہند میں کوئی قاضی نہیں۔ اور بعض احکام شرعیہ کے جاری کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ مثلاً ہمارا ایک بھتیجا یتیم ہے۔ اس کے باپ کی کچھ میراث باقی ہے اور اس کا کوئی وصی نہیں۔ اور ہم شرعی حکم کے بغیر اس کے مال میں تصرف نہیں کر سکتے۔ اگر قاضی ہو تو اس کے حکم کے بموجب کام آسان ہو جائے۔"

امراء و اکابر کے نام حضرت مجدد کے خطوط، بغور دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید آپ کی ان سب سے باقاعدہ خط و کتابت نہ تھی۔ اور یہ مکتوبات ہمیشہ کسی خط کے جواب میں نہ جاتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات کوئی حاجتمند آپ کے پاس سفارش کے لئے آتا۔ تو آپ سفارشی خط کو ہی تلقین و ہدایت کا ذریعہ بنا لیتے۔ یا کبھی کبھی مکتوب الیہ کو اپنی یاد دلانے یا اظہارِ محبت کے لئے یہ وعظ و نصیحت کے خط لکھے جاتے۔ آپ کا ایک مشہور خط خانِ اعظم کے نام ہے۔ جس میں کفر کی

عزت اور اسلام کے ضعف اور مسلمانوں کی خواری پر افسوس کیا ہے ؎

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمۂ ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

اس کے آخر میں تحریر خط کی یہ وجہ بتاتے ہیں۔ "فقیر کسی تقریب پر یہاں آیا تھا۔ یہ نہ چاہا۔ کہ اپنے آنے کی نسبت آپ کو اطلاع نہ دے۔ اور بعض فائدہ مند باتوں کو نہ لکھے۔ اور اپنی دلی محبت سے، جو طبعی مناسبت کے سبب ہے۔ آپکو آگاہ نہ کرے"

اس وعظ و نصیحت کا خواہ وہ ضمنی اور اتفاقی ہی کیوں نہ ہو۔ امراء اکابر پر بڑا نیک اثر ہوتا ہوگا۔ اور جب مکتوبات کے مجموعے، نقل ہوکر عوام تک پہنچ گئے۔ تو اس ارشاد و ہدائت سے خاص و عام فیض یاب ہوتے ہوں گے۔ لیکن مناسب ہے۔ کہ ان خطوط کی ادبی شان اور ان کے اسلامی جوش سے متاثر ہوکر، ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دیں۔ اور ان سے کوئی ایسا نتیجہ نہ اخذ کریں۔ جس کا حضرت مجددؒ نے دعوےٰ نہیں کیا۔ جس کی تائید معاصرانہ تواریخ سے نہیں ہوتی۔ اور جسے شاہ ولی اللہؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ جیسے واقف کار بزرگوں نے قبول نہ کیا۔

حضرت مجددؒ کی مذہبی خدمات

ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ اکبری الحاد کے خاتمے میں اُس زمانے کے مسلمان امرا کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اور ان مسلمان امرا کو حضرت مجددؒ جس طرح ترویج شریعت پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ اس کا ذکر بھی ہم کر چکے ہیں۔

لیکن حضرت مجدّد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے بااثر طبقے کو اپنے فرائض یاد دلانے اور امرا کے خیالات کی اصلاح تک محدُود نہ تھیں۔ اُنھوں نے عامتہ المسلمین بلکہ جمہُور علما اور صوفیہ کے خیالات کی بھی اصلاح کی! اور اسمیں کوئی شک نہیں۔ کہ عہدِ اکبری کی مذہبی بے قاعدگیوں کے خلاف جو ردِّ عمل ہُوا۔ اور شرع و دین نے جو بتدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا۔ اُسے حضرت مجدّد کی ذاتِ والاصفات سے بڑی تقویت ملی۔

حضرت مجدّد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اُس سلسلۂ تصوّف کی اشاعت کی۔ جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے۔ ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوّف کا رنگ اس قدر چڑھا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا۔ کہ کسی سلسلے میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی بڑی خدمت اسی میں تھی۔ کہ ایک ایسے صُوفیانہ سلسلے کو ترقی دی جائے۔ جو بعض دوسرے سلسلوں کی طرح شرع سے آزاد نہ ہو۔ حضرت مجدد نے یہی کیا۔ اور ہندوستان کے مشہُور اور پُرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی۔ جس کی پیروی شرع اسلام کی پیروی ہے۔

کہتے ہیں کہ "اس طریقے کے تمامی اصل اور فروع میں اتبّاع سنّتِ سُنّیہ اور اجتنابِ بدعت نامرضیہ بدرجہ کمال ہے۔ یعنی صحابہ کبار کا سا لباس مشروط ہے۔ انھی کی معاشرت۔ ویسے ہی اذکار و اشغال۔ وہی محاسبۂ نفسی اور

ہر دم کی حضوری۔ وہی آدابِ شیخ۔ ویسے ہی کم ریاضتی اور فیضانِ کثیر۔ اور کمالاتِ ولائت کے علاوہ کمالاتِ نبوت کی بھی تعلیم ہے۔ نہ اس میں چلہ کشی کی ضرورت ہے۔ نہ ذکر بالجہر کی اجازت۔ نہ سماع بالمزامیر ہے۔ نہ قبور پر روشنی۔ نہ غلاف و چادر اندازی۔ نہ ہجوم عورات۔ نہ سجدۂ تعظیمی۔ نہ سر کا جھکانا۔ نہ بوسہ دینا۔ نہ توحیدِ وجودی نہ دعوئے انا الحق۔ نہ مریدوں کو پیروں کی قدمبوسی کا حکم۔ نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی"۔

اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا صحیح سلسلہ اختیار کیا۔ اور اسے ترقی دی۔ بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ چنانچہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے۔ اور صحابۂ کرام کو تمام اولیا سے بہتر مانتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ حال تابع شریعت ہے۔ نہ شریعت تابع احوال۔ اور کہتے تھے (ترجمہ) کہ بعض درویشانِ خام پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ وہ شریعت کی مخالفت کی جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت وہ چیز ہے۔ کہ اگر حضرت عیسٰےؑ اور موسٰےؑ ہمارے پیغمبر صلعم کے بعد ہوتے۔ تو وہ اس شریعت کے تابع ہوتے۔ جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجمانیاں ہوتی ہیں۔ تو اپنے مکتوبات میں ان کی تشریح اور تاویل کر کے انہیں شرع کے عین مطابق ثابت کیا۔ مشائخ متاخرین نے بعض خلافِ شرع امور کو روا رکھا۔ آپ فرماتے تھے۔ کہ وہ لازم الاتبلع نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ آپ ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ جنہوں نے

شریعت کی حمایت کی۔ اور نزاعی مسائل کی تہ کو پہنچکر شریعت اور طریقت کے اختلافات کو مٹانا چاہا۔ "اخبار الاخیار" کے تتمے میں لکھا ہے:۔

"نزاعے کہ درمیان صوفیاء کرام و علماء اعلام از ہزار سال بود۔ ایشاں برداشتند۔ و مورد حدیث صلہ شدند۔ چہ ایشاں درمیاں علماء و صوفیاء صلہ بودند۔ کہ اختلاف فریقین را در وحدت الوجود بلفظ راجع داشتہ اند"

آپ نے عقیدۂ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کی۔ اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علما کے اختلافات رفع کر دیئے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی منزل میں سرگرداں رہے تھے۔ (ملاحظہ ہو دفتر اول۔ مکتوب ۳۱) لیکن عالم اور محب شرع ہونے کی وجہ سے اس اختلاف سے بھی واقف تھے۔ جو وحدت الوجود کی بعض ترجمانیوں سے شرع کو تھا۔ جن دنوں حضرت خواجہ باقی باللہ کی زندگی میں آپ لاہور گئے تھے۔ وہاں کے ایک عالم مولینا جمال تلوی نے آپ سے استدعا کی تھی۔ کہ آپ شریعت اور طریقت کے جامع ہیں۔ ذرا وحدت الوجود کی گتھی تو سلجھا دیں۔ "شما امروز جامع اید میانِ علمِ احکام و علمِ اسرار ..... مسئلۂ وحدتِ وجود کہ بہ ظاہر بہ شرع چنداں موافقت ندارد۔ و بسیارے از اکمل اولیا برآں اند حل آں نزدِ شما چیست" اس وقت تو آپ نے مولینا جمال کے کان میں کچھ ایسی بات کہی کہ اُن کی حالت متغیر ہو گئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ الجھن آپ کو کھٹکتی رہی۔ اور آپ نے مکتوبات میں اس گتھی کو سلجھایا۔ آپ کا قول ہے کہ مقامِ وحدت الوجود سالک کو ابتداء سلوک میں پیش آتا ہے۔ جس سے اسے گزر جانا چاہیئے۔ اور

جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے۔ اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے۔ جو شرع کے عین مطابق ہے۔

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام ردِّ بدعت تھا اس زمانے میں شیعہ مذہب ایران اور مشرقی عراق میں عام ہو گیا تھا ہندستان میں بھی شاہ جہانگیر کی مقبولِ نظر ملکہ شیعہ تھی۔ بادشاہ کا وزیر شیعہ تھا۔ اور شیعہ عقائد ملک میں شروع ہو گئے تھے۔ جب ایران میں شیعہ عقائد عام ہوئے تھے تو مذہبی اختلافات کی وجہ سے ملک میں طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے۔ اور علماءِ اہلِ سنت پر بڑی سختیاں ہوئی تھیں۔ شیخ مجدّدؒ نے اس خطرے کو محسوس کر کے اس کی مدافعت کی کوشش کی۔ ردِّ روافض کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مکتوبات میں نئے فرقے کی مخالفت کی۔ اور خود جہاں جاتے۔ یا جہاں ان کے خلفاء اور مرید جاتے۔ اس فرقے کے عقائد کی مخالفت کرتے یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کے مزاج میں نور جہاں اور آصف خان کو بہت دخل ہونے کے باوجود شیعہ عقائد ہندوستان میں بہت عام نہ ہو سکے۔

شرع کی ترویج۔ طریقۂ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت و طریقت کی تطبیق اور شیعیت کی مخالفت کے علاوہ حضرت مجدّد نے جو اہم کام کیا۔ وہ اسلام کا عام احیا تھا۔ اکبر۔ ابو الفضل اور فیضی کے زیرِ اثر کئی لوگ اس خیال کے قائل ہو گئے تھے۔ کہ توحید کو ماننے کے لئے رسالت کی ضرورت نہیں۔ ابطالِ نبوت پر کتابیں بھی لکھی گئیں۔ آپ نے ان ملحدانہ خیالات کی مخالفت کی۔ ان لوگوں سے مناظرے کئے۔ اثبات النبوت کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔

جس میں "ابوالفضل وغیرہ دہریہ اور اکثر ملحدین کے اقوال کا رد کرکے آنحضرت صلعم کی نبوت کو بدلائل عقلیہ ونقلیہ نہایت شرح وبسط سے ثابت کیا ہے"۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانے میں جب عام علما و مشائخ نے ایک گوشے میں بیٹھ جانا ہی سلامتی کا راستہ سمجھ رکھا تھا۔ آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کرکے قید وبند کی سختیاں جھیلیں۔ اور اپنی جرأت اور اتباعِ شرع سے مغلوں کے خلافِ شرع احکام کا سدِ باب کیا۔ آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو جرأت دلائی۔ جو دبے بیٹھے تھے۔ وہ پھر دلیر ہو گئے۔ اور شرع کے احکام ایک دفعہ پھر ہندوستان میں عام ہونے لگے[1]۔

حضرت مجدد نے خود احیاء اسلام کی کوشش کی۔ اور اس کے علاوہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا۔ جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدہا خلفا تھے۔ جو ہندوستان کے کونے کونے ہیں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی

---

[1] لیکن نقشبندی تذکرہ نگاروں کا یہ خیال، کہ جہانگیر حضرت کا مرید ہو گیا تھا۔ اور اس نے آپ کے حسبُ الحکم تمام شرعی احکام جاری کرائے۔ قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا۔ ان مکتوبات سے جو آخری سالوں میں لکھے گئے۔ یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ حضرت اس زمانے کے حالات سے بھی مایوس تھے۔ اور شائد سمجھتے تھے۔ کہ ظہورِ قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ ایک خط میں صاحبزادگان کو لکھتے ہیں۔ "قیامت قریب ہے۔ اور ظلمتوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ کہاں خیریت اور کہاں نورانیت شائد حضرت مہدی علیہ الرضوان خلافت ظاہری کی تائید پاکر اسکو رواج دینگے" (دفتر سوم مکتوب ۱۰۶) اسی زمانے کا ایک اور خط ہے۔ "..... یہی باعث ہے۔ کہ ہزار سال کے بعد اندھیرا غالب آگیا ہے۔ اور سنت و اسلام کا نور ماند پڑ گیا ہے" (دفتر سوم مکتوب ۹۶)

آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزندانِ ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ اورنگ زیب آپ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم کا مرید ہو گیا تھا۔ آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے۔ اور نقشبندیہ و مجددیہ سلسلے کے لوگ اتباعِ شریعت اور ترویجِ سنت میں باقی تمام سلسلوں سے آگے ہیں۔

ان خدمتِ اسلامی کی وجہ سے آپ کو "مجدد" کہا جاتا ہے۔ اور جو لوگ کسی مجدد کے قائل نہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ مجددیت کے مشکوک نظریئے میں قوم کیلئے خطرے ہیں۔ وہ بھی آپ کا ادب کرتے ہیں۔ چنانچہ امام الہند شاہ ولی اللہ صاحب کلماتِ طیبہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"شیخ مجدد ارہاص[1] این دورہ اند۔ و لبسا معارف مختصۂ این دورہ کہ از زبانِ شیخ بطریقِ رمز و ایما سر زدہ، و شیخ قطب ارشادِ این دورہ است۔ و بردستِ وے بسیارے از گمراہانِ بادیۂ طبیعت و بدعت خلاص شدہ اند"

علامہ اقبال بالِ جبریل میں لکھتے ہیں ؎

حاضر ہُوا میں شیخ مجدد کی لحد پر	وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے	اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے	جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں	اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

---

[1] "ارہاص" سے مراد یہاں راہ صاف کرنے والا ہے۔ مثلاً ہمیں عمارت بنانا ہے۔ تو زمین میں جس قدر نشیب و فراز ہیں۔ ان کو ہموار کرنا ارہاص کا درجہ رکھتا ہے۔ عمارت بعد میں کوئی دوسرا شخص آکر بنائے گا۔"

معترضین کے اعتراضات

حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی اور علمی خدمات مسلمہ ہیں۔ لیکن یہ ایک قابلِ ذکر امر ہے۔ کہ ان کے مخالفوں اور نکتہ چینوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اور ان میں بڑے بڑے متقی، پرہیزگار اور قابلِ عزت بزرگ شامل ہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں ہی مکتوبات کی وجہ سے علمائنے ان کے خلاف جہانگیر کے پاس شکائت کی تھی۔ اُس وقت ان کے معترضوں میں شیخ عبدالحق محدث جیسے فاضل روزگار تھے۔ حضرت شیخ محدث نے بعد میں اپنے خیالات سے رجوع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ ان کے بعد بھی کئی اور بزرگوں نے مکتوبات کے اندراجات اور مجددی بزرگوں کے دعاوی پر اعتراض کئے ہیں۔ اور حضرت مجدد کے مشہور معتقدوں نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے کئی خطوط ان شبہات کے ازالہ کے لئے لکھے گئے۔ اور شاہ ولی اللہؒ کا ایک اہم خط بھی جو انہوں نے اپنے ایک عزیز ارادتمند خواجہ محمد امین کی تشفی کے لئے لکھا۔ اسی مسئلے کے متعلق ہے۔

صوفیہ کا اختلاف تو ایک حد تک حضرت کے نظریۂ وحدت الشہود کی وجہ سے ہے۔ جس کی مدد سے آپ نے ابن العربی کے نظریۂ وحدت الوجود کو اسلامی عقائد سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ لیکن علما کو زیادہ اعتراض ان دعووں پر ہے۔ جو حضرت سرہندی اپنی ذات کے متعلق کیا کرتے تھے۔ ہم مکتوب یازدہم کی اس عبارت کو نقل کر چکے ہیں۔ جس کی بنا پر عہدِ جہانگیری میں شور و غوغا بلند ہوا تھا۔ اور جس کی تشریح و توضیح حضرت سرہندی نے کئی جگہ

کی ہے۔ لیکن معترضین اس عبارت کے علاوہ اور بھی کئی اندراجات کی شکائت کرتے ہیں۔ خواجہ محمدؒ امین نے مکتوبات کی اس عبارت کی توضیح چاہی تھی جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ (استغفر اللہ) رسولِ اکرمؐ اپنی وفات سے ایک ہزار سال بعد ایک فرد امت (حضرت مجدّد) کی وجہ سے مقامِ خلیلی سے مستجاب ہوئے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"برادرِ عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالیٰ بشہودہ۔ سوال کردہ بودند۔ کہ حضرت شیخ مجدّد قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز در مکتوب نود و چہارم از جلد ثالث و غیر آں نیز تصریح کردہ اند۔ بآنکہ آنحضرت را صلی علیہ وسلم را بعد ہزار سال بواسطہ بعض افراد امت مقامِ خلت حاصل شد۔ و دعائے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ مستجاب گشت۔ و باشارہ مفہوم میگردد کہ مراد ازاں فردِ ذاتِ حضرت مجدّد است۔ و ایں مقدمہ بظاہر موردِ اشکالات کثیرہ است۔ ازاں جملہ آنکہ توسط فردے از افراد امت در حصولِ مقام خلت کہ از اعلےٰ مقامات است مستلزم فضل او بر ذاتِ حضرت خاتم الانبیاست علیہ الصلوٰت و التسلیمات"۔

حضرت مجدّد نے اس خیال کا اظہار تیسری جلد میں ہی نہیں بلکہ دوسری جلد کے چھٹے مکتوب میں بھی کیا تھا۔ اور ان کی زندگی میں ہی پڑھنے والوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ ان کے مشہور خلیفہ اور سوانح نگار خواجہ ہاشم کشمی نے اس کی توضیح چاہی تھی۔ اور اسی جلد کے ستانویں ۹۷ مکتوب میں حضرت مجدد نے جواب لکھا تھا۔ "آپ نے پوچھا تھا۔ کہ اس عبارت کے کیا معنی ہیں۔ جو چھٹے

مکتوب میں واقع ہے۔ کہ مَیں خیال کرتا ہوں۔ کہ میری پیدائش سے مقصود یہ ہے۔ کہ ولائت محمّدی صلے علیہ وسلم، ولائت ابراہیمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رنگ میں رنگی جائے۔ اور ولائت محمّدی کا حُسنِ ملاحت، ولائت ابراہیمی کے جمالِ صباحت کے ساتھ مل جائے۔ اور اس انصباغ و امتزاج سے محبوبیت محمّدیہ کا مقام درجۂ بلند تک پہنچ جائے"۔ اپنے دعوے کے جواز میں حضرت مجدّدؒ نے کہا تھا۔" وہ انتفاع و استفادہ جو صاحب دولتوں کو غلاموں اور خادموں کی جہت سے میسّر ہوتا ہے۔ کوئی ممنوع و مخدور نہیں۔ اور نہ ہی اس میں ان کا کسی قسم کا قصور و نقصان ہے۔ بلکہ صاحب دولتوں کا کمال غلاموں اور خادموں کی خدمت ہی میں ہے"۔ شاہ ولی اللہؒ نے زیادہ ملائم اور قابلِ فہم طریقے سے اس کی تاویل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"غرضِ شیخ اثبات اصل خلّت است آنحضرت را صلی اللہ علیہ وسلم در اوّل امر بغیر توسط و اثبات توسط خود در فیضان خلّت بر بنی آدم بآں معنی کہ بتوسط او بعد ہزار سال مردمان حصہ ازاں خلّت یابند"۔

اس طرح کے اور کئی اندراجات، حضرت مجدّد کی تصانیف اور سوانح میں ملتے ہیں۔ جنہیں بغیر تشریح و تاویل کے قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً روضۃ القیومیہ میں سالِ اوّل تجدید الف ثانی کے ضمن میں لکھا ہے۔ (ترجمہ)

"حضرت قیوم اول رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ کعبہ کی زیارت کا شوق رہا۔ لیکن بعض موانعات کی وجہ سے زیارتِ کعبہ میسّر نہ ہو سکی۔ اس سال وہ شوق بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ آنجناب اسی شوق میں بے قرار رہنے لگے۔

ایک روز اسی بے قراری کی حالت میں بیٹھے تھے۔ کہ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ انسان۔ فرشتے۔ جن وغیرہ تمام مخلوقات نماز ادا کر رہی ہے۔ اور آنجناب کی طرف رُخ کر کے سجدہ کر رہی ہے۔ جب آنجنابؒ نے توجہ کی۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ کعبہ معظمہ خود آنجناب کی ملاقات کے لئے آیا ہے۔ اور آپ کو گھیر لیا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ جو شخص کعبہ کی طرف سجدہ کرتا تھا۔ وہ آپ کو ہی کرتا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں الہام ہُوا۔ کہ تم ہمیشہ کعبہ کے مشتاق تھے۔ ہم نے کعبہ کو تمہاری زیارت کے لئے بھیجا ہے۔ تمہاری خانقاہ کی زمین بھی کعبہ کا حکم رکھتی ہے۔ جو نُور کعبہ میں تھا۔ وُہی نُور ہم نے تمہاری خانقاہ کی زمین میں رکھدیا ہے۔ بعد ازاں کعبہ نے آنحضرتؒ کی خانقاہ میں حلول کیا۔ اور خانقاہ کی زمین کعبہ کی زمین سے مل گئی۔ اور اس مسجد کو بیت اللہ کی زمین سے پُوری پُوری فنا و بقا حاصل ہُوئی۔ اور آنجناب کی خانقاہ کی زمین میں تمام حقائق کعبہ منتقل ہو گئے۔ فرشتہ غیب نے آواز دی۔ کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کی یہ مسجد تمام مسجدوں سے افضل ہے۔ جو ثواب ان تمام مسجدوں میں نماز ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے"۔

معترضین جب اس طرح کے اندراجات پڑھتے ہیں۔ تو بدظن ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کہ یہ بڑے بڑے دعوے جاہلوں کو بہکانے کے لئے ہیں۔ چنانچہ جہانگیر نے بھی شروع میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھے کہ جس بزرگ کی نیت اور دیانتداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔ وہ کسقدر بلند مرتبہ ہے۔

اور جھوٹے دعووں اور ریاکاری سے کتنا دور ہے۔

حضرت مجدد سے بعض باتوں میں اختلاف کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ان کے مخالف کو بھی ان کی راست گفتاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بعض بیان کردہ واقعات، عجیب اور قابلِ اعتراض ہیں۔ لیکن وہ ضرور ان سے دوچار ہوئے ہونگے۔ انہوں نے جس راست گفتاری سے اور بغیر کسی حجاب اور تصنع کے اپنے تجربے اور مشاہدے مکتوبات میں بیان کئے ہیں۔ اس کا اندازہ پہلے ہی مکتوب سے ہوسکتا ہے۔ جس میں کہا ہے :-

"در اثنائے راہ آں قدر تجلے اسم الظاہر گشت کہ در جمیع اشیاء بر تجلیِ خاص علیحدہ علیحدہ ظاہر گشت۔ علے الخصوص در کسوت النساء بلکہ در اجزائے اینہمہ جُدا جدا۔ وآنقدر منقادِ ایں طائفہ گشتم۔ کہ چہ عرض نمایم۔ دریں انقیاد مضطر بودم۔ ظہوریکہ دریں کسوت بود در ہیچ جا نبودہ۔ خصوصیاتِ لطائف ومحسناتِ عجائب کہ دریں لباس مے نمود۔ از ہیچ مظہرے نشدہ۔ پیش ازیں تمام گداختہ آب شدہ مے رفتم۔ وہمچنیں در ہر طعامے وشرابے وکسوتے جُدا جُدا متجلی شد لطافتے وحُسنے کہ در طعام لذیذ پر تکلف بُود۔ در ماورائے آں نبود"۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ صوفیوں کے احوال ومقامات کا عجیب معاملہ ہے۔ یہ بزرگ صبح شام ان خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔ جن سے عوام کو برائے نام دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ غذا فقط اتنی کھاتے ہیں۔ جس سے جان سلامت رہے۔ زیادہ وقت تنہائی وخلوت اور ذکر وفکر میں گزرتا ہے۔ مراقبے اور دوسرے اشغال ان کے

اتنے بڑے سخت ہوتے ہیں۔ کہ دل ودماغ پر ایک خاص رنگ غالب آجاتا ہے۔ نفسیات کا اصول ہے۔ کہ جو دُھن سر پہ سوار ہو۔ وہی عالمِ خواب یا عالمِ انجذاب میں نظر آجاتی ہے۔ چنانچہ انہیں بھی سُکر و بیخودی یا واقعات کے عالم میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں۔ کہ عوام، جن کی دُنیا ہی ان سے مختلف ہوتی ہے۔ سمجھ نہیں سکتے۔ اور معترض ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے انکار کرنا، جب تک کہ صاحب احوال ہی اس انکار کا مستحق ہو صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے۔ کہ تمام سمجھدار صوفیہ ان احوال کو، جو عالمِ خواب، یا عالمِ استغراق میں نظر آئیں اہمیت نہیں دیتے۔ اور جو احوال شرع اور عقل کے موافق نہ ہوں انہیں فاسد سمجھتے ہیں۔

مرشد کو ان احوال کا من وعن بتانا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے۔ کہ مرید کے دل ودماغ پر کونسا رنگ غالب ہے اور اسکے تحت الشعور کا کیا حال ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ان کا کوئی فائدہ نہیں۔

حضرت مجددؒ بھی اس نکتے سے خوب واقف تھے۔ اور اُنہوں نے کئی خطوط میں ان احوال پر بھروسہ نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ایک خط (جلد اوّل شمارہ ۲۰۷) میں مرزا حسام الدین کو لکھتے ہیں:۔

"صوفیوں کی بیہودہ باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے احوال سے کیا بڑھتا ہے۔ "وہاں" وجد و حال جب تک شرع کی میزان پر نہ تولیں نیم جیتل سے نہیں خریدتے۔ اور کشف اور الہاموں کو جب تک کتاب وسنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں۔ نیم جو کے برابر بھی، پسند نہیں کرتے"۔

شیخ حمید بنگالی کے نام ایک خط (جلد اول ۲۲۱) میں تفصیل سے ان غلط فہمیوں

تشریح و اصلاح کی کوشش کی ہے۔ جو مقاماتِ عروج میں اپنی فضیلت کے متعلق پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس میں وہ اپنی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ میں "توبہ و استغفار و انابت سے التجا کرتا تھا۔ اور عاجزی و زاری سے دُعا کرتا تھا۔ کہ اس قسم کے کشف ظاہر نہ ہوں۔ اور اہلِ سنت و جماعت کے معتقدات کے خلاف سر مو منکشف نہ ہو" حضرت مجدّد اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ کہ اگر احوال اور غیر معمولی نفسیاتی مشاہدات کو اہمیّت دی جائے۔ تو چونکہ ہر ایک انسان کے مشاہدات مختلف ہوتے ہیں۔ اور بالعموم اپنے خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک اپنے ہی مشاہدات کو حق مانے گا۔ اور شرع اور سنت کی پیروی کی ضرورت نہ سمجھے گا۔ جس سے روحانی اور مذہبی معاملات میں بڑی بدنظمی پیدا ہو گی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کے اپنے مکتوبات میں ہی ملتی ہے (جلد اوّل شمارہ ۲۷۳) ان کے نامور خلیفہ میر محمد نعمان اور بعض دوسرے بزرگوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ کہ رسول اکرم مجلسِ مولود خوانی کے انعقاد سے خوش ہیں۔ چنانچہ وہ انہیں ترک کرنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت مجدد اس بارے میں مرزا حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں:۔

"آپ نے لکھا تھا کہ اگر سماع کے منع ہونے کا مبالغہ مولود کے منع ہونے کو بھی شامل ہے۔ جو نعتیہ قصیدوں اور غیر نعتیہ شعروں کے پڑھنے سے مراد ہے تو برادر عزیز میر محمد نعمان اور بعض اس جگہ کے یار جنہوں نے واقعہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھا ہے۔ کہ اس مجلسِ مولود خوانی سے بہت خوش ہیں۔ ان پر مولود کا نہ سُننا اور ترک کرنا بہت مشکل ہے۔

میرے مخدوم!!! اگر واقعات کا کچھ اعتبار ہوتا۔ اور منامات اور خوابوں کا

کچھ بھروسہ ہوتا۔ تو مریدوں کو پیروں کی حاجت نہ رہتی۔ اور طریق میں سے
کسی ایک طریق کا لازم پکڑنا عبث معلوم ہوتا۔ کیونکہ ہر ایک مرید اپنے
واقعات کے موافق عمل کر لیتا۔ اور اپنی خوابوں کے مطابق زندگی بسر
کر لیتا..... اس تقدیر پر سلسلۂ پیری و مریدی درہم برہم ہو جاتا۔ اور
ہر بوالہوس اپنی وضع پر مستقل و برقرار ہو جاتا۔"

یہ خیال کرنے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں۔ کہ جن احوال و مقامات کا ذکر حضرت مجدّد
کے مکتوبات میں ہے۔ وہ انہیں پیش نہ آئے تھے۔ جو شخص ٹھنڈے دل سے
ان کی تصانیف اور حالات پر نظر کرے گا۔ وہ ان کی بزرگی، علم و فضل اور صاف گوئی
کا قائل ہو جائے گا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ جب شیخ عبدالحق محدّث کو حضرت مجدد سے
زیادہ واقفیت ہوئی۔ تو وہ اُن کے معتقد ہو گئے لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ ان
مقامات کو بڑی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ حضرت مجدّد کی بزرگی ان کے کاموں
میں، ان کی تعلیمات میں، اور ان کی بلند پایہ تصانیف میں ہے۔ اُن مقامات
اور احوال میں نہیں۔ جن پر وہ خود اعتماد نہ کرتے تھے۔ اور اعتماد نہ کرنے کی
تلقین کرتے تھے۔ افسوس ہے۔ کہ ان کے عقیدت مندوں نے بالعموم یہ
نکتہ نہیں سمجھا۔ ان کی تعلیمات کو ترتیب دے کر پوری طرح سمجھنے کی کوشش
نہیں ہوئی۔ زیادہ توجہ ان کے مقامات و احوال پر رہی ہے۔ اور خود بھی ماشاءاللہ
مجدّدیوں نے اپنی طرف سے ایسے واقعات کا اشتہار دیا ہے کہ عقل حیران ہوتی
ہے۔ اور خیال آتا ہے۔ کہ اگر ان بزرگوں نے پرانے صوفیوں کی بعض غلطیوں کی
اصلاح کی ہے۔ تو کیا انہوں نے مبتدیوں کو الجھانے کا اس سے زیادہ سامان

تو پیدا انہیں کر دیا!

احوال و مقامات پر بھروسا رکھنے سے انسان جن خام خیالیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے۔ جو حضرت مجدّد کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے والد کے ایک مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ کی نسبت لکھا:-

بعض نامکمل اور ادھورے سالک اپنے خواب اور واقعات پر گمان کر کے اکابر دین کی برابری کرتے ہیں۔ لیکن برابری کہاں۔ ان سے برابری کی خواہش ایک خیالِ محال ہے۔ جو محض نادانی اور خام خیالی ہے۔ بہت سے نادان از روئے جہلِ مرکب اپنے واقعات پر بھروسا کر کے خیالاتِ فاسدہ میں خود بھی مبتلا ہیں۔ اور اوروں کو گمراہ کیا ہے۔ ایسے لوگ گمراہ ہیں۔ اُنہوں نے ضائع کیا۔ کھویا۔ اور گنوایا۔ اصل تو درکنار، ابھی شاخ کے خیال تک کو نہیں پہنچے۔ محض خواب میں ہیں۔ ان کی مثال چُوہے کی سی ہے۔ جو ہلدی کی گانٹھ پر پنساری بن بیٹھتا ہے[1]

قیومیت کا نظریہ، جس کے متعلق مکتوبات امام ربانی میں کوئی واضح اندراج نہیں۔ لیکن جسے حضرت مجدّد کے بعض عقیدتمندوں نے بڑی تفصیل سے مدوّن کیا ہے۔ اسی ذہنیت کا ایک کرشمہ تھا۔ قیوم کون ہوتا ہے:-

"قیوم اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماتحت تمام اسماء و صفات شیونات اعتبارات اور اصُول ہوں۔ اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان

---

[1] روضۃ القیومیہ۔ جلد ثانی۔

وحوش، پرند۔ نبات۔ ہر ذی رُوح۔ پتھر۔ درخت۔ بر و بحر کی ہر شے۔ عرش۔ کرسی۔ لوح۔ قلم۔ ستارہ۔ ثوابت۔ سُورج۔ چاند۔ آسمان۔ بروج سب اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک و بروج کی حرکت و سکون۔ سمندروں کی لہروں کی حرکت۔ درختوں کے پتوں کا ہلنا۔ بارش کے قطروں کا گرنا۔ پھلوں کا پکنا۔ پرندوں کا چہچہانا۔ دِن رات کا پیدا ہونا۔ اور گردش کنندہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع بغیر گرتا ہو زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی۔ کوئی دن۔ کوئی ہفتہ۔ کوئی مہینہ۔ کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے۔ غلّہ کی پیدائش۔ نباتات کا اُگنا۔ غرضیکہ جو جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اسکی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔

رُوئے زمین پر جس قدر زاہد۔ عابد۔ ابرار اور مقرب، تسبیح۔ ذکر۔ فکر۔ تقدیس اور تنزیہ میں، عبادت گاہوں۔ جھونپڑوں۔ کٹیوں۔ پہاڑ اور دریا کے کنارے، زبان۔ قلب۔ رُوح۔ سر خفی۔ اخفیٰ اور نفسی سے شاغل اور معتکف ہیں۔ اور حق طلبی کی راہ میں مشغول ہیں۔ سب اسی کی مرضی سے مشغول ہیں۔ گو انہیں اس بات کا علم ہو یا نہ ہو۔ اور جب ان کی عبادت قیوم کے ہاں قبول نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔"

حضرات مجددیہ چار بزرگوں کی قیومیت کے قائل ہیں۔ قیوم اوّل حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ قیوم ثانی خواجہ محمد معصومؒ۔ قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبندؒ۔ قیوم رابع خواجہ محمد زبیرؒ۔ لیکن عجیب بات ہے۔ کہ باوجودیکہ قیوم کو صفاتِ نبوی سے ہی نہیں صفاتِ الٰہیہ سے متصف کیا جاتا ہے۔ کوئی آیت، کوئی حدیث اس نظریے کی تائید میں پیش نہیں کی جاتی۔ عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی۔ لیکن کشف اور صوفیانہ احوال کے زور پہ یہ دعوے کیا جاتا ہے۔ اور عقیدتمند مان لیتے ہیں!

حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کرے غیر گر بُت کی پُوجا تو کافر | جو ٹھہرائے بیٹا خُدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر | کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کُشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں | اماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں | شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دُعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے!!

غیر مُسلموں کی نسبت حضرت مجددؒ کا نقطۂ نظر

حضرت مجددؒ اور ان کے جانشینوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا غیر مسلموں کے متعلق خاص نقطۂ نظر ہے۔ ان سے پہلے ہندوستان میں کسی بزرگ اہلِ طریقت نے غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدّت کی تلقین نہیں کی۔

مسلمان بادشاہوں کا ملکی مصلحتوں کی بنا پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو۔ اور فقہا و علما ان کے متعلق خواہ کیا فتوے دیں۔ لیکن حضرات صوفیہ نے کبھی ان کے خلاف غیض و غضب کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کو ایک ہندو راجہ نے تکلیفیں دیں۔ انہوں نے اس کے حق میں بد دعا بھی کی۔ لیکن عام ہندوؤں کے خلاف جوش اور غصّے کا اظہار ان کے ارشادات میں کہیں نہ ملے گا۔ اور خواجہ بزرگؒ کے معتقدین میں ہندو بھی موجود ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کی نسبت سفینۃ الاولیا میں لکھتا ہے:۔

"و جمع کثیرے از کفار بہ برکت قدوم ایشاں مسلمان شدند۔ و جماعت کہ مسلمان نہ شدہ بودہ، فتوح و دینارِ بجد بخدمت ایشاں مے فرستادند۔ و ہنوز کفارے کہ دراں نواحی اند۔ بہ زیارتِ ایشاں مے آیند۔ و مبلغہا بہ مجاورانِ روضۂ منورّہ مے گزرانند"۔

حضرت خواجہ کے علاوہ جن دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی۔ ان کے حالات اور ارشادات بھی کسی شدّت و غصّے کے جذبے سے عاری ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر وہ دوسرے مذہب والوں کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ تو انہیں ان کے ساتھ ربط پیدا کرنے اور اسلام کا پیغام پہنچانے کا موقع ہی کیسے ملتا۔

حضرت مجدّد کا نقطۂ نظر اس سے بہت مختلف تھا۔ ان کے خطوط میں غیر مسلموں کے خلاف غیض و غضب کا اظہار کثرت سے ہوا ہے۔ اور انہیں ذلیل کرنے کی جا بجا تلقین ہے۔ اس نئے زاویۂ نگاہ کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ حضرت مجدّد نے

وہ زمانہ دیکھا تھا۔ جب مسلمان ایک مُسلمان بادشاہ کے عہدِ حکومت میں احکام اسلامی جاری کرنے سے عاجز تھے:۔

"در قرنِ ماضی کفار برملا بہ طریقِ استیلا اجرائے احکامِ کفر در دار الاسلام می کردند و مسلمانان از اظہار احکامِ اسلام عاجز بودند واگر میکردند بقتل مے رسیدند، وادیلا، وامصیبتا، واحسرتا، واحزنا! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کہ محبوب رب العالمین است مصدقان او ذلیل وخوار بودند و منکرانِ او بعزت بودند و معاندان بسخریہ واستہزا بر جراحتہائے ایشاں نمک پاشیدند"

حضرت مجدّد کے حسّاس دل پران واقعات کا بڑا اثر ہُوا۔ اور نہ صرف اکبر کے خلاف، بلکہ غیر مسلموں کے متعلق بھی ان کے دل میں غصّے اور انتقام کے جذبات پیدا ہو گئے۔

اس کے علاوہ عہدِ اکبری ختم ہو جانے کے بعد بھی، کئی ایسی باتیں غیر مُسلموں کے ہاتھ سے ہوتی رہیں۔ جن کا حضرت مجدّد کو بڑا قلق تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

کفارِ ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ تھانیسر میں حوض کرکھیت کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے۔ نیز کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا بجا لا رہے ہیں۔ اور مُسلمان اکثر اسلامی احکام کے جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی کوشش کرتے ہیں۔ کہ اسلامی شہروں میں کوئی مُسلمان اس دن

نہ روٹی پکائے۔ اور نہ بیچے۔ اور ماہِ مبارک رمضان میں برملا نان وطعام پکاتے اور بیچتے ہیں۔ مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی روک نہیں سکتا۔ ہائے افسوس۔ بادشاہِ وقت ہم میں سے ہو۔ اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ اور خراب حال ہو"۔

اسلام کی گری ہوئی حالت کو سنبھالنے، اور اُس کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی تھی یا ہو رہی تھی۔ اس کو دُور کرنے کے لئے حضرت مجدّد جتنی بھی کوششیں کرتے بجا تھیں۔ لیکن ان کی کوششیں یا خواہشیں اسی حد تک محدُود نہیں رہیں۔ بلکہ ان کے دل میں انتقام اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور اسمیں نہ صرف اس زمانے کے حالات کو، بلکہ حضرت مجدّد کی اپنی حساس اور پُر جوش طبیعت ("رگِ فاروقیم") کو بھی دخل تھا۔ وہ خود ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:۔
"ہر کسے را در دل تمنائے امریست از امور۔ و تمنائے ایں فقیر شدت نمودن است بدشمنانِ خدا و دُشمنانِ پیغمبرِ و اہانت رسانیدن بایں بے دولتاں

لہ مکتوبات۔ دفتر دوم شمار ۹۲۔ یہ خط میر محمد نعمان کے ایک خط کے جواب میں ہے۔ وہ دہلی، خانقاہِ خواجہ باقی باللہ میں مقیم تھے۔ اور جہانگیر کے انتظاموں سے خوش تھے لیکن حضرت مجدّد کی ابھی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ میر صاحب کو لکھتے ہیں "مکتوب شریف میں سلطانِ وقت کی خدا پرستی اور احکامِ شریعت کے مواقق عدل و انتظام کا حال لکھا ہُوا تھا۔ اس کے مطالعہ سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اور کمال ذوق پیدا ہُوا۔ اللہ تعالےٰ نے جس طرح بادشاہِ وقت کو عدل و عدالت کے نور سے منوّر کیا ہُوا ہے۔ اسی طرح ملّتِ محمدیہ کو بھی بادشاہ کے حسن اہتمام سے نصرت و عزّت بخشے"۔

وخوار دانستن ایشاں را و الٰہ باطلہ ایشاں را و بہ یقین میداند کہ ہیچ عملے نزدِ حق عمل مرضی تر نیست ۔"

معلوم ہوتا ہے ۔ کہ شیخ فرید اس انتہائی نقطۂ نظر کے قائل نہ تھے ۔ اور اسکے علاوہ چونکہ وہ پہلے صوبہ گجرات اور پھر صوبہ لاہور کے حاکم تھے ۔ اس لئے غیر مُسلمو سے ملے بغیر اور ان کا نقطۂ نظر جانے بغیر چارہ ہی نہ تھا ۔ اور نہ ہی اس طرح ذمیوں کے حقوق، جن کی ادائیگی اسلامی حکمرانوں پر فرض ہے ادا ہو سکتے تھے ۔ لیکن حضرت مجدد بار بار انہیں خطوں میں، غیر مسلموں کو اپنی مجلس میں جگہ نہ دینے اور اگر آئیں، تو ذلیل رکھنے کی ہدائت کرتے تھے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے ۔ جس نے اہلِ کفر کو عزیز رکھا ۔ اُس نے اہلِ اسلام کو خوار کیا ۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں ۔ بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہمنشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے ۔ کتوں کی طرح اُن کو دُور کرنا چاہیئے[1] ۔ اور اگر کوئی دُنیاوی غرض اُن کے متعلق ہو ۔ جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو ۔ تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدِ نظر رکھ کر بقدرِ ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیئے ۔ اور کمالِ اسلام تو یہ ہے ۔ کہ اس دُنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں ۔ اور ان کی طرف نہ جائیں"۔ (ترجمہ)

---

[1] یہ بیان کر دینا ضروری ہے ۔ کہ اخیر عمر میں حضرت مجدد کے طرزِ عمل میں زیادہ ملائمت آگئی ۔ جس قسم کے خطوط کا ہم نے حوالہ دیا ہے ۔ وہ دفتر اوّل میں بہت ہیں دفتر دوم میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شیخ فرید نے پھر بھی یہ طریق کار نہ شروع کیا۔ چنانچہ حضرت مجدّد نے متعدد خطوط میں اہلِ کفر (ہنود) اور اہلِ بدعت (شیعوں) سے نہ ملنے کی تلقین کی۔ ایک خط میں شیخ فرید کے نیک کاموں کی تعریف کی ہے:-

"ایک درویش لاہور کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ اُس نے بیان کیا۔ کہ شیخ جیو (یعنی شیخ فرید) پُرانی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اور میاں رفیع الدین نے آپ کی التفات کے اظہار کے بعد کہا۔ کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک"

(بقیہ فٹ نوٹ صہ ۱۷۲) شاذ و نادر۔ اور دفتر سوم میں بالکل ندارد۔ بلکہ دفتر سوم میں ایک خط ایسا ہے (مکتوب ۲۲) جس میں "المشرکون نجسٌ" کی تاویل مشرکوں کے حق میں کی ہے۔ اور لکھا ہے "آپ خلق خدا پر رحم کریں۔ اور عام طور پر ان کی نجاست کا حکم نہ دیں۔ اور مسلمانوں کو بھی کفار کے ساتھ ملنے جلنے کے باعث جس سے چارہ نہیں۔ نجس نہ جانیں" اسی طرح دفتر سوم کے ایک خط سے جس میں بعض سوالوں کے جواب دئے ہیں۔ یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ ہندو یوگیوں کے جذب واثر سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ ....."ہم نے بہت سے ہنود اور ملحدوں کو دیکھا ہے۔ کہ جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس لئے خراب و ابتر ہیں۔ اور جذب کی صورت کے سوا کچھ نصیب نہیں۔

سوال۔ جذب کا حاصل ہونا ایک قسم کی محبوبیت چاہتا ہے۔ پس کفار کے لئے جو اللہ تعالےٰ کے دشمن ہیں۔ جذبہ کا نصیب کس طرح تصور کیا جاتا ہے؟

جواب۔ ہو سکتا ہے۔ کہ بعض کفار ایک قسم کی محبوبیت رکھتے ہوں۔ جو انکے جذب کے حاصل کرنے کا باعث ہوئی ہوں"

حق تعالےٰ آپ کو زیادہ توفیق عنائت فرمائے۔ مخلصوں اور یاروں کی اس قسم کی باتیں سنکر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

لیکن غیر مسلموں کے متعلق جو حضرت مجدّد کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ اس کی تلقین اس خط میں بھی ہے ؎

"اسلام اور اہلِ اسلام کی عزت کفر اور اہلِ کفر کی خواری میں ہے۔ جزیہ سے مقصود کفار کی خواری اور ان کی اہانت ہے[1]۔ جس قدر اہلِ کفر کی عزت ہو۔ اُسی قدر اسلام کی ذلت ہوتی ہے۔ اس سررشتہ کو اچھی طرح نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ اکثر لوگوں نے اس سررشتہ کو گم کر دیا ہے۔ اور دین کو برباد کر دیا ہے۔"

حضرت مجدّد کا شیخ فرید کے نام آخری خط اُس وقت لکھا گیا۔ جب وہ جہانگیر کی طرف سے کانگڑہ کی فتح پر مامور تھے۔ اس علاقے میں ہندوؤں کا ایک بڑا تیرتھ تھا۔ جس میں ایک پرانی مورتی تھی۔ حضرت مجدّد کی بڑی خواہش تھی۔ کہ شیخ فرید اس بُت کو توڑیں۔ اور اس تیرتھ کی اہانت کریں۔ تاکہ غیر مسلموں کے متعلق جو سُستی اُن سے ہوئی تھی۔ اس کی تلافی ہو جائے! ($\frac{۲۶۹}{۱}$) :-

..... ان بدبختوں اور ان کے جھوٹے خداؤں کی تحقیر اور توہین میں بہت کوشش کرنی چاہیئے۔ اللہ ظاہر اور باطن میں جس قدر ہو سکے۔ ان لوگوں کی بربادی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس تراشیدہ و ناتراشیدہ بُت کی ہر طرح اہانت کرنی چاہیئے۔ اُمید ہے۔ کہ بعض سُستیاں جو آپ سے

---

[1] کیا فرماتے ہیں۔ مولینا شبلی مصنف "الجزیہ"؟؟

وقوع میں آئی ہیں۔ اس عمل سے ان کی تلافی اور کفارہ ہو جائیگا۔
بدن کی کمزوری اور سردی کی شدت مانع ہیں۔ ورنہ فقیر خود حاضر خدمت
ہو کر اس امر کی ترغیب دیتا۔ اور اس تقریب سے اس پتھر پہ تھوکتا اور اس کو
اپنی سعادت کا سرمایہ جانتا"۔

حضرت مجدد نے اپنے ان خیالات کا اظہار اور بھی کئی مکتوبات میں کیا ہے
ایک خط میں مرزا جعفر بیگ کو لکھا ہے (۱۳۹/۱) "اس بیان میں کہ ان بدبختوں کی
ہجو اور مذمت جو اہل اللہ پر طعن کرتے ہیں۔ جائز بلکہ مستحسن ہے"۔ اسمیں لکھتے ہیں:-
"میرے مخدوم! جب کفارِ قریش نے اپنی کمال بدنصیبی سے اہلِ اسلام کی
ہجو اور برائی میں کمال مبالغہ کیا تو حضرت پیغمبر علیہ و علےٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام
نے اسلامی شاعروں کو حکم دیا۔ کہ کفار نگونسار کی ہجو کریں"۔
ظاہر ہے۔ کہ رسولِ اکرمؐ نے کفار کی ہجو اس وقت جائز قرار دی تھی۔ جب انہوں نے
"اہلِ اسلام کی ہجو اور برائی میں کمال مبالغہ کیا"۔ اور یہ کفار وہ کم نصیب ہستیاں
تھیں۔ جنہوں نے رسُول اکرمؐ اور ان کے ساتھیوں پر طرح طرح کے ظلم

لہ اس معاملے میں خواجہ باقی باللہؒ کا طریقِ کار اپنے مرید کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف تھا۔
وہ زیادتی کے مقابلے میں بھی نرمی کرنا مناسب سمجھتے تھے۔ ان کے ایک مرید شیخ تاج
کو اہلِ سنبھل نے سخت دق کیا۔ اور شیخ نے رُوحانی طور پر کوئی بدلہ بھی لیا۔ حضرت خواجہ
اس کے متعلق لکھتے ہیں:- "فقیروں کا شیوہ نہیں۔ کہ کسی سے تعارض کیا جائے۔ ہر کام میں
اللہ تعالےٰ کے کرم پر نظر رکھنی چاہیئے۔ مخالف سے مخالف کے ساتھ بھی ملاطفت کا برتاؤ کرنا
اہلِ سلوک کا طریقہ ہے۔ اگر اپنا طریقہ ٹھیک ہو۔ تو حاسد خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں" (بیرنگ باقی صر۳۶)

توڑے ۔ انہیں گھر سے بے گھر کیا ۔ وہ وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے ۔ تب بھی ان کی مخالفت اور ایذادہی سے باز نہ آئے ۔ اور وہاں کے کفار کے ساتھ منصوبے کرتے رہے ۔ تاکہ نئے مذہب اور اس کے ماننے والوں کو نابود کر دیں ۔ ظاہر ہے ۔ کہ ان کفار اور دارالاسلام کے ذمیوں میں فرق ہے لیکن معلوم ہوتا ہے ۔ کہ حضرت مجدد تمام اہل ہنود کی تذلیل و اہانت کے خواہاں تھے ۔ ان کا ایک خط ' ایک ہندو ہردے رام کے نام ہے ۔ جس نے حضرت مجدد کے نام دو خطوں میں فقرا و صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا تھا ۔ اور لکھا تھا ۔ کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں ۔ دوسرے صوفیہ ہوتے ۔ تو اس اظہارِ ارادت کی قدر کرتے ۔ لیکن حضرت مجدد عرصئہ توحید میں ایک تیغِ برہنہ کی طرح تھے ۔ اُنہوں نے جواب اس لکھا :-

من آنچہ شرطِ بلاغست با تو مے گویم
تو خواہی از سخنم پند گیر و خواہ ملال!

...... رام و کرشن وغیرہ جو ہندوؤں کے معبود ہیں اس (پروردگار) کی کمینہ مخلوقات میں سے ہیں ۔ اور ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں ۔ رام جسرتھ کا بیٹا اور لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے ۔ جب رام اپنی بیوی کو نگاہ نہ رکھ سکا ۔ تو وہ پھر دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے ۔ عقل دور اندیش سے کام لینا چاہیئے ۔ اور ان کی تقلید پر نہ چلنا چاہیئے ۔ بڑی عار کی بات ہے ۔ کہ کوئی تمام جہانیوں کے پروردگار کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کرے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عظیم الشان بادشاہ کو کمینہ خاکروب کے نام سے

یاد کرے۔ رام و رحمٰن کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا.....“

اِس خط میں آگے چل کر انہوں نے بڑی ٹھوس دلائل سے ایک ذاتِ واحد کی عبادت کرنے کی ضرورت جتائی ہے۔ اور کوئی انصاف پسند ان دلائل کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے ایک قوم کے معبودوں کے لئے ”کمینہ خاکروب“ کا جو لفظ استعمال کیا ہے۔ اسے شائد خلقِ محمدیہ کے موافق نہ سمجھا جائے۔ اور نہ ہی قرآن حکیم کے اس صریح ارشاد کے مطابق۔ (سورہ الانعام) کہ تم ان لوگوں کے جھوٹے معبودوں کو بُرا مت کہو۔ تاکہ یہ تمہارے سچے خدا کو بُرا نہ کہیں۔

حضرت مجدد کی تعلیمات کا عوام الناس پر جو اثر ہوتا تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کی قدیم سوانح عمری برکات الاحمدیہ میں ملتی ہے۔ خواجہ محمدؐ ہاشم کشمی لکھتے ہیں۔ کہ ایک اہلِ دل سید ”رحمت اللہ“ نام نے، جو لاہور میں کبھی کبھی حضرت کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا۔ لیکن ان کا مرید نہ تھا۔ ایک روز مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ (ترجمہ)

”ایک دفعہ میں ملکِ دکن میں چند درویشوں کے ساتھ ایک ویرانے میں جا رہا تھا۔ کہ وہاں ہمیں ایک بتخانہ نظر پڑا۔ چونکہ ہم نے تمہارے مرشد (حضرت مجدد) سے ایک دن سنا تھا۔ کہ جس قدر بتوں کی توہین ایک مسلمان کے ہاتھ سے ہو سکے۔ اس سے باز نہ رہنا چاہیئے۔ اور اس سے غازیان فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے۔ اس لئے میں نے اس نصیحت کی پیروی میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کہ اس ویرانے میں اس بتخانے کا محافظ کوئی نظر نہیں آتا۔ آؤ جھانک

ہو سکے۔ اسے مسمار کر دیں۔ چنانچہ ہم نے ایک بت کو توڑا۔ اور دیواروں کو توڑنے کے درپے تھے۔ کہ ایک ہندو مزارع نے دُور سے اس بُتخانہ کی تباہی دیکھی۔ اور بھاگ کر قریب کے گاؤں میں، جہاں مندر کے پُجاری رہتے تھے۔ اس واقعہ کی اطلاع دی۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ہزار کے قریب آدمی، پتھر اور لکڑیاں اور ہتھیار لئے ہوئے آرہے ہیں۔ ہم بہت ڈرے۔ کیونکہ اس وقت راہِ فرار بھی کوئی نہ تھی۔ ناچار یہی سمجھا۔ کہ شہادت کا وقت آگیا ہے۔ لیکن دل میں مَیں نے تمہارے حضرت کی طرف توجہ کی۔ کہ یا شیخ! ہم نے آپ کی نصیحت پر بھروسہ کر کے یہ کام کیا تھا۔ اس وقت ہمیں کافروں کے ہاتھ سے رہائی دلوائیے۔ جب مَیں نے یہ دُعا کی۔ تو اس وقت مجھے ایسا خیال ہُوا۔ کہ حضرت کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔ اور وہ کہہ رہے ہیں۔ کہ تم خاطر جمع رکھو۔ ہم ایک اسلامی لشکر تمہاری مدد کے لئے بھیجتے ہیں۔ مَیں یہ سُنکر متعجب تھا۔ کہ تھوڑی دیر میں ایک بلندی پر سے تیس چالیس سواروں کا دستہ نمودار ہُوا۔ جنہیں دیکھ کر کفار نے راہِ فرار اختیار کی۔ واقعہ یہ ہُوا۔ کہ جب ہندو مزارع کے گاؤں میں جانے پر ہندو اکٹھے ہوئے۔ تو وہاں دو تین مسلمانوں کے گھر تھے۔ ان مسلمانوں نے فوراً قریب کے ایک گاؤں میں، جہاں مُسلمان سوار کسی سرکاری کام کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جاکر خبر دی اور وہ سوار ہماری رہائی کے لئے آموجود ہوئے۔"

راوی نے تو یہ واقعہ حضرت مجدّد کا تصرف ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا ہے لیکن اسے یہ خیال نہیں رہا۔ کہ چوری چھپے سے کسی قوم کی عبادت گاہ کو مسمار کر نا دینے بھی

کسی بہادری کا کام نہیں۔ اور اسلامی شرع کے مطابق تو دارالاسلام میں ذمیوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت مسلمانوں پر اس طرح فرض ہے۔ کہ اس کے لئے جہاد بھی جائز ہے!!

حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطہ نظر تھا۔ اس نے اسلامی ہندوستان کی تاریخ پر دو طریقوں سے اثر ڈالا۔ ایک تو اس سے اسلام اور ہندو مذہب کی وہ آمیزش، جو کبیر اور بعض ہندو راہنماؤں کی تعلیمات میں شروع ہوئی تھی۔ اور جس کے مطابق اسلام کا عقیدۂ توحید، اور کئی دوسرے اصول، ہندو سوسائٹی کا بنیادی نظام برہم کئے بغیر، ہندو مذہب میں داخل ہو رہے تھے، کمزور پڑ گئی۔ اور دوسرا اثر یہ ہوا۔ کہ اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی تھیں۔ اور جنہوں نے مغلیہ حکومت کے استحکام میں مدد دی تھی، ان کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا۔ اور ذبحِ بقر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجدد کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں۔ اور ان کی بڑی خواہش تھی۔ کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے۔ اور ذبحِ بقر عام طور پر رائج ہو۔ کئی خطوں میں اس بات پر افسوس کیا ہے۔ کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے۔ ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "جزیہ از اہلِ کفر[1] کہ در ہندوستان برطرف شدہ است۔ بواسطہ شومئ مصاحبت اہلِ کفر است باسلاطین ایں دیار"۔ ایک اور خط میں ذبحِ بقر کی تائید کی گئی ہے۔

---

[1] حضرت مجدد نے ہنود کے لئے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہلِ کفر کہتے ہیں۔ حالانکہ جزیہ کفار سے لیا ہی نہیں جاتا۔ اہلِ کتاب ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جب (دیکھو صفحہ ۱۸۰)

"ذبحِ بقر در ہندوستان از اعظم شعائرِ اسلام است - در ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت - فبہا و اگر عیاذاً باللہ سبحانہ، در توقف اُفتاد - کار بر مسلماناں بسیار مشکل خواہد شُد -" جہانگیر اور شاہجہاں نے تو ملکی مصلحتوں کی بنا پر ان خیالات پر عمل نہیں کیا - لیکن اورنگ زیب نے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے - کہ وہ حضرت مجدد کے خلیفہ، خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا - حضرت مجدّد کی بیشتر خواہشیں پوری کر دیں - اور جزیہ اور ذبحِ بقر کے متعلق وہی احکام جاری کئے - جن کی حضرت مجدّد کو تمنّا تھی -

حضرت مجدد کے غیر مسلموں کی نسبت جو خیالات تھے - انہیں ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے - اب فقط اس امر پر تبصرہ کرنا باقی ہے - کہ ان خیالات اور ان کی اشاعت کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نیک نکلا یا بُرا - اس کے متعلق رائیں مختلف ہیں - معتقد، عہدِ عالمگیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس زمانے میں اسلام کی کتنی شان تھی - ترویجِ شرع اور احکامِ اسلامی کی پیروی کتنے بلند پایہ پر تھی - اس کا عہدِ اکبری کے الحاد سے مقابلہ کرو - اور پھر حضرت مجدّد اور ان کے فیض کا قیاس کرو - معترض کہتے ہیں - کہ ذرا عہدِ عالمگیری سے آگے بڑھ کر بھی دیکھو - مُلکی معاملات میں سیاسی مصلحتوں اور فیضِ عام کے اصولوں کو چھوڑ کر جوش اور غصّے کی پیروی کرنے سے حکومت میں جو زوال ہُوا،

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۹) مسلمان ہندوستان میں آئے - اور اُنہوں نے دیکھا - کہ اگرچہ اکثر ہندو بُت پرست ہیں لیکن ان کے طریقے کفارِ مکہ سے مختلف ہیں - اور ان میں سے کئی اپنے خیال کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں - تو اُنہوں نے ان سے بھی وہی سلوک شروع کیا - جو فقہی کتب میں اہلِ کتاب - ذمیوں کے لئے مخصوص تھا - حضرت مجدّد ہنود کو ہر جگہ کافر کہتے ہیں لیکن وہ قدیم ہندوستان میں پیغمبر مبعوث ہونے کے قائل تھے -

جس سے اسلامی نظام اس مُلک میں بالکل درہم برہم ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ سکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اگرچہ عہدِ اکبری یا جہانگیری میں ہندو بعض پابندیوں سے بری تھے۔ لیکن اسلام اور اہلِ اسلام کے لئے وہ زمانہ اچھا تھا۔ یا مرہٹوں اور سکھوں کے عروج کا زمانہ، جس کی دردناک داستان معاصرانہ تواریخ میں ملتی ہے!

واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت مجدّد الف ثانی کی تحریک اکبری آزاد خیالیوں اور بے قاعدگیوں کے خلاف ایک ردِّ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ردِّ عمل کے جوش میں انسان مناسب حدود سے ضرور تجاوز کر جاتا ہے۔ حضرت مجدّد نے ہندوؤں کے متعلق کئی ایسی باتیں کہیں۔ جن پر نہ صرف مصلحت کے نقطۂ نظر سے، بلکہ قرآنی ارشادات اور خلقِ محمّدی کے اصولوں سے بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض کرنے سے پہلے ان کے ماحول اور ان حالات کا بھی اندازہ کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے ان کے حسّاس دل کو متاثر کیا۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ اگر اکبر اپنی کوششیں فقط مذہبی رواداری تک محدود رکھتا۔ اور احکامِ اسلامی کی تذلیل کر کے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس نہ لگاتا۔ تو اس کی کوششوں کے خلاف اتنا زبردست ردِّ عمل نہ ہوتا۔ نہ ہی حضرت مجدّد کے وہ خیالات ہوتے۔ جن کا اظہار اُنھوں نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے۔ اور نہ ہی اورنگ زیب وہ پالیسی اختیار کرتا۔ جس پر وہ اپنے عہدِ حکومت میں کاربند رہا!

مکتوباتِ امامِ ربّانی

حضرت شیخ سرہندیؒ کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ آپ کے دو معجزے تھے۔ ایک تو آپ کی بلند پایہ عالی قدر

اولاد، دوسرے آپ کے مکتوبات!

ہندوستان میں تصوف کی تھوڑی کتابوں کو وہ قدر و منزلت میسر آئی ہے جو مکتوبات امام ربانی کو نصیب ہے۔ حضرت سرہندی کی زندگی میں ہی ان کی نقلیں، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ اور آج بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مولٰنا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:۔

"تصوف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔ نمبر اوّل پر مثنوی ہے۔ جس نے دہریت والحاد سے کھینچ کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی ــ اس اجمال کے بعد ضرورت تفصیل کی تھی۔ یعنی اسلام کے اندر عقائد و اعمال میں متعین راہ کونسی اختیار کی جائے۔ اس باب میں شمع ہدائت کا کام مکتوبات نے ہی دیا۔"

مکتوباتِ امام ربانی حضرت مجدد کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔ ان کی تین جلدیں ہیں۔ دفترِ اول جسے دُرالمعرفت بھی کہتے ہیں۔ ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ یار محمدؒ بدخشی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ سب سے مفصل ہے۔ اور اس میں کئی سالوں کے خطوط جمع ہیں۔ پہلے بیس ۲۰ خطوط وہ ہیں۔ جو حضرت سرہندی نے اپنے پیرومرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امرائے جہانگیری کے نام ہیں۔ جن میں انہیں تلقین کی گئی ہے۔ کہ وہ نئے بادشاہ کے زمانے میں ترویجِ دین کی کوشش کریں۔ باقی خطوط میں سوالوں کے جواب ہیں۔ یا علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح ہے۔ چونکہ اس زمانے میں

ان کے مکتوب یازدہم پر (جس میں انہوں نے اپنے عروج کا ذکر کیا تھا) اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ اس لئے اس جلد کے اخیر میں کئی خطوط اپنے معترضوں کی تسکین کے لئے لکھے گئے۔ ایک چالیس صفحے کا خط اپنے مُرشد زادوں کے نام ہے۔ جس میں اہل سنت وجماعت کے عقائد بیان کئے ہیں۔

دفتر دوم، جس کا تاریخی نام دُر المخلائق ہے۔ ۱۰۱۹ھ میں مرتب ہُوا۔ اسے خواجہ عبدالحی نے خواجہ محمدؒ معصوم کے ایما پر جمع کیا۔ اس میں خطوط تھوڑے ہیں۔ فقط ننانوے۔ لیکن ان میں سے بعض بڑے طویل اور مفصّل ہیں۔ ایک خط بیس صفحے سے زیادہ خواجہ محمدؒ تقی کے نام ہے۔ جس میں اہل سُنت اور شیعوں کے خیالات سے بڑی مدلّل بحث کی ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کی ہے۔ ایک پندرہ صفحے کا خط خان جہاں کے نام ہے۔ اس میں اسلامی عقائد کو تفصیل سے منضبط کیا ہے۔ چند ایک خط اپنے مُرشد زادوں کے متعلق ہیں۔ باقی خطوط میں بیشتر مسائل صوفیہ کی توضیح ہے۔

دفتر سوم موسوم بہ معرفت الحقائق کو خواجہ محمدؒ ہاشم نے ۱۰۳۱ھ میں یعنی حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پہلے ترتیب دیا۔ پہلے اس میں ۱۱۵ خطوط تھے۔ آخری نو خطوط بعد میں اضافہ ہوئے۔ اس مجموعہ کے بہت سے خطوط اس وقت لکھے گئے۔ جب حضرت مجدّد قلعۂ گوالیار میں محبوس تھے۔ یا لشکرِ شاہی کے ہمراہ رہتے تھے۔ کئی ایک خطوط مخدوم زادگان کے نام ہیں۔ ایک خط (۱۰۹) میں اُس گفتگو کا ذکر ہے۔ جو انہوں نے ایک دفعہ جہانگیر کی مجلس میں کی تھی۔ ایک خط جہانگیر کے نام ہے۔ جس میں دُعا کے اسرار اور علماء و صلحا کی

تعریف بیان کی ہے۔

ایک نہایت دلچسپ خط (۱۴۱) ایک صالحہ عورت کے نام ہے۔ جس میں ان شرطوں کی توضیح کی ہے۔ جن پر عورتوں کی بیعت ہونی چاہیئے۔ اور اس میں تمام وہ بدعتیں بالتفصیل گنائی ہیں۔ جن میں ہندوستانی عورتیں خاص طور پر گرفتار ہیں (مثلاً سیتلا اور چیچک کے موقع پر دیوی کی منت ماننا۔ مشائخ کی قبروں پر منت کے جانور ذبح کرنا۔ پیروں کے روزے رکھنا شگون کا اعتبار کرنا۔ جادو کا قائل ہونا) اور جن کی اصلاح کے لئے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے کوشش کی۔

مکتوبات سے ہم نے اس قدر حوالے دئے ہیں۔ کہ اب کسی طویل اقتباس کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تو تمام کے تمام پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ لیکن انہیں پڑھنے سے پہلے تصوّف اور مذہب اسلام کے مشہور مسائل اور ان کی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی چاہیئے۔ تاکہ حضرت مجدّد کی قابلیت راست خیالی اور سلیم الطبعی کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ اور یہ معلوم ہو۔ کہ جو صدیوں کی پرانی گتھیاں تھیں۔ انہیں شرع اور عقل وسمجھ کے موافق اُنہوں نے کس طرح سلجھانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ عہدِ اکبری اور عہدِ جہانگیری کے واقعات اور ممتاز شخصیتوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہو۔ تو مکتوبات کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

مکتوبات کی مقبولیت کی اگر بڑی وجہ اُن کے مضامین کی خوبی، تنوّع اور صاحبِ مکتوبات کی علمیت اور روحانی فضیلت ہے۔ تو اس کے علاوہ

حضرت مجدّد کے طرزِ تحریر کو بھی ان کے اثر میں بڑا دخل ہے۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شیخ مجدد بڑے بلند پایہ اہلِ قلم تھے۔ اور خط لکھتے وقت مکتوب کی انشائی خوبیوں پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ ان کے خطوط میں بیشتر علمی اور دینی مسائل ہیں۔ اور ان کے لئے وہی عالمانہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ معانی تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں ادا ہو جائیں وہ اربابِ تصوف کی مروّجہ اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ اور جو لوگ ان سے ناواقف ہیں۔ انہیں بعض مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے لیکن عام طور ثقیل الفاظ بہت تھوڑے ہیں۔ اور بالخصوص ان مکتوبات میں جو عقائد کی توضیح ہیں، یا مبتدیوں اور نوجوان طالبوں کو لکھے گئے۔ زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے۔ ان کے خطوط کا ایک اہم جزو معاصرانہ امرا کے نام ہے۔ جس میں انہیں شریعت کو سنبھالنے اور اسلام کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان خطوط کا طرزِ تحریر علمی خطوط سے مختلف ہے۔ عالمانہ اصطلاحیں ان میں بہت کم ہیں۔ الفاظ پُر وقار مگر سریع الفہم ہیں۔ لیکن طرزِ تحریر میں ایک جوش ہے۔ خطیبانہ اور پُر تاثیر۔ یہ خطوط دل سے نکلے ہوئے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اس لئے دل پر اثر کرتے ہیں۔

آپ تشریح اور تاثیر کے لئے گاہے گاہے مکاتیب میں کوئی دلچسپ شعر یا مصرع بھی درج کر دیتے۔ جس سے اندراج کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ اسکے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور تقابل کا بھی خیال کرتے۔ ایک خط میں مُلا حسن کشمیری کو لکھتے ہیں:۔

"نوشتہ بودند۔ کہ شیخ عبدالکبیر یمنی گفتہ است۔ کہ حق سبحانہ، وتعالیٰ عالم الغیب نیست۔ بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت مے آید۔ وفرصت تاویل وتوجیہ نمیدہد۔ قائل ایں سخنانِ شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمدؐ عربی علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوٰۃ والسلام درکاراست۔ نہ کلام محی الدین عربی وصدرالدین قونیوی و عبدالرزاق کاشی۔ مارا بہ نص کاراست۔ نہ بہ فص۔ مارا فتوحاتِ مدینہ (یعنی احادیث) از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است۔"

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ حضرت کا طرزِ تحریر یا تو علمی ہوتا ہے۔ علمی مسائل کی توضیح کے لئے۔ یا خطیبانہ، جب اپنے جذبات کا اظہار اور دوسروں کو کسی اقدام کی تلقین مقصود ہو۔ لیکن چند ایک خطوط ہیں۔ جو اس تقسیم سے باہر ہیں۔ ان میں سے ایک خط، جو اُنھوں نے صاحبزادوں کو قید سے لکھا۔ اور جس میں پدرانہ محبت نے نہائت ملائم اور شیریں الفاظ کا جامہ پہنا ہے۔ درج کئے بغیر جی نہیں مانتا:۔

"فرزندانِ گرامی بہ جمعیت باشند۔ مردم ہمہ وقت محنتہائے مارا در نظر میدارند۔ ومخلصی ازیں مضیق مے طلبند۔ نمیدانند۔ کہ در نامرادی و بے اختیاری چہ بلا حسن وجمال است۔ وکدام نعمت برابر آن است۔ کہ ایں کس را بے اختیار از اختیارِ او برآرند۔ و باختیارِ خود اور ازندگانی دہند۔ و امورِ اختیاری اورا نیز تابع آں بے اختیاری او ساختہ اورا از دائرۂ اختیارِ او برآرند۔۔۔۔۔

در ایامِ حبس گاہے کہ مطالعہ ناکامی و بے اختیاریِ خود مے نمودم۔ عجب حظ ہیگرفتم وطرفہ ذوق مے یافتم۔ بلے اربابِ فراغت، ذوقِ اربابِ بلا را چہ دریابند۔ واز بلائے جمال او چہ درک نمایند۔ طفلاں را حظ منحصر در شیرینی است

وآنکہ از تلخی خط فراگرفتہ است۔ شیرینی را بجوے نمے خرد۔ ع

مرغِ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

وحدت الشہود

خواجہ باقی باللہؒ کی آمد سے پہلے جو صوفیہ سلسلے ہندوستان میں برسرِ فروغ تھے۔ وہ تمام کے تمام ایران اور ایران کی علمی سرحد عراق کی پیداوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ، سہرورد سے متعلق ہے۔ جو بغداد سے چند میل کے فاصلہ پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے۔ لیکن ان کا رُوحانی پسِ منظر ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ عجمیت، جو دورِ عباسیہ کو دورِ اموی سے، اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینۂ منورہ کے محدثین و فقہا سے منفرد کرتی ہے۔ موجود تھی۔ تینوں میں وہ "صلح کل" کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے اخذِ فیض کرنے میں اجتناب نہ کیا جاتا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی۔ اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریق رائج ہوگیا تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ جس سلسلہ کو لے کر ہندوستان آئے۔ وہ ایران نہیں توران کا تحفہ تھا۔ اور ماوراءالنہر کے رنگ میں رنگا ہُوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلہ میں

---

[1] مرزا غالب نے ایک دفعہ بہادر شاہ کے دربار میں ایک رُباعی پڑھی تھی ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری | کہتے ہیں وہ مجھے رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صُوفی | شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

(بقیہ صفحہ ۱۸۸ پر)

شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔ سماع کی ممانعت تھی۔ ذکرِ خفی کی تلقین تھی۔ اور فرائضِ شرعی کو نوافل پر واضح ترجیح تھی۔

نقشبندیہ سلسلہ، حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیہ سلسلوں سے ممتاز تھا۔ اور شرع سے بہت قریب تھا۔ لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے سلسلوں سے مختلف نہ تھا۔ جو فرق تھا۔ وہ خواجگانِ بخارا و سمرقند کی آئین پسندی، ڈسپلن اور شرعی جوش و خروش کی وجہ سے تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسا صاحبِ فکر پیدا نہ ہوا تھا۔ جو نقشبندیوں کو ایک ایسا فلسفہ دے دیتا۔ جو اس معاملے میں بھی انہیں ایک امتیازی رنگ دیتا۔ اور ان کے خاص رجحانات کے لئے ایک فکری اساس کا کام دیتا۔ یہ کمی حضرت مجدد نے پوری کر دی۔ ان کے ظہور سے پہلے تمام صوفیوں میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا۔ ابن العربی کا فلسفۂ وحدت الوجود۔ بیشک اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے۔ بعض انتہا پسند صوفی تو وحدت الوجود میں اتنا غلو کرتے کہ وہ قریب قریب دائرۂ اسلام سے باہر آجاتے۔ اور کئی دوسرے اسے فقط اسی حد تک اختیار کرتے۔ جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک ایسا جداگانہ فلسفہ مدون ہوا۔ جو فلسفۂ وحدت الوجود کا مدِ مقابل ہوتا۔ یہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ)
مصرعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولینا حالی فرماتے ہیں۔ "چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناجی اور خارجی سمجھتے ہیں۔" مولینا نے تو فقط ایک پہلو پر تبصرہ کیا۔ لیکن ترکستان کے لوگ ایرانیوں کی نسبت عام طور پر زیادہ سخت اور شرع کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

یہ فلسفہ حضرت مجدّد کا فلسفۂ وحدت الشہود تھا۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذاتِ باری اور مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انہیں توحیدِ عینی اور توحیدِ ظلّی بھی کہہ سکتے ہیں۔ تصوّف کی ایک مشہور کتاب تذکرۂ غوثیہ میں ان دونوں کا فرق اس طرح سمجھا گیا ہے:۔

وجود یعنی ہستیٔ حقیقی واحد ہے۔ لیکن ایک ظاہر وجود ہے۔ اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے۔ جو جملہ عالم کے لئے بمنزلہ ایک جان کے ہے اسی نورِ باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے۔ جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم وصفت وفعل، کہ عالمِ ظاہر میں ہے۔ ان سب کی اصل وہی وصفِ باطن ہے۔ اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذاتِ دریا ہے۔ حاصل یہ ہے۔ کہ جملہ افرادِ کائنات تجلیاتِ حق ہیں۔ سُبحَانَ الَّذِی خَلَقَ الاَشیَاءَ وَھُوَ عَینُھَا۔ اور اس کثرتِ اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ الحقّ محسُوسٌ وَالخَلقُ مَعقُولٌ۔

یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے۔ اور وحدت شہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہور آثار وصفات مختلفہ، واحدِ مطلق کی ذات وصفات کا ظل وعکس ہے۔ جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ ظل عین صاحب ظل نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک مثال ہے۔"

مندرجہ بالا تشریح دیکھ کر شاید بعض بزرگ کہیں۔ کہ ان دونوں فلسفوں میں تو کوئی خاص بُعد نہیں (اور سچ یہ ہے۔ کہ ان مسائل پر فلسفہ اور تصوف کی

بھول بھلیاں دیکھ کر بار بار اس ذاتِ حکیم کا فرمان یاد آتا ہے۔ کہ ذات اور صفات کے جھگڑوں میں نہ پڑو، لیکن فی الواقع یہ دونوں نظریے دو مختلف بلکہ متضاد رجحانات کے ترجمان ہیں۔ نواب سر احمد حسین نظامت جنگ بہادر نے اپنی کتاب "فلسفۂ فقرا" میں ان دونوں کے فرق کو ایک نقشے کی مدد سے نمایاں کیا ہے:-

وحدت الوجود (ہو الکل)	وحدت الشہود (ہو الہادی)
نظریہ — ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست	نظریہ — ہمہ از وست
رجحانِ تصوّف۔ سکون کی طرف مائل	رجحانِ تصوّف — جوش کی طرف مائل
مَیں اور وہ جدا نہیں۔ (وہ دریا تو مَیں قطرہ ہوں)	اسکے ساتھ مَیں، اور میرے ساتھ وہ ہے۔
وصل	عشق
اعتقاد۔ مَیں کون؟ انا الحق (عارف)	اعتقاد۔ مَیں کون؟ انا عبدہٗ (عاشق)

علامہ اقبال نے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا:-

"حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن؟ میرے نزدیک گسستن عین اسلام ہے۔ اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوّف ہے...... آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جب آپ نے مجھے سرّ الوصال کا خطاب دیا تھا۔ تو مَیں نے آپ کو کہا تھا۔ کہ مجھے سرّ الفراق کہا جائے۔ اُس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا۔ جو مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہے۔"

اقبال نے سرّالفراق کے جس خطاب کی خواہش کی تھی۔ اسکے حضرت مجدّد الف ثانی اُس سے بھی زیادہ مستحق ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر ابن العربی کو سرّالوصال اور حضرت مجدّد الف ثانی کو سرّالفراق کہا جائے۔ تو ان کے فلسفوں اور وحدت الشہود کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے شیخ ابن العربی کا دوسرے مذہبوں کی نسبت جو طرزِ عمل ہو گیا تھا۔ اسے انہوں نے چند عربی اشعار میں بڑی وضاحت سے نظم کیا ہے (ترجمہ)

"آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا۔ کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا انکار کرتا۔ اور اسے اجنبی سمجھتا۔

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ اب ایک چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی۔ اور دیر ہے راہبوں کا۔ اور آتشکدہ ہے آتش پرستوں کے لئے۔ اور کعبہ ہے حاجیوں کے لئے۔ اور الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا۔

میں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ، جدھر بھی چاہے، مجھے لے جائے۔ میرا دین بھی عشق ہے۔ میرا ایمان بھی عشق ہے"۔

برخلاف اس کے حضرت مجدّد کا دوسرے مذاہب کی نسبت جو خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے ایک ہندو ہردے رام کو لکھا۔ اور جس میں اس خیال کی، کہ رام اور رحمان ایک ہیں، بڑی خفگی سے تردید کی تھی!

مندرجہ بالا سطور سے حضرت مجدّد کے رُوحانی اسلوب خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اور تاریخ تصوف میں ان کی منفردانہ حیثیت سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا ان میں سے اگر ایک حق پر ہے۔ تو دوسرا ضرور باطل ہوگا۔

یہ دونوں رجحانات مختلف اور متضاد ہیں۔ لیکن حالات کے مطابق مختلف رجحانات برسرِ کار آتے ہیں۔ اور جُداگانہ حالات میں جداگانہ رجحانات مفید ہوتے ہیں ایک انگریزی مقولہ ہے۔

"There is a season and time for every purpose under heaven;
A time to love and a time to hate."

دنیا کی ہر ایک چیز کے لئے کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔ کوئی وقت محبت کرنے کا ہوتا ہے۔ اور کوئی وقت دشمنی کا!

یعنی کسی وقت سرّ الوصال کی راہنمائی مفید ہوتی ہے۔ اور کسی وقت سرّ الفراق کی! یا تصوف کی اصطلاح میں یوں سمجھئے۔ کہ کوئی وقت شانِ جمالی کا ہوتا ہے۔ اور کوئی وقت شانِ جلالی کا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے جو ہمارے سب سے بالغ نظر اور دقیقہ رس عالم ہوئے ہیں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور اسمٰعیل آفندی کے نام ایک طویل عربی خط میں (جو اب مع اردو ترجمہ کے فیصلۂ وحدت الوجود والشہود کے نام سے چھپا ہے) شیخ اکبر اور شیخ مجدّد کے خیالات کی تطبیق کی۔ شاہ صاحب نے دیکھا ہوگا۔ کہ ایک اصول ہے۔ اخذ و انجذاب کا اور دوسرا فلسفہ ہے۔

تطہیر و تنزکیہ کا۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور یکرنگیوں کو دیکھتے ہیں۔ اور دوسروں کی نظر اختلافات پر ہوتی ہے۔ ابن العربی۔ رومی۔ غزالی اور دارا شکوہ عیسائی، نو افلاطونی اور ہندو فلسفوں اور طور طریقوں کو کھنگالتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں۔ کہ ان میں کونسی چیز اچھی ہے اور اخذ کی جا سکتی ہے۔ لیکن ابن تیمیہ۔ مجدد الف ثانی۔ اقبال اور اورنگ زیب ان چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ تاکہ جو چیز کھرے شرعی معیار پر پوری نہ اُترے۔ اسے رد کر دیا جائے۔ اگر پہلا گروہ نہ ہو۔ تو اسلامی خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے۔ دماغ ایک محدود اور تنگ و تاریک دائرے سے باہر نہ نکلے۔ اور خیالات میں وسعت اور لچک نہ رہے۔ اگر دوسرا گروہ اپنا کام بند کر دے۔ تو ہر رطب و یابس، بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کر لئے جائیں۔ اور قوم کا نہ صرف شرعی، بلکہ فکری اور روحانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام کی تاریخ میں دونوں اصول کارفرما رہے ہیں۔ وحدت الوجودیوں اور حق کو ہر گوشے میں تلاش کرنے والوں نے دوسری قوموں اور دوسرے طریقوں سے استفادہ کیا۔ اور ان کے خیالات اور طریقوں کو اسلام میں داخل کیا۔ لیکن جب اس طرح بعض مضر خیالات اور شعائر بھی اختیار کر لئے گئے۔ اور باہر کے عناصر قومی تخیل پر اس طرح چھا گئے۔ کہ اصل اسلامی احکام نظر سے اوجھل ہونے شروع ہوئے۔ تو ابن تیمیہ۔ عبدالوہاب۔ حضرت مجدد۔ اور اقبال نے اپنا کام شروع کیا۔ اور اسلام کو غیر اسلامی عناصر سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی۔

ظاہری نقطۂ نظر میں تو دوسری کوششیں شرع کی پابند، اور اسلام کے لئے زیادہ مفید معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اسلام کی رُوح کے لئے پہلی کوششیں اسی قدر ضروری نہیں؟ اسلام تو وہ مذہب ہے۔ جس نے سابق کے تمام پیغمبروں اور ان کے مذہبوں کو سچا تسلیم کیا ہے۔ اور ان کی نیک اور مفید باتیں اخذ کر لی ہیں۔ کیا یہ امر اسلام کی عین رُوح کے مطابق نہیں کہ اخذ و انجذاب کا یہ اصول جاری رہے۔ اور جو باتیں اسلام کے بنیادی اصولوں کے متناقض نہیں۔ ان میں وسیع النظری سے کام لیا جائے۔ اور حقیقت کو ہر گوشے میں تلاش کیا جائے؟

حضرت مجدّد بھی غالباً اس نکتے سے واقف تھے۔ چنانچہ یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ اُنہوں نے وُحدت الوجود کی بالکل نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے وُحدت الشہود سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا ہے۔ شیخ محی الدین کا ذکر بھی اُنہوں نے اکثر احترام سے کیا ہے۔ اور اگرچہ وہ ان سے کئی اہم باتوں میں متفق نہ تھے۔ لیکن ان کی علمیت اور خلوص کے بڑے مداح تھے۔ زبدۃ المقامات میں ایک جگہ مسئلہ وحدت الوجود اور شیخ ابن العربی کی نسبت ان کے ایک خط کا اقتباس دیا گیا ہے:۔

"مانا کہ یکے از علماء ظاہر گفتہ باشد۔ کہ ایں مسئلہ باطل است ایشاں بجلالیت تمام گفتہ اند۔ و نوشتہ کہ در کار ایں بزرگاں باطل چہ کار دارد۔ و بطلان اینجا کجا بار دارد۔ دراں موطن کہ ایشاں ازیں مسئلہ عالیشان دم زدہ اند۔ استیلائے حق است۔ و بطلانِ باطل۔ ایں بزرگواراں در محبت حق جلّ و علاء، خود را

دغیر خود را در باختہ اند۔ واز خود نام ونشان نگزاشتہ۔ نزدیک است۔ کہ باطل از سایۂ ایشاں بگریزند"۔

خلفائے مجددیہ اور دوسرے مشائخ نقشبندیہ

شیخ آدم بنوریؒ:۔ حضرت مجدد کے خلفا اور فیض یافتگان کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ لیکن اُن میں سے دو، شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد معصومؒ خاص طور پر ذکر کے مستحق ہیں۔ شیخ آدم بنوری پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ لیکن ایک واقعہ سے متاثر ہو کر وہ ملازمت ترک کر دی۔ اور پہلے حاجی خضر اور پھر حضرت مجدد کی خدمت میں حاضر ہو کر نعمتِ باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ شروع میں اُمی محض تھے۔ ایک جذبۂ پُر زور کے تحت قرآن مجید حفظ کیا۔ اور علوم ظاہری بھی حاصل کئے۔ پھر ایک عالم کو سیراب کیا۔ کہتے ہیں۔ کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار سے زیادہ طلبائے معرفت جمع رہتے تھے۔ جن کو کھانا آپ کے لنگر سے ملتا تھا آپ کے خلفا کی تعداد ایک سو اور مریدین کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جہاں آپ جاتے تھے۔ ہزارہا پٹھان آپ کے ساتھ جاتے تھے۔ سنہ ۱۰۵۲ھ میں آپ لاہور تشریف لے گئے۔ ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ تھی بعض مخالفوں نے شاہجہان کو خبر پہنچائی۔ کہ شیخ کے پاس اتنی جمعیت ہے۔ کہ اگر وہ چاہے۔ تو حکومت کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ شاہجہان نے اپنے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں اور مُلا عبد الحکیم سیالکوٹیؒ کو تحقیق حالات کے لئے بھیجا۔ آپ ان سے سرد مہری سے پیش آئے۔ دیر تک ملے نہیں۔ اور جب ملے۔ تو بے رُخی سے بات چیت

کی - اُنہوں نے واپس جاکر سارے حالات بادشاہ کو سُنائے - اور کہا کہ بے شمار افغان شیخ کے ساتھ ہیں ممکن ہے کوئی فتنہ پیش آئے - چنانچہ بادشاہ نے کہلا بھیجا - کہ شیخ حج کو چلے جائیں - شیخ پہلے ہی حج کو جانا چاہتے تھے - بڑی خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی - اور وہیں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہو گیا -

شیخ آدم بنوری تو حج کے لئے چلے گئے لیکن انہوں نے فیض کے جو سرچشمے لگائے ہوئے تھے - ان کا فیض جاری رہا - ان کے خلفا بے شمار تھے - ان میں سے ایک بزرگ حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی تھے - جن کے مرید شاہ ولی اللہؒ کے والد اور چچا شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا ہوئے - جن سے خود شاہ صاحب نے فیض حاصل کیا - شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں شیخ آدم بنوریؒ اور حافظ صاحب کے بہت سے واقعات لکھے ہیں - اور شیخ کی بڑی تعریف کی ہے - روضۃ القیومیہ میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کو براہِ راست شیخ آدم بنوری کا مُرید لکھا ہے :-

"شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا دونوں شیخ آدم کے معتبر خلفا سے ہیں - نہایت مُستقیم الاحوال تھے - صاحب کرامت و خوارق تھے - اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کئے جاتے تھے - حضرت قیوم رابع رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی ان کی تعریف کی ہے - اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے - انکے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں - ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے - ایک پُرانی دلّی میں دُوسرا شاہجہاں آباد کے قریب پھلت نام قصبہ میں "

جب روضۃ القیومیہ لکھی گئی - تو شاہ ولی اللہ کا عالم شباب تھا مصنف نے

شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کے ذکر کے ساتھ ان کے متعلق بھی ایک سطر لکھی ہے
"شیخ ولی اللہ۔ آپ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم
کے جامع اور شریعت اور طریقت کے سخت پابند ہیں عموماً پھلت میں
رہتے ہیں"

شیخ محمد معصومؒ:۔ حضرت مجدد الف ثانی کے دوسرے مشہور خلیفہ آپ کے
صاحبزادے عروۃ الوثقیٰ قیوم ثانی، شیخ محمد معصوم تھے۔ آپ کی نسبت حیات فرالناظرین
میں لکھا ہے:۔

"مرید و خلیفۂ والد بزرگوار خود، شیخ احمد بود۔ در تربیتِ مریداں و تعبیرِ وقائع
وحلِ مشکلاتِ ایناں، از برادران و سائر شیوخِ زماں امتیاز داشت۔ داز
تصانیفِ او سہ جلدِ مکتوبات است۔ کہ بس اسرارِ غریبہ و نکاتِ عجیبہ و
دعلومِ بدیعہ دراں اندراج یافت۔ و بنا بر استدعائے بادشاہِ دین پناہ چند بار
بہ بارگاہِ عظمت وجاہ رسید۔ باقسام تبخیل (؟)، و تکریم و انواع توقیر و تعظیم
مخصوص گشتہ بود"

آپ کی نسبت مشہور ہے۔ کہ اورنگ زیب عالمگیر آپ کا مُرید ہو گیا تھا۔ اس کا
تو کوئی ثبوت ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ عالمگیر آپ کا
اور آپ کے بھائیوں کا معتقد تھا۔[ل] اور یہ بیان بھی قابلِ تسلیم ہے۔ کہ آپ نے
اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت
کے لئے بھیجا۔ اور اورنگ زیب نے ان کے ارشادات کو توجہ اور ادب سے سُنا۔
عالمگیر نامہ میں آپ کے اور آپ کے بڑے بھائی (خازن الرحمت) شیخ محمد سعید

[ل] مکتوبات خواجہ محمد معصوم میں ایک طویل خط "شاہزادہ دین پناہ سلطان محمد اورنگزیب" کے نام ہے۔ جہادِ اصغر و جہادِ اکبر
کے فضائل ہیں (مکتوب ۲۲)۔

(المتوفی ۱۰۷۰ھ) کی نسبت لکھا ہے :-

"و شیخ محمد سعید و شیخ محمد معصوم پسرانِ شیخ مغفور، واقف اسرارِ حقائق و علوم، شیخ احمد سرہندی، کہ ہر یک در فضائل و کمالاتِ صوری و معنوی خلف الصدق آں سالکِ مسالکِ طریقت و عرفان است، بانعام سہ صد اشرفی ..... مورد نوازش گردیدند"

ایک اور جگہ یہی مورخ لکھتا ہے۔ "و بتقوے اشعار، شیخ محمد سعید خلف شیخ احمد سرہندی خلعت و دو ہزار روپیہ .... مرحمت شد"

شیخ محمد معصوم کی نسبت فرحت الناظرین کا اندراج ہم نقل کر چکے ہیں۔ اسی تذکرہ میں آگے چل کر لکھا ہے۔ کہ شیخ محمد معصوم کے دوسرے بھائی شیخ محمد یحییٰ۔ شیخ محمد سعید۔ اور موخر الذکر کے دو فرزند، شیخ سعد الدین اور شیخ عبد الاحد المعروف بہ میاں گل، کئی بار "بادشاہِ دین پناہ" کی بارگاہ میں پہنچے۔ اور الطافِ شاہنشہی سے فیض یاب ہوئے۔ اس سے اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کی عقیدت فقط شیخ محمد معصوم سے نہ تھی۔ بلکہ حضرت مجدد کے تمام خاندان سے تھی۔

شیخ محمد معصوم کا ایک اور مشہور معتقد نواب مکرم خاں تھا۔ جو پہلے لاہور کا گورنر تھا۔ اور پھر سب کچھ ترک کر کے شیخ محمد معصوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہتے ہیں۔ کہ اس کے کچھ عرصہ بعد اورنگ زیب نے مکرم خاں سے اس کی عمر پوچھی۔ تو وہ کہنے لگا۔ "چار سال" اورنگ زیب مسکرا دیا۔ تو مکرم خاں نے کہا کہ اس میں جائے تبسم نہیں۔ جتنی مدت میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں

گزاری ہے۔ وہی میری عمر ہے۔ باقی تو سب وبالِ آخرت ہے! یہ نواب مکرّم خان وہی ہے۔ جس کے دربار سے مشہور شاعر غنیمت وابستہ تھا۔ اور جس کے بیٹے کی نسبت مشہور ہے۔ کہ اُسے مثنوی نیرنگ عشق میں عزیز کا پارٹ دیا گیا ہے ؎

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں — عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

ماٰثرالامرا میں نواب آصف جاہ کا بیان درج ہے۔ کہ جب اُنہوں نے بہادر شاہ اوّل کے زمانے میں کچھ عرصہ گوشہ نشینی اختیار کی۔ تو وہ نواب مکرم خاں کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے جاتے تھے۔

خواجہ محمد معصوم کا ایک اور مشہور مُرید فارسی شاعر ناصر علی سرہندی تھا جس نے آپ کی تعریف میں کئی شعر کہے ہیں ؎

چراغِ ہفت محفل خواجہ معصوم — منور از فروغش ہند تا رُوم
رود جائے کہ جا آنجا نہ گنجد — نظر بے کار ماند پا نہ گنجد
ردائے ماہتابی شرع بر دوش — چوں صبح از پائے باطن قطب پوش
ستونِ بارگاہِ شرعِ اسلام — بہ افعالِ پیمبر گام بر گام
زہے عزت کہ ربّ العرش داد — کہ بر سر تاجِ قیومیش بنہاد

شیخ محمد معصوم کی وفات اورنگ زیب کے دسویں سالِ جلوس، ۱۰۷۹ھ میں ہُوئی۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اسے شاہجہاں کی بیٹی روشن آرا نے تعمیر کرایا تھا۔ ناصر علی نے ایک قصیدہ اس روضہ کے متعلق لکھا ہے ؎

اے زمین مولد قدسی نسب ہفت سما — رفعتِ بامِ تو از عالمِ ایجاد ورا

مظہرِ نورِ خدا ہست مزارِ ملکوت　　مرقدِ خواجہ کنم نامِ تو باعرش خدا

ناصر علی کی ایک غزل بھی روضۂ مبارک کی شان میں بتائی جاتی ہے مطلع ہے ؎

درِ فیض است منشیں از کشائش نا اُمید اینجا
برنگِ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

خواجہ محمد معصومؒ کے بعد قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبندؒ۔ قیوم رابع خواجہ محمد زبیرؒ۔ مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ۔ مولوی ثناء اللہؒ۔ شاہ عبداللہؒ۔ شاہ غلام علی دہلویؒ۔ اپنے اپنے وقتوں میں اس سلسلے کے بڑے صاحب عظمت بزرگ گزرے ہیں۔ ان میں سے ہم مرزا مظہر جانجاناں شہید کے حالات آئندہ صفحات میں درج کریں گے۔

ہم حضرت مجدد کی تصانیف کے سلسلے میں ان کے رسالہ ردِ روافض کا ذکر کر چکے ہیں۔ شیعوں کی مخالفت حضرت مجدد کی تعلیمات کا ایک ضروری جزو تھی۔ اور وہ خلفائے رابعہ کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایکدفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے خطبۂ عید کے دوران میں خلفائے راشدین کا نام نہ لیا۔ تو آپ نے فوراً اس شہر کے مشائخ و قضاۃ کو خط لکھا۔ کہ خطیب کی اِس فروگذاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی:۔

"شنیدہ شد۔ کہ خطیب آں مقام در خطبۂ عید قربانی ذکر خلفائے راشدین رضی اللہ تعالےٰ عنہم ترک کردہ و اسامی متبرکۂ ایشاں را نخواندہ ......

ونیز شنیدہ کہ اکابر و اہالی آں مقام دریں باب مساہلہ ورزیدند۔ و بشدت و بغلظت باں خطیبِ بے انصاف پیش نیامدند۔ وائے نہ یکبار بلکہ صد بار

دائے!...... چو استماع ایں خبر وحشت اثر در شورش آورد و رگِ فاروقیم را حرکت داد۔ بچند کلمہ اقدام نمود"

خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرزِ عمل تھا۔ جو ان کے والد بزرگوار کا تھا۔ اور ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اول۔شمارہ ۶۴) جسے کہا جاتا ہے۔کہ اُنھوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا۔ اور جس میں تکفیر روافض اور ان کو قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیں[1] درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے:۔

"ابودردا میں لکھا ہے۔کہ ابنِ عباسؓ نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو روافض کہیں گے۔ جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا کیونکہ یہ مُشرک ہوں گے۔"

نقشبندیہ سلسلہ کے دُوسرے بزرگ:۔ اہلِ تشیعیت کے متعلق حضرات مجددیہ کا جو نقطۂ نظر تھا۔ وہ تو مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے لیکن اس مسئلے پر دوسرے نقشبندیہ حضرات کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا۔ (نقشبندیہ سلسلے کو ماورالنہر کی خاکِ پاک سے خاص تعلق ہے۔اور شیعہ سُنّی اختلافات کو ایران و توران کی پُرانی مخالفت نے چمکا دیا تھا) اور عہدِ مغلیہ میں شیعہ سُنّی مناقشات زیادہ تر نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعے ظہور پذیر ہوئے۔ہندوستان میں

---

[1] جتنی وضعی حدیثیں اس مسئلے پر ہیں۔ شائد ہی کسی اور مسئلے کے متعلق ہوں۔ واقعہ یہ ہے۔کہ بنی اُمیہ اور بنی عباسیہ کی کشمکش کے دوران میں مخالف فریق ایسی حدیثیں گھڑ کر اپنے مخالفوں کو ذلیل اور بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس سلسلے کے بانی خواجہ خاوند محمود نقشبندی المعروف بہ حضرت خواجہ ایشان تھے۔ جو شیخ سرہندیؒ کے ہمعصر تھے۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور سمرقند۔ کابل ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ کشمیر میں آپ کے سلسلے کو خاص فروغ ہُوا۔ یہاں ان دنوں شیعہ سُنی سوال زوروں پر تھا۔ دربارِ دہلی کی طرف سے نواب مظفر خاں والئے کشمیر تھا۔ قضارا شیعوں اور اہلِ سنت کے درمیان بلوہ ہُوا۔ اور بہت کُشت و خون کے بعد قاضی ابو القاسم اور قاضی محمد عارف کی عدالت میں مقدمہ پیش ہُوا۔ اُنھوں نے اہل تشیع کی سزا دہی میں توقف کیا۔ اس سے اہلِ سُنت ناراض ہو گئے۔ اور خواجہ خاوند محمود کی سرکردگی میں شہر چھوڑ کر ہفت چنار آ گئے۔ ناظمِ صُوبہ انہیں آکر منا کے لے گیا۔ اور شیعوں کے خلاف کارروائی بھی کی۔ لیکن اس نے ساتھ ساتھ دربارِ شاہی میں خواجہ کی شکائت لکھی۔ چنانچہ وہ دربار میں بُلائے گئے۔ اور ان کے متعلق فیصلہ ہُوا۔ کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کشمیر واپس نہ جائیں۔ اس کے بعد وہ مختلف مقامات میں شاہی لشکر کے ساتھ رہے۔ اور بالآخر ۱۲ شعبان ۱۰۵۲ھ کو بمقام لاہور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے۔

خواجہ خاوند محمود تو شاہی حکم کے بعد کشمیر نہیں گئے لیکن شیعہ سنی چپقلش ان کے جانشینوں کے عہد میں جاری رہی۔ ان کے ایک سجادہ نشین خواجہ کمال الدین نقشبندی تھے۔ اُنھوں نے شیعوں کی مخالفت جاری رکھی۔ اور ان کی کوششوں سے امین نامی، ایک شیعہ کو قتل کی سزا ہوئی۔ اس سے شیعہ برافروختہ ہو گئے۔ اور ایک آدمی کو آمادہ کیا کہ وہ خواجہ صاحب کو شہید

کر دے۔ چنانچہ ۲۹؍ رجب ۱۱۸۰ھ کی رات کو (یعنی مرزا جانجاناں کی شہادت سے پندرہ سال پہلے) آپ اپنی خانقاہ میں شہید کر دئے گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد شیعوں سُنّیوں میں پھر بلوے ہوئے۔ کئی شیعے خواجہ کی شہادت کی پاداش میں قتل کئے گئے۔ خواجہ کمال الدین کے بعد ان کے صاحبزادے خواجہ سعید الدین سجادہ نشین ہوئے۔ لیکن وہ عین جوانی میں وفات پا گئے۔ اس کے بعد سجادہ نشینی کے مسئلے پر خاندان میں سخت جھگڑے ہوئے۔ "و نوبت بہ قتال و جدال رسید"۔ اس سے اس خاندان کا بازار سرد پڑ گیا۔ لیکن خواجہ خاوند محمود کے خاندان کے بزرگ کشمیر میں موجود ہیں۔ اور اس مملکت میں نقشبندیہ سلسلہ اب بھی قائم ہے +
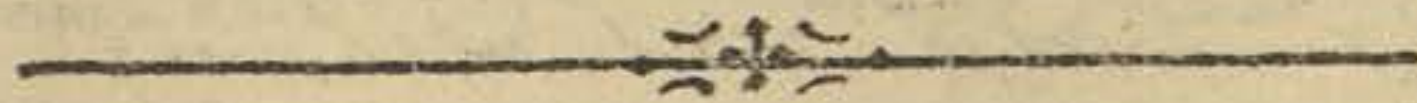
شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح

حضرت شیخ مجددؒ ایک صاحب طریقت بزرگ تھے جو طریقت اور سلوک کو شرع سے قریب تر لائے۔ اُنہوں نے کچھ تو اپنی علمی استعداد کی بدولت اور کچھ خداداد سمجھ اور قابلیت سے سلوک اور طریقت کی ایسی ترجمانی کی۔ جو اہلِ شرع کو ناگوار نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شریعت اور علومِ ظاہری کی بہ نسبت طریقت میں زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے مکتوبات میں زیادہ مباحث وہی ہیں۔ جن میں اہلِ شرع سے زیادہ اہلِ طریقت دلچسپی لیتے ہیں۔ اور بعض جگہ وہ اپنے کشف اور مشاہدات اس انداز سے بیان کر جاتے ہیں کہ انہیں شرع کے مطابق ثابت کرنے کے لئے تشریحوں اور تاویلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ پیدا ہوئے۔ جو جلال و فتوحات میں تو شیخ مجدّد کو نہیں پہنچے۔ لیکن اسلام کی خدمت اُنہوں نے بھی بہت کی۔ اور علومِ دینی کی شمعیں روشن کیں۔ انہوں نے قادریہ اور نقشبندیہ سلسلوں میں بیعت بھی کی تھی لیکن پھر بھی وہ اہلِ طریقت سے زیادہ اہلِ شریعت عالم تھے۔ اور خداوند نے انہیں علومِ اسلامی، بالخصوص علم حدیث کی خدمت کی بڑی توفیق دی۔

ابتدائی حالات

آپ کا نام شیخ عبدالحق دہلویؒ تھا۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کے سب سے بلند پایہ عالم

آپ ہی ہوئے ہیں۔ آپ نے اخبار الاخیار کے خاتمہ میں جو خاندانی حالات لکھے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آپ کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے۔ اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ شیخ عبدالحق یہیں ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری، حضرت امان اللہ پانی پتی کے مرید اور ایک خدا ترس صاحب استعداد بزرگ تھے۔ انہوں نے آپ کی تربیت بڑے نیک اصولوں پر کی۔ علوم ظاہری سے بھی آپ کو بہرۂ وافر دلایا۔ اور بے تعصبی اور انصاف پسندی کی تلقین بھی شروع ہی سے کی۔ چنانچہ آپ اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے۔ "باہیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی وکلافت نرسانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی۔ وگرنہ، دو سہ بار بگو۔ اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ را چنیں معلوم است۔" اسی طرح طمع و حرص سے بھی وہ بالکل خالی تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ حریص اور طالب جاہ عالم سے گمنام لیکن متوکل اور متقی کم علم آدمی اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق سے انہوں نے کہا۔ کہ "چوں مشاہدہ کردہ میشود۔ کہ علماء فضلا در طلب جاہ و عزت وکثرت اسباب وجمعیت اموال ونزاع وخصومت کہ باخلق مے افتند مرا اشکرانہ آید براں کہ بسیار نخواندیم واکابر نشدیم۔"

معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ عبدالحق کو شروع ہی پڑھنے، لکھنے سے بڑی رغبت تھی۔ چنانچہ اخبار الاخیار کے اخیر میں لکھتے ہیں۔ "از ابتدائے ایام طفولیت نمیدانم کہ بازی چیست وخواب کدام ومصاحبت کیست وآرام چہ

و آسائش و سیر کجا ہے

شب خواب چہ و سکوں کدام است خود خواب بعاشقاں حرام است

ہرگز در شوقِ کسب و کار، طعام بوقت نخوردہ و خواب در محل نبردہ۔" رات کا زیادہ حصہ پڑھنے میں اور دن کا زیادہ حصہ کتابیں نقل کرنے میں گذرتا۔ والدین ان سے کہتے۔ کہ محلے کے لڑکوں میں جاکر کھیلو۔ تو وہ جواب دیتے کہ آخر کھیلنے سے مقصد دل خوش کرنا ہے۔ میرا دل اس مطالعہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ کہ کئی دفعہ ایسا ہوا۔ کہ آدھی رات گذر گئی۔ اور والد نے آواز دی کہ سو جاؤ۔ تو مَیں لیٹ گیا۔ اور جب والد کی آنکھ لگ گئی۔ تو پھر اُٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ چند ایک مرتبہ تو یہ بھی ہُوا۔ کہ پڑھتے پڑھتے کتاب میں اتنے منہمک ہو گئے کہ چراغ کی لو سے پگڑی کو آگ لگ گئی۔ اور انہیں اُس وقت معلوم ہُوا جب سر کو گرمی پہنچی ہے

چہ دُود ہائے چراغے کہ در دماغ نرفت کدام بادہ محنت کہ در ایاغ نرفت
کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام چہ خارہ خارہ کہ در بسترِ فراغ نرفت
بجیرتم ز دلِ خود کہ عمر رفت و لے ز کنجِ غم کدہ ہرگز بصحنِ باغ نرفت

جب طلبِ علم کا یہ حال تھا۔ تو اس میں کوئی تعجب نہیں۔ کہ بیس بائیس برس کی عمر میں آپ نے جہاں تک دہلی میں ممکن تھا، تحصیلِ علم کی تکمیل کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ فتح پور سیکری تشریف لے گئے۔ جو ان دنوں اکبر کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں آپ نے کچھ عرصہ ملک الشعرا فیضی اور خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقاتِ اکبری کی مصاحبت میں بسر فرمایا۔ عہدِ اکبری کے

مورخ عبدالقادر بدایونی سے آپ کی یہاں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں آپ نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اپنی علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ حفظِ قرآن کی سعادت آپ کو اسی زمانے میں حاصل ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ اور اپنے ہمچشموں کی نگاہوں میں آپ بڑی عزت اور احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن آپ کا علمی اور روحانی ذوق آپ کو مزید سربلندیوں کیلئے پکار رہا تھا۔ چنانچہ ۹۹۶ھ میں آپ نے حرمین شریفین کا رُخ کیا۔ جہاں علوم اسلامی بالخصوص علمِ حدیث کی بہترین درسگاہیں تھیں۔ آپ اس سفر کے لئے ایک جذبۂ روحانی سے متاثر ہو کر، بغیر کسی ساز و سامان کے دہلی سے گجرات روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں خواجہ نظام الدین احمد گجرات کے میر بخشی تھے۔ ان کی مدد سے جہاز کا انتظام ہو گیا۔ ۹۹۶ھ کے اخیر میں مکہ معظمہ پہنچے۔ اور حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے۔ مکہ معظمہ میں آپ شیخ عبدالوہاب متقی کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ قریباً ڈھائی سال ان سے فیض حاصل کیا۔ اور علمِ حدیث کی تکمیل کر کے صحاح ستہ کی سند حاصل۔ ان سے بیعت بھی کی۔ ۹۹۸ھ میں مدینہ طیبہ کا رُخ کیا۔ اور روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منورہ کی تاریخ جذب القلوب فی دیار المحبوب کی تصنیف اسی زمانے میں شروع کی۔ لیکن اس کی تکمیل تین سال بعد، بمقام دہلی ہوئی۔

حرمین سے آپ کی واپسی ۹۹۹ھ میں ہوئی۔ اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔

اسے بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔ اخبار الاخیار۔ آداب الصالحین اور ایک دو رسالے زمانہ طالب علمی ہی میں لکھے جا چکے تھے۔ لیکن ان کی تکمیل و تصحیح سفر حجاز کے بعد ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے جو کتابیں لکھیں۔ ان کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہوگی۔ ۱۰۰۸ھ میں خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی قدس سرہٗ دہلی تشریف لائے۔ تو شیخ محدثؒ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت[1] کی۔ اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے اور مخلصانہ تھے۔ ان کے نام آپ کے خطوط مجموعہ المکاتیب و رسائل میں موجود ہیں۔ اور طبقاتِ شاہجہانی کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ جب ۱۰۱۲ھ میں حضرت خواجہ صاحب وفات پا گئے۔ تو شیخ عبد الحق نے بھی ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

"و بعد از وفات حضرت خواجہ حلاوت و چاشنیٔ خلوت و عزلت در مذاقِ حضرت مخدوم غالب آمدہ ترکِ آمد و رفتِ خانۂ عالمیاں کرد تا امسال کہ سال ہزار و چہل و شش است پائے شکیبائے ... از آن ہمیں بدرس و تلقین نیازمندانِ علم و عرفائے دہلی بر دارند و تمامی اوقات بابرکات بہ مطالعہ و درسِ حدیث و تفسیر مصروف است۔ و عام و خاص از انفاس متبرکۂ وے محظوظ و مسرور است۔ و پیوستہ بہ تصنیفِ کتب دینیہ اشتغال دارد و در علوم عقلی و نقلی تصانیف کردہ است۔ و تمام

---

[1] طبقاتِ شاہجہانی (ملاحظہ ہو تذکرۂ مصنفین دہلی از شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری ص ۱۹-۲۰)

تصانیف وے صغیر وکبیر تا سال مذکور قریب صد باشد"
شیخ عبدالحق کی عمرِ عزیز میں اللہ تعالےٰ نے بڑی برکت دی۔ اکبر اور جہانگیر دو بادشاہوں کے زمانے آپ نے دیکھے۔ اور شاہجہاں کے سولھویں سال جلوس میں انتقال فرمایا۔ وفات آپ کی ۲۱-۲۲ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کی درمیانی شب کو چورانوے سال دو مہینے کی عمر میں ہوئی۔ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطۂ مزار کے قریب حوضِ شمسی کے کنارے مدفون ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے۔ شیخ محدثؒ کی صحت میں اخیر عمر تک فرق نہیں آیا چنانچہ جس وقت آپ کی عمر نوے برس کے قریب ہو رہی تھی۔ اس زمانے کی نسبت بادشاہ نامہ میں لکھا ہے۔ "باآنکہ عقود زندگیش بہ تسعین پیوستہ است۔ از سلامت قویٰ بانواعِ طاعات و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسانِ ایامِ شباب میپردازد۔ از عقابِ دہفت تن تحصیلِ علوم رسمیہ نمودہ بہ افادہ مشغول اند"۔

شیخ سیف الدین دہلوی

شیخ عبدالحق محدث کی روحانی تربیت میں دو مختلف بلکہ متضاد اثرات کو دخل ہے۔ ایک ان کے والد ماجد شیخ سیف الدین کو، جو شیخ امان پانی پتی کے مرید اور وحدت الوجودی خیالات کے تھے۔ اور دوسرے ان کے اُستادِ حدیث، اور مرشد، شیخ عبدالوہاب متقی کو، جو تصوف کی ہر اس صورت کو جو شریعت سے دُور ہو، شبہ سے دیکھتے تھے۔ اور مشہور وحدت الوجودی مصنفین پر کڑی نظر رکھتے تھے۔

صوفیانہ ذوق وشوق اور عشق ومحبت اس خاندان میں شروع سے تھا۔

شیخ عبدالحق کے دادا بھی آزاد صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے ۔ راتوں کو جاگتے ۔ اور عاشقانہ اشعار پڑھتے ۔ ایک روز شیخ سیف الدین نے اپنے والد سے پوچھا ۔ کہ کبیر، جس کے دوہے مشہور ہیں ۔ مسلمان تھا یا کافر ۔ آپ نے فرمایا ۔ موحد تھا ۔ اُنھوں نے دہرا کے پوچھا ۔ کہ کیا موحد کو اسلام وکفر سے کوئی تعلق نہیں (کہ موحد مگرغیر کافر و مسلمان است') اُنھوں نے ٹال دیا ۔ اور کہا کہ یہ نکتہ سمجھنا بڑا مشکل ہے ۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے ۔

شیخ سیف الدین کے مُرشد شیخ امان پانی پتی وحدت الوجودی خیالات کے صوفی اور ابن العربی کے مقلد تھے ۔ شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں ۔ "وے از صوفیۂ موحدہ است از تابعانِ ابن العربی ۔ درعلمِ ایں طائفہ مرتبۂ بلند و پایۂ ارجمند داشت ۔ ودر تقریرِ مسئلہ توحید بیانِ شافی وتقریرِ وافی، وسخن توحید را فاش گفتے" ۔ ان کی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں ۔ جن کی شرع تائید نہیں کرتی "او در تصوف مشربِ مُلامتیہ داشت" یہ شیخ امان پانی پتی وہی ہیں ۔ جن کے ایک مشہور شاگرد شیخ تاج الدین بن زکریا اجودھنی کی نسبت کہا جاتا ہے ۔ کہ انہیں اکبر کے خیالات بدلنے میں دخل تھا ۔ بدایونی ان کی اکبر سے ملاقات کے سلسلے میں لکھتا ہے :-

"تمام شب شطحیات وترہاتِ اہلِ تصوف ازوے شنیدند ۔ وچوں بشرعیات مقید نبود ۔ مقدماتِ وحدتِ وجود کہ متصوفانہ معطلہ دارند ۔ وعاقبت ۔ منجر باباحت والحاد مے شوند ۔ درمیان آوردند"

شیخ سیف الدین کو شیخ امان سے بڑی عقیدت تھی ۔ جس کا اظہار اُنھوں نے

اشعار میں بھی کیا ہے ؎

ہر چہ ذہن در سخن آید یقین | ہست ہم از صحبتِ آں مردِ دیں
ورنہ چہ حد است کہ رازِ دروں | از دہن چوں منے آید بروں
من کیم و کیستم و چیستم | از دمِ عیسےٰ نفسے زیستم
اوست دریں راہ مرا راہنما | خاکِ درش چشم مرا توتیا

شیخ امان کے خیالات پر اہلِ شرع اعتراض کریں۔ لیکن ان کی علمی قابلیت میں شبہ نہیں۔ اور مریدوں کی تعلیم و تربیت بھی وہ بڑی سوچ سمجھ سے کرتے تھے۔ شریعت کی مخالفت کے باوجود طریقت کے سلسلوں کے دیرپا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان سلسلوں کے بزرگ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اپنی تعلیم و تربیت میں اس کو نظرانداز نہ کرتے تھے۔ آج کل ہمیں نفسیات کے عالم بتا رہے ہیں۔ کہ ذہن انسانی میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ ہمیں افراد کے ذہن تحت الشعور یعنی ان خیالات اور تصورات سے آگہی ہو۔ جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔ اہلِ تصوف اس اصول پر شروع سے ہی عمل پیرا تھے۔ اور سب اہلِ نظر مرشد، مرید کو تلقین کرنے سے پہلے اس کے تحت الشعور سے بخوبی واقف ہو جاتے۔ شیخ امان بھی اس اصول کو پوری طرح ملحوظ رکھتے۔ چنانچہ شیخ سیف الدین فرماتے تھے۔ کہ جب وہ پہلے پہل شیخ امان کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے کہا۔ کہ اپنے تصورات اور خیالات کا کچھ حال بیان کرو۔ شیخ سیف الدین نے جواب دیا۔ کہ مجھے تو صوفیانہ احوال ہی کوئی نہیں پیش آتے۔ میرے تصورات اور خیالات کیا ہوں گے۔

شیخ اماں نے کہا۔ کہ یہ مَیں اس لئے پوچھتا ہوں۔ کہ تمہاری طبعی مناسبت کا اندازہ لگاؤں۔ اور یہ معلوم کروں کہ تمہارے ذہن کا کیا اسلوب ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ کئی دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ سارا جہان، فرش سے لے کر عرش تک مَیں نے گھیر رکھا ہے۔ (محاطہ من است۔ و من بر ہمہ محیطم) شیخ نے فرمایا۔ کہ تمہارے دل میں توحید کا سمندر موجزن ہے۔ اور اس لئے مسئلہ توحید میں ہی زیادہ تعلیم و تربیت دی۔

شیخ محدث کے سمجھدار اور شفیق والد نے اپنے ہونہار فرزند پر اپنے خیالات مسلّط نہیں کئے۔ لیکن ان دونوں میں مسئلۂ توحید پر اکثر گفتگو ہوتی تھی۔ اور شیخ سیف الدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے۔

"شب و روز در خدمتِ ایشاں، بتذکرہ و تذکار و بحث و تکرار میگزشت و بندہ را بہمہ بانی خود قبول داشتہ محظوظ بودند۔ خصوصاً در تلقینِ علمِ توحید و تحقیق مسئلہ وحدت وجود بر وجہے کہ موافقِ علم و شہود است۔ و اگر گاہے بمقتضائے تقیید مقاماتِ علم کسبی و بقصد تحقیق ایں علوم وہبی دغدغہ و شبہ درمیان آوردہ مے شد۔ فرمودند مارا ازیں نوع شبہات و شکوک دریں مسئلہ بسیار بود۔ انشاءاللہ رفتہ رفتہ پردہ از روئے کار بکشاید۔ و جمالِ یقین روئے نماید۔"

شیخ عبدالحقؒ کا ابتدائی ماحول اس طرح کا تھا۔ تو بہت ممکن تھا۔ کہ وہ بھی ابنِ عربی اور دوسرے وحدت الوجودیوں کے رنگ میں رنگے جاتے۔ لیکن خوش قسمتی سے انہیں حجاز میں ایک ایسا اُستاد میسر آیا۔ جو ابن العربی اور اسکے

ہم مشرب بزرگوں کے خیالات پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اور جس نے شیخ عبدالحق کے ابتدائی ماحول کی تلافی کر دی۔

شیخ عبدالوہاب متقیؒ

شیخ عبدالوہاب متقی، شاید پہلے بااثر ہندوستانی عالم تھے۔ جنہوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط وتفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی۔ اور شیخ عبدالحق محدث اور شیخ طاہر پٹنی جیسی شخصیتوں پر اثر ڈالا۔ وہ ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی معزز جگہ کے مستحق ہیں۔ ان کی ولادت مالوہ کے دارالخلافہ شہر مانڈو میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ ولی اللہ امرائے سلطنت میں سے تھے۔ چند واقعات کی وجہ سے انہیں مانڈو چھوڑ کر برہانپور آنا پڑا۔ اور یہاں بھی انہیں ایک اعلےٰ منصب مل گیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد وہ اور شیخ عبدالوہاب کی والدہ رحلت کر گئیں۔ اور شیخ عبدالوہاب صغیر سنی میں یتیم ہو گئے۔ ان پر پتہ نہیں، ان حوادث کا اثر ہُوا یا کوئی اور باعث تھا، اُنہوں نے وطنِ مالوف چھوڑ کر سیاحت اختیار کی۔ اور گجرات۔ دکن۔ لنکا۔ اور دوسرے ممالک کی سیر کی۔ جہاں کہیں جاتے۔ طلبِ علم اور صحبتِ اہل اللہ میں منہمک ہو جاتے۔ بالآخر عنفوانِ شباب میں مکہ معظمہ تشریف لائے۔ اور شیخ علی متقی، کی صحبت اختیار کی۔ موخر الذکر کے شیخ عبدالوہاب کے والد سے تعلقات تھے۔ اور انہیں بھی اپنے والد نے وصیت کی تھی۔ کہ اگر ہو سکے تو تم شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنا۔ اور شیخ غوث گوالیاری اور اِس قسم کے لوگوں سے بچے رہنا

دوالد بزرگوارِ ایشاں نیز وصیت کردہ بود۔ کہ اگر ترا توفیقِ سلوکِ راہِ حق دست دہد ملازمت شیخ علی متقی وامثالِ ایشاں اختیار کنی۔ و از صحبتِ فلاں و امثال وے

ویکے از شیخان زمانہ را نام برد ندکہ بدعوتِ اسماء و تسخیرِ ملوک مشہور بود۔ پرہیز نمائی۔)
آخر کار شیخ عبدالوہاب متقی، شیخ علی متقی کے مرید ہوئے۔ اور بارہ سال تک، یعنی
۹۶۳ھ سے شیخ کی وفات تک ان سے ہر طرح کا فیض حاصل کیا۔

شیخ علی متقی، جن سے شیخ عبدالحق نے شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے
فیض حاصل کیا۔ خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور
ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔ چشمۂ کوثر میں ہم لکھ چکے ہیں
کہ جب شیخ غوث گوالیاری نے ایک رسالے میں اپنے معراج کا دعوےٰ کیا۔ تو
شیخ علی متقی نے ان پر اعتراض کئے۔ یہ تقوےٰ اور پرہیزگاری تمام عمر ان کے
ساتھ رہی۔ جب وہ گجرات میں تھے۔ تو اُن کے علم و تقوےٰ کی وجہ سے خاص
و عام ان کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ بادشاہ گجرات نے ان سے ملنے
کی خواہش کی۔ لیکن اُنہوں نے انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ بادشاہ کے لباس وضع
میں کئی باتیں خلافِ شرع ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ وہ میرے سامنے آئے
اور مَیں اُن پر اعتراض نہ کروں۔ لیکن قاضی عبداللہ سندھی جو بادشاہ کا
پیغام لے کر گئے تھے۔ اس سے نہ جھجکے۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ آپ، جو مناسب
سمجھیں، کہیں۔ لیکن بادشاہ کو آپ سے ملنے کی بڑی خواہش ہے۔ آپ اسے
محروم نہ رکھیں۔ چنانچہ جب بادشاہ آیا۔ تو آپ نے اسے مناسب نصیحتیں کیں۔
گجرات میں قیام کے بعد شیخ علی متقی پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور درس و
تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔

شیخ عبدالوہاب کو اس طرح کے اُستاد ملے ہوں۔ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے

کہ ان کے اپنے خیالات کا کیا اسلوب ہوگا۔ شیخ علی کے علاوہ اُنھوں نے حرمین کے دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور جب شیخ عبدالحق مکہ معظمہ پہنچے۔ تو اس وقت ان کا شمار وہاں کے بہترین علما میں سے ہوتا تھا۔ اور ہندوستانی طلبا کے لیئے تو وہ خاص طور پہ ایک آیۂ رحمت تھے۔ شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں ان دونوں بزرگوں کے حالات بڑی تفصیل اور عقیدت سے لکھے ہیں۔ ان سب کا اعادہ ضروری نہیں۔ لیکن تصوّف اور مشہور متصوفین کی نسبت شیخ عبدالوہاب کے خیالات، اس زمانہ کی عام روش سے اس قدر ممتاز و منفرد ہیں۔ کہ ان کا تفصیلی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

"طریقۂ ایشاں درباب کتب حقائق و توحید مثل نصوص و امثال آں توقف و تسلیم است۔ اینہا را درس نگویند۔ و بداں اشتغال نکنند۔ و انکار ہم نکنند و بد نگویند"

ان کا فرمانا تھا۔ کہ مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ اپنا ظاہر اور باطن سنتِ نبوی کے مطابق آراستہ کریں۔ اور اس میں استقلال حاصل کریں۔ اس کے بعد صوفیہ نے جو کچھ کہا اور لکھا ہے۔ اُسے بھی دیکھیں۔ اور حقائق و اسرار کی کتابیں پڑھیں۔ لیکن ان میں جو الجھنیں ہوں۔ ان میں نہ پھنسیں۔ اور طبیعت میں خلجان کو راہ نہ دیں یہ ہرگز نہ کریں کہ عقائد کی ابتدا ہی ان کتابوں سے کریں۔ اور جو کچھ ان میں ہے۔ اس کے تابع ہو جائیں۔

اختلافی مسائل میں آپ کا طریقہ بڑی راست روی پر مبنی تھا۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ جو کچھ سُنا جائے، خواہ وہ غلطی پر مبنی ہو۔ فوراً اُس کے خلاف تعصب اور مخالفت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ پہلے خود سُننا چاہیئے۔ کہ کیا کہا جا رہا ہے۔

اور اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ کہ قائل کا مدعا کیا ہے۔ اس کے بعد اگر ہو سکے۔ تو اسے حق سمجھیں یا اس کی تردید کریں۔ اور اگر یہ فیصلہ نہ ہو سکے۔ تو اس کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اس سے عقیدہ میں خلل نہ پڑے۔

صوفیہ میں انسان کامل کے نام سے شیخ عبدالکریم کی ایک مشہور کتاب مستعمل ہے۔ جو شیخ ابن العربی کی تصانیف کے اصولوں پر ہے۔ اس کے اور شیخ عبدالکریم کی دوسری تصانیف کے متعلق شیخ عبدالوہاب کی رائے پڑھنے کے قابل ہے:۔

"روزے کتابے راذکر کردند۔ کہ نام وے انسانِ کامل است۔ فرمودند۔ کہ آں کتابے است۔ در حقائق و توحید بر طرزِ کتب شیخ ابن العربی تصنیف شیخ عبدالکریم جیلی کہ در عدن بودہ اند از متاخرین مشائخ یمن جامع علم و حال۔ بعد ازاں سخن در تعریف ایں شیخ عبدالکریم کردند۔ و فرمودند۔ کہ ایشاں تفسیرے نوشتہ اند۔ و بر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نوزدہ (۱۹) مجلد نوشتہ بعدد حروف۔ و بر ہر حرفے مجلدے دوسہ ازاں دیدہ شد۔ شگرف علوم ذکر کردہ اند۔ بعد ازاں فرمودند اما در وے زہرہاست۔ آں را شکر اندودہ کردہ اند۔ اگر از آنہا پرہیز تواند کرد۔ مبارک است۔ و اِلّا احتمالِ ضرر غالب است۔"

ان کا فرمانا تھا۔ کہ سلوک اور باطنی تعلیم کے لئے بھی توحید وجودی کا وہ طومار جو فصوص الحکم اور اس طرح کی کتابوں میں درج ہے۔ اخذ کرنا ضروری نہیں۔ اصل ضرورت ریاضت کی ہے۔ جو اہلِ سنت و الجماعت کے اعتقاد کے مطابق ہو۔ پھر طبیعت میں ذوق اور حال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے باطنی احساسات تیز ہو جاتے ہیں۔ کلمہ گویوں کی تکفیر کے معاملے میں بھی وہ کافی محتاط تھے۔

"مے فرمودند۔ کہ ہر کرا بینند۔ کہ بکلمۂ اسلام اقرار مے کند۔ و نماز و روزہ
ادا مے کند۔ از وے اگر امثالِ ایں کلمات چیزے صادر شود۔ معذور دارند
و تکفیر و تشنیع نکنند۔ و نسبت بالحاد نکنند۔ اما اگر ایں چیز ہا نباشد۔ وایں
سخناں بگوید۔ او ملحد است۔ او را منکر باید بود"۔

سماع کے متعلق، جو ہندوستان کے بعض فرقوں میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔
آپ کی رائے تھی۔ کہ گاہ گاہ اشعارِ درد انگیز سُننے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن
جس طریق سے اسے ہندوستان کے صوفیوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ " اصلاً
جائز نہ نباشد۔ و نباید کرد۔ و اجتناب ازاں واجبات وقتِ طالبِ حق است"۔

شیخ عبد الحق ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "کہ دریں زماں بدانش ایشاں در
علومِ شرعیہ کمتر کسے خواہد بود"۔ اور باوجودیکہ وہ فقہ، حدیث، لغت میں امامِ
زمانہ تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی طلب ہمیشہ جاری رکھتے۔
ان کا قول تھا۔ علم بمنزلۂ غذا ست۔ کہ ہمیشہ احتیاج بآں باقی است" ذکر کو وہ
بمنزلہ دوا سمجھتے۔ جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ بزرگانِ
سلف کا قاعدہ تھا۔ کہ وہ "اعمالِ خیر"۔ "تہذیبِ اخلاق" اور "نشرِ علوم" کو باقی
سب چیزوں کے مقابلے میں اہمیت دیتے اور یہی سلامتی کا راستہ ہے۔

ایک دفعہ ان کی صحبت میں کسی نے مشائخ کا یہ قول دُہرایا۔ کہ طالب کو ہمیشہ
ذکر میں مشغول رہنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ جو کوئی نیک کاموں میں مشغول
ہے۔ وہ فی الحقیقت ذکر ہی کر رہا ہے۔ " نماز گزاردن ذکر است و تلاوتِ قرآن
ذکر است و درسِ علومِ دینیہ ذکر است۔ و ہر چہ عملِ خیر است ذکر است"!!

آپ نے شیخ عبدالحق کو بڑی محبت سے تعلیم کیا۔ اور علوم شریعت و طریقت میں طاق کر کے اپنا "مجازِ مطلق و خلیفۂ کل" بنایا۔ شیخ عبدالحق عہدِ اکبری کی بے راہروی سے بددل ہو کر حجاز گئے تھے۔ اور شاید یہ علم و مذہب کا پرستار وہیں رہ جاتا۔ لیکن شیخ عبدالوہاب نے انہیں کہا۔ کہ آپ کو ہندوستان جا کر علومِ دینی کی شمعیں روشن کرنی چاہئیں۔

شیخ محدّث کی علمی خدمات

مورخین اس پر متفق ہیں کہ اگرچہ فنِ حدیث کے فاضل شیخ عبدالحق محدّثؒ سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن اس علم کو پہلی دفعہ آپ ہی نے عام کیا۔ تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے۔ "علمِ حدیث بہ محروسۂ ہندوستان ازو شیوع یافتہ"۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں نقل کرتے ہیں:۔

"بہ نشرِ علوم سیّما علم شریف حدیث پرداختہ بہ نہجے کہ در دیارِ عجم احدے را از علمائے متقدمین و متاخرین دست نداده است۔ ممتاز و مستثنےٰ گردید۔ و در فنون علمیہ خاصتہً فن حدیث کتب معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علمائے زماں اعتنا باں ورزیدہ، دستور العمل خود دارند"۔

مولٰنا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں علمِ حدیث کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مولٰنا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی۔ اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں قائم کیا"۔

شیخ محدّثؒ نے نہ صرف درس و تدریس کے ذریعے علمِ حدیث کی اشاعت کی۔

بلکہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کا علمی پایہ اب تک مسلّم ہے۔ عربی میں
ان کی مشہور کتاب لمعات ہے جو "مشکوٰۃ" کی شرح ہے۔ اور جسے چھ سال
کی محنت کے بعد اُنہوں نے ۱۰۲۵ھ میں مکمل کیا۔ اس کے دیباچے میں
اُنہوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علم حدیث پر تبصرہ کیا ہے۔ اور فقہ
حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے حدیث
کے اسناد اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ لیکن شاید ان کتابوں
سے بھی زیادہ مفید کتاب اشعتہ اللمعات تھی جو فارسی میں مشکوٰۃ کی شرح
ہے۔ اور لمعات سے زیادہ مفصّل ہے۔ اس کتاب کا آغاز اُنہوں نے لمعات
کے ساتھ ۱۰۱۹ھ میں کیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل میں دیر لگی۔ مولینا ابوالکلام
آزاد لکھتے ہیں۔ "حضرت شاہ عبدالحق محدّث جس دورِ علم و تعلم کے بانی ہوئے۔
اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں
جو مُلک کی عام زبان تھی تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب
نے "مشکوٰۃ" وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق
نے صحیح بخاری کا۔"

شیخ عبدالحق کا خاص مرتبہ علم حدیث کی اشاعت کی وجہ سے ہے۔
لیکن اس کے علاوہ اُنہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں بعض اب بھی رائج
ہیں۔ مثلاً جذب القلوب فی دیار المحبوب جس کا ترجمہ "تاریخ مدینہ منورہ"
کے نام سے اردو میں شائع ہوا ہے۔ مدارج النبوۃ (۱۰۴۰ھ) جس میں رسولِ کریم
کی مفصّل سوانح عمری ہے۔ اور "شرح فتوح الغیب" جس میں حضرت غوثِ اعظم

کے ارشادات کی تشریح ہے۔ آپ کی ایک دلچسپ تصنیف زاد المتقین الی طریق الیقین ہے۔ جس میں ان شیوخ و اساتذہ کے حالات لکھے ہیں۔ جن سے آپ نے سفر حجاز میں فیض حاصل کیا۔ ذکر الملوک ایک تاریخی کتاب ہے جس میں سلطان محمد غوری سے اکبر کی تخت نشینی تک کے واقعات لکھے ہیں۔ ایک مختصر رسالہ "مصنفین دہلی" کے حالات میں ہے۔ جس کے آخر میں اپنی تصانیف کی مفصل فہرست دی ہے۔

ان کے علاوہ اخبار الاخیار[1] میں آپ نے ہندوستان کے اولیا اور بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ شروع میں تبرکاً حضرت غوث اعظمؒ کے حالات دئے ہیں۔ جن کے سلسلۂ قادریہ میں آپ نے کئی بزرگوں سے بیعت کی تھی۔ پھر اولیا کے تین طبقے ترتیب دئے ہیں۔ پہلے میں خواجہ بزرگ اجمیریؒ اور ان کے معاصرین اور مریدین کے حالات ہیں۔ دوسرے میں بابا فریدؒ اور ان کے ہمعصر بزرگوں اور مریدوں کے اور تیسرے طبقے میں حضرت چراغ دہلیؒ سے لے کر اپنے زمانے

---

[1] اس کتاب اور شیخ محدث کے متعلق جہانگیر کی رائے دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔ وہ چودھویں سال جلوس (آغاز ۱۰ مارچ ۱۶۱۹ء) کے واقعات میں لکھتا ہے۔ "شیخ عبد الحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و اربابِ سعادت است۔ دریں آمدن دولتِ ملازمت دریافت۔ کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوالِ مشائخ ہند (اخبار الاخیار) بہ نظر در آمد۔ خیلے زحمت کشیدہ ہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می برد۔ مردِ گرامی است۔"

تک کے مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں اپنے بزرگوں کا تذکرہ اور ۹۹۵ھ تک کے اپنے بعض حالات درج کئے ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ تذکرہ نہایت اہم ہے۔ ایک تو آپ نے حتی الوسع مستند واقعات لکھے ہیں۔ دوسرے طرزِ ادا پاکیزہ اور بلیغ اور موثر ہے۔ غیرضروری جزئیات سے پرہیز کیا ہے۔ لیکن کام کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ہم نے یہ کتاب کوئی دس دفعہ پڑھی ہے۔ اور ہر دفعہ قوم کی مذہبی اور علمی تاریخ کی نسبت نئے نکتے نظر آئے ہیں۔ آپ کی کتابوں کی کل تعداد سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس تعداد میں وہ اڑسٹھ رسائل بھی شامل ہیں جو ایک جلد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے۔ اور حقی تخلص کرتے تھے ؏

مکتوبات آپ کی ایک یادگار وہ خطوط ہیں۔ جو آپ نے اپنے زمانے کے اہلِ کمال کو لکھے ہیں۔ مجموعۃ المکاتیب و رسائل میں آپ کے اڑسٹھ خطوط ہیں۔ شروع میں آپ نے اپنی تصنیف و تدریس کے اصول بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"ایں بندہ مامور است کہ جز در ابواب دین و ملت کہ باعثِ ترویج و تجدیدِ شریعت و موجبِ حفظِ عقائد و احکامِ سنت باشد تکلّم نکند۔ و از دائرۂ اعتدال و حیطۂ احتیاط بیروں نیفتد۔ و باشاراتِ وجدیہ و تاویلاتِ باطنیہ دست نزند"

ان خطوط میں سے کچھ آپ نے شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں لکھے۔ کچھ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں۔ کچھ اپنے بیٹے شیخ نورالحق کے نام اور کچھ خانخاناں۔ فیضی۔ شیخ ابوالخیر مبارک اور بہت سے نواب مرتضےٰ خاں (شیخ فریدؒ) کے نام۔ ان خطوط میں

معاصرانہ واقعات کا ذکر قریباً ناپید ہے۔ سوائے نواب مُرتضےٰ خان کے نام ایک خط کے، جس میں اکبر کی وفات کے سلسلے میں پیغمبروں کی خصوصیات پر نہایت احتیاط سے پُرمعنی تبصرہ کیا ہے۔ درحقیقت یہ خطوط مُستقل رسائل ہیں جن میں مختلف مسائل کے متعلق آپ نے اپنی رائے لکھدی ہے۔ آپ بالعموم اپنی رائے کو لفاظی اور انشا پردازی سے قوی نہ بناتے تھے۔ بلکہ "ائمہ دین کہ جامع طریقین و متفق علیہ فریقین اند" کی آرا بالتفصیل درج کر کے ایک ایسا جامع اور مستند مضمون لکھ دیتے۔ جس کے نتائج سے کسی منصف مزاج کیلئے اختلاف ناممکن تھا۔ مثلاً آپ کا چھٹا خط سماع پر ایک طویل رسالہ ہے۔ جس میں رسولِ کریمؐ کے وقت سے لے کر متاخرین تک کے اکثر بزرگوں کے اقوال جمع کیے ہیں۔ اور اُسی رائے کی تائید کی ہے۔ جو سلامتی کا راستہ دکھاتی ہے۔

نواب مرتضےٰ خاں کے نام آپ کے کئی خطوط ہیں۔ ایک خط میں شریعت و طریقت کا تعلق بڑی سلامت روی سے واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"حقیقت روحِ شریعت و شریعت صورتِ او۔ شریعت اعتقاد کردن بود بدانچہ خبر دادہ اند۔ و کار کردن بدانچہ فرمودہ و حقیقت مشاہدہ کردن و بچشمِ عیاں آں را دریافتن بود۔ حقیقت حقیقتِ شریعت و کُنہ اوست۔"

حسبِ معمول بزرگوں کے اقوال سے اپنے اس نظریے کی تائید کی ہے۔ حضرت غوث اعظم کے ایک قول کا ترجمہ کیا ہے" کہ ہر حقیقت کہ شریعت آں را رد کند زندقہ است"۔ ایک اور بزرگ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ آدمی کو چاہیئے "کہ حالِ باطن را

بر عملِ ظاہر مقدم ندارد تا از دائرۂ ادب و اعتدال بیروں نیفتد" آگے چل کر لکھا ہے :-

"و نیز فرمود- فقیہ صوفی باش نہ صوفیٔ فقیہ- یعنی اوّل عملِ شریعت و فقاہت را بدست آر و داد آں بدہ- پس از آں بذروۂ حقیقت بر آ- ایں روش بہ سلامت نزدیک تر و اساس آں محکم تر است و اگر ہم از اوّل صوفی باشی و تابع حال باشی از راہِ سلامت دور اُفتی و بنیادِ کار سُست گردد و از علم بہ شوقِ ترقی و تعطش کمال در طریقۂ تصوّف و اہلِ حال تواں آمد لیکن بعد از غلبۂ ذوق و حال رجوع بعلم و تفقہ دُور تر اُفتد"

اس کے بعد بتایا ہے- کہ اس صراطِ مستقیم پر چلنے سے شریعت اور طریقت ایک نظر آتے ہیں- اور حقیقتاً وہ ایک ہی ہیں" بالجملہ دین یکے است- دو نمیشود"! ایک خط میں مسئلہ جبریہ و قدریہ دونوں عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نزدِ اہلِ حق ایں ہر دو مذہب باطل بود- چنانچہ گفتہ اند لا جبر و لا قدر و راہ راست آں باشد کہ عمل کند و آں را نسبتے بخود نیز اثبات کند- و با وجود آں بداند کہ آں اثر و عمل کہ موجود آمدہ ہمہ بخلق و توفیق پروردگار است"

اس کے بعد ان بحثوں میں پڑنے کی فضولیت ظاہر کی ہے :-

"و مسئلہ قضا و قدر و اختیار بندہ از غوامض اسرار است- ایں جا ایمان باید آورد- و در حقیقت بحث و گفتگو دریں جا لا طائل بود- و ہیچ عملے و ہیچ حقیقتے موقوف بر کشف ایں اسرار نبود- عمل باید کرد و کوشش باید نمود"

اس کے بعد ایک بڑی پرمعنی حدیث کا ترجمہ کیا ہے- کہ "پروردگار تعالیٰ بندگان را

روزِ قیامت از امر و نہی خواہد پرسید۔ نہ از ذات و صفاتِ خود!"

ایک خط میں نواب مُرتضےٰ خاں کو ترویج دین کی فضیلت بتائی ہے۔ اور لکھا ہے:۔

"وبحقیقت ہیچ صفتے و ہیچ کارے کہ باعث قبول و سفید رُوئی مرد در بارگاہِ عزت و درگاہ نبوت تواند شد۔ بالاتر ازاں نیست کہ در تقویت دین و ملت و ترویج و تائید سنت کوشد و دراں بذل مجہود نماید و در سوادِ آں لشکر اگرچہ تن تنہا باشد بیفزائد۔"

نواب صاحب کے ساتھ اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت بھی آپ کی خط و کتابت جاری تھی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ نواب مُرتضےٰ خان اور دُوسرے اُمرا نے جہانگیر سے ترویجِ دین کے متعلق جو وعدہ لیا تھا۔ اس میں آپ کی تعلیم و تلقین کو بھی دخل ہو۔

منتخب التواریخ میں خافی خاں آپ کی نسبت لکھتا ہے:۔

"شیخ عبد الحق دہلوی از افضل الفضلائے آں عہد و از محدثانِ مشہور بُود۔ بکعبۃ اللہ رفتہ بعد ادائے حج واجب مدتِ مدید محض برائے تحقیقِ صحتِ احادیث دراں مکان بسر بردہ۔ صد کتاب از علوم عقلی و نقلی تالیف فرمودہ۔ خصوصِ شرح مشکوٰۃ و تاریخِ مدینہ کہ دراں ذکر حضرت ائمۂ طاہرین و ظُلم و تعدیٔ مخالفین باظہار کمال حسنِ عقیدت نمُودہ، و تکمیل الایمان کہ مشتمل است بر ذکر عقائد از تالیفہائے مشہور آں واصل باللہ۔ زیادہ از صد سال مرحلۂ عمر طے نمودہ تا اواخر عہدِ جہانگیر بادشاہ بود۔ در صلاح

و تقوے کہ لازمۂ علم با عمل است ممتاز بود۔ در ادائے فرض وسنن تا دمِ واپسیں دقیقۂ فرو گذاشت ننمود۔ گویند بعد مراجعت از کعبۃ اللہ اکثر بزبانِ صداقت بیان او جاری میگردید۔ کہ تا بہ بیت اللہ رفتہ، مدتے مقیم گشتہ صرف اوقات برائے تحقیقاتِ احادیث نمودم، ندانستم کہ بیشتر احادیثِ مشہورہ وضعی است۔ مقبرۂ ایشاں در دہلی نزدیک مزار حضرت خواجہ قطب الدین واقع شدہ است۔"

ایک اور جگہ یہی مورخ لکھتا ہے:۔

"دیگر شیخ عبدالحق دہلوی کہ در کمالاتِ صوری و معنوی و تحصیل علوم عقلی و نقلی خصوص تفسیر و حدیث در ہندوستان ثانی نداشت۔ صد کتاب از تالیفِ او در اکثر علوم نوشتہ شدہ۔ از انجملہ شرحِ مشکوٰۃ در حدیث اعتبار و اشتہار دارد و از حفظِ کلام اللہ و طوافِ بیت اللہ نیز سعادت جاودانی حاصل نمودہ بود۔"

عُلمائے عصر

شیخ نورالحق:۔ شیخ محدثؒ کی اولادِ معنوی بہت تھی لیکن اولادِ ظاہری میں بھی وہ بڑے خوش قسمت تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا نورالحق، عہدِ شاہجہانی میں کئی معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں شرحِ صحیح بخاری اور شرحِ صحیح مسلم بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے نواب مرتضٰے خاں کے ایما پر ہندوستان کی مختصر تاریخ لکھی۔ اور اسے زبدۃ التواریخ کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا

ترمیم شدہ نسخہ ہے۔ لیکن اس میں عہدِ اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۳ء) میں ہوئی۔ فرحت الناظرین میں آپ کی نسبت لکھا ہے:۔

"فاضل محدث و عالم متبحر بود۔ خلیفہ و جانشین پدر خود، عبدالحق دہلوی است رحمتہ اللہ علیہ۔ و شیخ مذکور نسبت و ارادت بہ سلسلۂ قادریہ سادالیۃ (شاذلیۂ) داشت۔ و او برسی جزو، بر صحیح بخاری شرحے وافی داشت و مفصلات و مشکلاتِ احادیث را حل ساختہ و در تقویتِ مذہب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ، جہدِ بلیغ نمودہ، و احادیثِ مخالف ایں مذہب را تاویلاتِ خجستہ فرمودہ و بر عضدی و شرح مطالع و شرح ہدایہ و حکمت و دیگر کتب متداولہ حواشی دارد و در نظم و نثر وحیدِ زماں بود۔ ایں رباعی از دست ؎

از شیوۂ ہمدمانِ ایں دورِ خلاف　　　گویم رمزے اگر نگیری بگزاف

چوں شیشۂ ساعت اند پیوستہ بہم　　　دلہا ہمہ پُر غبار و رُوہا ہمہ صاف

بارہا بہ ملازمت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بعنایات بادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود"۔

آپ کا تخلص مشرقی تھا۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے:۔

"مشرقی تخلص، شیخ نورالحق دہلوی خلف عبدالحق بُود۔ در بحرِ تحفۃ العراقین مثنوی دارد و دیوانش قریب پنج ہزار بیت است۔ از دست ؎

با آنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چوں گل است

با ہیچکس چوں چشم حباب آشنا نبود

حضرت شیخ عبدالحق کا زمانہ علم و فضل میں بڑا خوش قسمت تھا۔ اس وقت کھمبائت اور سورت کی بندرگاہیں رونق پر تھیں۔ اور مدینہ منورہ کے راستے کھُلے تھے۔ جن لوگوں کی قسمت میں تھا۔ اُنہوں نے وہاں جاکر علوم دینی حاصل کئے۔ اور واپس آکر ہندوستان کو سیراب کیا۔

مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی: ہندوستان میں اس وقت اسلامی علوم کے چار بڑے مراکز تھے۔ ایک دہلی، دوسرے پنجاب، تیسرے پُورب (یعنی جونپور۔ الہ آباد۔ اور لکھنؤ کا علاقہ)۔ چوتھے گجرات۔ دہلی میں خود شیخ عبدالحق علمی مجلس کے صدر نشین تھے۔ پنجاب میں ان دنوں مُغل گورنر سے ناراضگی کی بناء پر کشمیر سے ایک بزرگ، ترکِ مکان کرکے سیالکوٹ آئے تھے۔ جنہوں نے پنجاب کی علمی شہرت کو پھر ایک مرتبہ فروغ دے دیا۔ یہ بزرگ مُلا کمال الدین کشمیری (۱۰۱۷) تھے۔ جن کے تلامذہ میں نواب سعداللہ خاں، وزیر اعظم ہندوستان، حضرت مجدّد الف ثانی، اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام لئے جاتے ہیں۔ ان کا علمی فیض علامہ عبدالحکیم نے جاری رکھا۔ انہیں عہدِ شاہجہانی میں بڑا فروغ ہُوا۔ اور دو مرتبہ بادشاہ نے انہیں سونے چاندی سے تُلوایا۔ اور ان کے وزن کے مطابق چھ چھ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ آپ ایک زمانے میں اکبر آباد کے سرکاری مدرسہ میں، جسے اکبر نے جاری کیا تھا۔ مدرسِ اعلےٰ مقرر ہوئے۔ اور یہاں مشہور شاعر قدسی کے ساتھ، ایک ہی وقت میں فرائضِ درس و تدریس سر انجام دیتے تھے۔ آپکی تصانیف کئی ہیں۔ ایک رسالہ دُرِ ثمینیہ ہستیٔ باری تعالےٰ کے ثبوت میں ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ آپ نے اسے دربارِ شاہجہان میں بار یابی

کے وقت پیش کیا۔ باقی تصانیف شرحیں اور حاشیئے ہیں۔ جنہیں آپ نے اپنے تلامذہ اور دوسرے اہلِ علم کی سہولت کے لئے مرتب کیا۔ مثلاً حاشیۂ تفسیر بیضاوی۔ حاشیۂ شرح عقائد تفتازانی۔ حاشیۂ شرح شمسیہ تکملہ حاشیۂ عبد الغفور اور حاشیۂ خیالی، جس کی نسبت ذیل کا شعر مشہور ہے ؎

خیالاتِ خیالی بس عظیم است
برائے حلّ او عبد الحکیم ہمت

شیخ محب اللہ الہ آبادی:۔ اضلاعِ پُورب میں بھی کئی قابلِ ذکر ہستیاں علم و فن کی اشاعت میں مشغول تھیں۔ ایک خاص رنگ اور شان کے بزرگ شیخ محب اللہ الہ آبادی تھے۔ جو علومِ ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ اور جن کی نسبت تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے۔ "تحقیقات و تدقیقاتش در علمِ تصوف بدرجۂ اجتہاد رسیدہ بلکہ مے رسد کہ شیخ محی الدین ابن العربی را شیخِ اکبر و وے را شیخِ کبیر گویند" دارا شکوہ آپ کا بڑا مداح تھا۔ بلکہ وہ ایک خط میں آپ کو لکھتا ہے۔ کہ الہ آباد کی گورنری سے مجھے اس کی خوشی ہے۔ کہ آپ سے ربط ضبط ہو سکے گا۔ آپ کی تصانیف زیادہ تر علمِ تصوف میں یا خواص کے عقائد کے متعلق ہیں۔ مثلاً شرح فصوص (عربی) شرح فصوص (فارسی) مغالیط عامہ۔ سرّ الخواص۔ عبادت الخواص۔ طرق الخواص عبادت اخص الخواص۔ رسالہ وجودِ مطلق۔ ان کے علاوہ انہوں نے رسالہ تسویہ کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے۔ جس پر عہدِ عالمگیری میں بڑا ہنگامہ برپا ہُوا تھا۔ اس میں انہوں نے وحی کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جو سر سیّد کے ہمخیالوں کو تو عجیب معلوم نہ ہوں۔ لیکن عام اسلامی عقائد کے ضرور برخلاف ہیں

اس پر علما نے اعتراض کیا۔ اور عہدِ عالمگیری میں، جب مصنف کی وفات ہو چکی تھی۔ بادشاہ سے استدعا کی۔ کہ اس رسالہ کی تمام نقلیں جلادی جائیں۔ اور جو لوگ اس کے قائل ہوں۔ ان پر حدِ شرعی نافذ کی جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ممالکِ محروسہ کے تمام درویش حاضر کئے جائیں۔ (کہ درویشانِ قلمروِ پادشاہ را در معسکرِ سلطانی احضار نمایند)۔ اور رسالے کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر پہلا حکم تو منسوخ ہوا۔ لیکن رسالے کی جو نقلیں دستیاب ہوئیں۔ انہی تلف کردیا گیا۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی کی وفات ۱۰۵۸ھ میں ہوئی۔ ان کے تلامذہ و خلفا میں قاضی گھاسی کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جن سے علمائے فرنگی محل۔ لکھنؤ کے مورث اعلٰے ملا قطب الدین شہید سہالوی نے فیض حاصل کیا۔ جسے ان کے بیٹوں نے تمام ہندوستان میں عام کیا۔

ملّا محمود جونپوری:۔ بلادِ شرقی کے علما نے تصوّف اور علم الاسرار میں نہیں، بلکہ معقولات میں امتیاز حاصل کیا۔ اور اس کی ابتدا بھی اس زمانے میں ہوگئی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث کے ایک ہمعصر ملّا محمود جونپوری (۱۰۶۲ھ) تھے۔ جنہوں نے معقولات میں فروغ پایا۔ اور علم حکمت میں ایک کتاب شمس بازغہ تصنیف کی۔ جو اب بھی بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علم بلاغت میں ایک کتاب جرائد اور بعض مختصر رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ ان کی نسبت تذکرۂ علمائے ہند کے مولف لکھتے ہیں۔ "اگر بوجودش ہنرزمین جونپور بمرز بوم شیراز تفاخر مے جست، روا بودے"۔

شیخ محمد طاہر پٹنی:۔ گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد طاہر پٹنی (وفات ۹۸۶ھ)

اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (۹۹۸ھ) نے پائی۔ شیخ محمد طاہر صرف عالم ہی نہ تھے۔ بلکہ مبلغ اور قاطع بدعت بھی تھے۔ اور انہوں نے ردِ بدعت کی کوششوں میں شہادت پائی۔

وہ گجرات کے قدیم دارالخلافہ پٹن کے باشندے تھے۔ کتب متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد حرمین پہنچے۔ وہاں کے علمائے کبار سے مدتوں فیض حاصل کیا۔ اور علم حدیث میں متعدد بزرگوں سے سند لی۔ زیادہ عقیدت انہیں شیخ علی متقی سے تھی۔ جن کے وہ مرید بھی ہو گئے تھے۔ حجاز سے واپسی کے بعد وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ مرشد کی ہدایات کے مطابق وہ طلبہ کی ضرورت کے لئے ہمیشہ سیاہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ درس میں مشغول ہوتے اُس وقت بھی یہ شغل جاری رہتا۔ ان کی تصانیف کئی ہیں۔ ایک کتاب مجمع البحار ہے۔ جسے صحاح ستہ کی شرح سمجھنا چاہیئے۔ ایک رسالہ تصحیح اسماء الرجال میں ہے۔ دو کتابیں موضوع حدیثوں کے متعلق ہیں۔ تذکرہ الموضوعات در بیانِ احادیثِ موضوعہ اور قانون الموضوعات فی ذکر الضعفا۔

وہ قوم کے بوہرے تھے۔ اور ان کی کوشش تھی۔ کہ اپنی قوم سے تمام بدعتیں دور کر دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے عہد کیا۔ کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے بری نہ ہو جائے گی۔ مَیں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔ وہ اپنی کوششوں میں مشغول تھے۔ کہ اکبر نے گجرات فتح کر لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے دوسرے علما کے ساتھ وہ بھی پیش ہوئے۔ بادشاہ نے برہنہ سر رہنے کی وجہ دریافت کی۔ اور جب اُنہوں نے حقیقتِ حال بیان کی۔ تو بادشاہ نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا۔ اور کہا۔ کہ دین کی حمایت میرا فرض ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ اور میں انہیں

آپ کی پوری مدد کروں گا۔ چنانچہ خانِ اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہوا۔ اور چونکہ وہ پکا مسلمان تھا۔ اس نے اپنے ایامِ حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ تبدیل ہو گیا۔ اور اس کی جگہ کوئی اور گورنر متعین ہوا۔ جس کے عہدِ حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہو گئے۔ یہ شیخ نے اپنا عمامہ پھر سر سے اتارا اور آگرے کا رُخ کیا۔ تاکہ خود بادشاہ کے حضور میں عرضِ حال کریں۔ یہ شیخ وجیہ الدین نے طریقے سے منع کیا۔ لیکن شیخ اپنے ارادے سے باز نہ آئے (شیخ وجیہ الدین علوی، ہر چند بہ طریقِ کنایہ منع کرد۔ وفرمود، عالم مظہرِ اسمائے جمالی وجمالی است، حفظ آثار و احکامِ ہر اسم صراطے است مستقیم۔ سود مند نیفتاد) وہ ابھی راستے میں ہی تھے۔ کہ اجین کے کے قریب چند مخالف پیچھے سے آپہنچے۔ اور انہیں شہید کر دیا۔ ان کے ساتھی انکی لاش کو پٹن واپس لے گئے۔ اور بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا۔

شیخ وجیہ الدین احمد آبادی:۔ یہ شیخ وجیہ الدین پیدا تو چانپانیر میں ہوئے لیکن ان کے علم وفضل کا دریا احمد آباد میں بہتا رہا۔ انھوں نے کئی سال درس دیا۔ اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ اور متعدد درسی کتب پر حاشیے اور شرحیں لکھیں ان کی وفات ۹۹۸ھ میں ہوئی۔ اپنے مدرسے کے وسط میں دفن ہوئے۔ انکے مزار کا چھپر کھٹ نواب مرتضےٰ خاں نے تیار کروایا۔ جس پر سیپ کا نہائت اعلےٰ درجے کا کام ہوا ہے۔

تذکروں میں آپ کا نام، اکثر شیخ محمد غوث گوالیاری کے واقعہ تکفیر کی وجہ سے آجاتا ہے۔ جن کی بعض تصنیفات کی بنا پر شیخ علی متقیؒ نے ان کے خلاف کفر کا فتوےٰ دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ فتوےٰ آپ کے پاس بھیجا۔ لیکن آپ نے نہ صرف

اس فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی۔ اور اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ "جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے۔ آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے۔ کہ حالتِ سکر میں جو کہہ جاتے ہیں۔ وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب اورادِ غوثیہ پر لوگوں نے جو اعتراضات کئے تھے۔ ان کا جواب دیا ہے ......
آپ کا ارشاد یہ تھا۔ کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو۔ تو اس کو مسلم سمجھو۔ اور کسی کلمہ گو اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو۔"

اس زمانے میں دُوسرے کئی علما کے نام ملتے ہیں۔ اور صاف نظر آتا ہے۔ کہ مغلیہ حکومت کے مستحکم ہو جانے سے علم و فضل کو خوب رونق ہوئی تھی لیکن اتنا کہنا پڑتا ہے۔ کہ اس زمانے کے مشہور ترین علما محض مدرس اور معلم تھے۔ شاہ ولی اللہؒ یا اقبالؒ جیسا صاحبِ اجتہاد عالم یا مفکر ان میں کوئی نہ تھا۔ علامہ عبد الحکیم اور علامہ وجیہ الدین کی بہت سی کتابوں کے نام محفوظ ہیں۔ اور بعض کتابیں ملتی بھی ہیں۔ لیکن قریباً تمام شرحیں یا حاشیے ہیں۔ اپنی طرف سے لکھی ہوئی کوئی نہیں۔ اور اگرچہ ان بزرگوں نے مُلک میں علم کو وسعت دی لیکن یہ علم بیشتر تقلیدی تھا۔ اُنہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا۔ کہ عرب۔ ایران اور ماوراء النہر کے علوم ہندوستان تک پہنچا دئے۔ لیکن اس زمانے میں اسلامی ممالک میں بھی تقلید کا دور دورہ تھا۔ سید سلیمان ندوی، اس دور کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"متاخرین کے ان شروح و حواشی نے اصل فن کا خون کر دیا چنانچہ
اس عہد کی دماغی پیداوار، زیادہ تر لفظی مباحث۔ اعتراضات۔
شکوک اور ردّ و بدل ہیں۔ اس دَور میں اسلامی علوم و فنون میں سوائے
نقل و تقلید اور بحث و مناظرہ کے ایک ذرّہ اضافہ نہیں ہُوا"۔

عہدِ شاہجہانی

قادریہ سلسلے کا فروغ

شاہجہاں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث، دونوں کا ستارہ پہلی مرتبہ عہد جہانگیری میں چمکا۔ اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے عہدِ جہانگیری کے مذہبی حالات، اس زمانے کی مشہور شخصیتوں اور خود بادشاہ کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ جب جہانگیر نے وفات پائی۔ تو شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ ردّ عمل جو "دینِ الٰہی اکبرشاہی" کے خلاف جہانگیر کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا تھا۔ اور بھی قوی ہو گیا۔ اور اسلام اور شعائر اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر کے زمانے میں درباری سجدہ برقرار تھا۔ شاہجہاں نے اسے موقوف کر دیا۔ وہ شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتا۔ اور علماء فضلا کا بھی بڑا قدردان تھا۔ نماز، روزے کا پابند تھا۔ بلکہ اگر درباری مورخوں کے پُرجوش اندراجات پر اعتماد کیا جائے۔ تو خیال ہوتا ہے۔ کہ شاہجہاں کو نہ صرف نیک، پابندِ شریعت مُسلمانوں، بلکہ مجددین ملت میں سے شمار کرنا چاہیئے! بادشاہ نامہ میں لکھا ہے :۔

سنتِ سنیۂ الٰہی براں جاری است۔ کہ ہرگاہ کارِ دیں رُو بہ اندراس نہد۔

وشعار اسلام رُخ بہ انطماس۔ بتائید ایزدی یکے از بندگان سعادت اندوز بروئے کار آید تا بہ آبیارئے مساعی جمیلہ گردِ فتور از ساحتِ اسلام فرونشاند و بدستیارئے دیں پروری و دیانت وری اساس شریعت را مبشند گرداند۔ وچوں معابد اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود۔ و مبانی شریعت رُخ بہ انعدام۔ ایزدِ کارساز ایں بادشاہِ اسلام نواز کفر گداز را اورنگ آرائے اقبال گردانید۔ بنیادِ اسلام را چناں محکم و مرصوص ساخت کہ تا روزِ نشور گردِ فتور بر دامن دوام نہ نشیند۔"

جہانگیر کی نسبت شاہجہاں کو امورِ اسلامی کا زیادہ خیال تھا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ تمام ملک سے مذہبی بے قاعدگیاں دُور ہو گئی تھیں ہم جہانگیر کی نسبت لکھ چکے ہیں۔ کہ اس نے راجوری (کشمیر) کے مسلمان راجپوتوں کی خلافِ اسلام رسمیں بند کرنی چاہیں۔ لیکن عہدِ شاہجہانی کے واقعات پڑھیں تو پتہ چلتا ہے۔ کہ شاہی احکام کے باوجود یہ سبھی بے قاعدگیاں برقرار تھیں۔ بادشاہنامہ میں ۱۰۴۴ ہجری کے واقعات میں لکھا ہے (ترجمہ):۔

اسی دوران میں خدمتِ شاہی میں عرض ہوا۔ کہ علاقہ بھنبر[1] کے مُسلمان اپنی جہالت کی بنا پر ہنود کو بیٹیاں دیتے اور ان سے بیٹیاں لیتے ہیں۔ اور یہ طے کر لیا ہے۔ کہ جو ہندو لڑکی، مسلمان سسرال میں مرے، وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو۔ وہ جلائی جائے۔ دربارِ شاہی سے حکم ہُوا۔ کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے۔ تو عورت سے اُس کا نکاح دوسری بار پڑھا جائے۔ ورنہ مُسلمان عورت کو

---

[1] کشمیر کی جنوب مغربی سرحد پر واقع ہے۔ راجوری سے کوئی ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے۔

اس سے جُدا کیا جائے۔ چنانچہ جوکو زمیندار، جس سے یہ فعل سرزد ہُوا تھا۔ اپنے تمام قبیلہ کے ساتھ مسلمان ہُوا۔ اور راجہ دولتمند کے خطاب سے سرفراز ہُوا......

جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی۔ تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا۔ کہ وہاں کے بعض ہندوؤں نے مُسلمان عورتیں گھروں میں ڈال رکھی ہیں۔ (حرایر و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور انمیں سے بعض نے تو مسجدوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس پر شیخ محمدؒ گجراتی کو جو علوم رسمی سے واقف تھا۔ اور تو مسلموں کا داروغہ مقرر ہُوا تھا۔ حکم ملا۔ کہ ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالے۔ اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ کرے۔ چنانچہ شیخ نے ستر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالا۔ اور جہاں جہاں مسجدوں پر ہندوؤں نے بیجا تصرف کر لیا تھا۔ تحقیق کے بعد انہیں واگزار کر دیا۔ اور غیر مسلموں سے جُرمانہ لینے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا۔“

لیکن مذہبی بے قاعدگیاں صرف غیر مسلموں کے متعلق نہ تھیں۔ مُلک کے دور دراز حصوں کے مسلمانوں میں بھی عجیب و غریب اعتقادات رواج پا رہے تھے۔ خافی خاں ۱۰۳۹ھ کے ضمن میں لکھتا ہے:۔ (ترجمہ)

صوبۂ کابل کی خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی رپورٹ سے معلوم ہوا۔ کہ افغان، آئینِ شرعی کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ اُنہوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے طریقے اختیار

کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے۔ بلکہ ایک گائے یا بیل کو ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد بغیر کسی عقد و نکاح کے تعلقات ازدواجی شروع کر دیتے ہیں۔ طلاق کے لئے وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اور اسے گھر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے نزدیک ترکے میں داخل ہیں۔ اور میت کے وارث کو حق ہوتا ہے خواہ وہ ان سے نکاح کرے۔ یا کسی کے پاس ہبہ یا فروخت کر دے۔ جو کوئی بدنصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے۔ اسے یہ لوگ شکار حلال سمجھتے ہیں۔ اور اسے بیچ کر آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثہ میں سے بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں دیتے۔ اور قتل و انتقام اور راہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔

اس پر حکم ہوا۔ کہ "حکام تورہ و شریعت" کے مطابق ان لوگوں کو زجر و تنبیہ کی جائے۔ چنانچہ بڑی تاکید کے بعد جس میں کئی دفعہ فساد و بلوے کی نوبت آئی۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں۔ لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں"۔ اور خافی خاں ۵۰ سال بعد لکھتا ہے۔ "اب بھی ان بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں"۔

خافی خاں نے تو یہ اندراج آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے لکھا تھا۔ لیکن عجب نہیں۔ کہ اگر اب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے۔ تو شاید ان بدعتوں کے آثار صرف اسی قوم میں نہیں، بلکہ اسلامی ہندوستان کے بعض اور حصوں میں بھی نظر آجائیں!!

ان ظاہری خرابیوں کے علاوہ ایک گہری بیماری توحید وجودی کے ذریعے

راہ پارہی تھی۔ حضرت مجدّد الف ثانی نے عہدِ جہانگیری میں لکھا تھا:۔

"اکثر ابنائے ایں وقت' بعضے بہ تقلید و بعضے بمجرد علم و بعضے دیگر بہ علم ممتزج بہ ذوق... و بعضے بہ الحاد و زندقہ' دست بدامن ایں توحیدِ وجودی زدہ اند۔ وہمہ را از حق مے دانند' بلکہ حق مے دانند۔ وگروہلئے خود را از ربقۂ شرعی بہ حیلہ مے کشایند۔ و مداہنات در احکام شرعیہ مے نمایند۔ و بایں معاملہ خوش وقت و خورسند اند۔ و اتیان او بر شرعیہ را اگر اعتراف دارند۔ طفیلے میدانند۔ مقصودِ اصلی ورائے شریعت خیال مے کنند۔ حاشا و کلا نعوذ باللہ سبحانہ' حق بذالاعتقاد السوء"

حضرت مجدّد نے جس روحانی بدنظمی کا ذکر کیا تھا۔ وہ عہدِ شاہجہانی میں بہت بڑھ گئی۔ اور جیسا کہ ناظرین آیندہ صفحات میں دیکھیں گے۔ نہ صرف مشائخ کے حلقے' بلکہ اہلِ علم کی مجلسیں اور شاہزادوں کے دربار' وحدت الوجود کی صداؤں سے گونج اُٹھے!

حضرت شیخ میاں میر لاہوری قادریؒ

شیخ عبد الحق محدثؒ نے ابتدائے سلوک میں اوچھ کے ایک قادری بزرگ سے فیض حاصل کیا تھا۔ لیکن تقوے و پرہیز گاری اور شریعت کی کشش نے انہیں آہستہ آہستہ ایک ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا۔ جس میں اتباعِ شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ اور طبقاتِ شاہجہانی کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ انہوں نے' خواب میں خود حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا اشارہ پاکر حضرت

خواجہ باقی باللہؒ سے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کر لی تھی۔
جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے۔ اس کا اثر عہدِ جہانگیری میں دُور دُور پہنچا۔ اور حضرت مجدّد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت نے اس زمانے میں نقشبندیہ سلسلے کو بے حد مقبول بنا دیا۔ لیکن ان کی زندگی میں ہی، لاہور کے قرب میں ایک ایسا شیخ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ جس کے فیض سے ایک بار پھر قادریہ سلسلہ چمک اُٹھا۔

یہ بزرگ شیخ میاں میر تھے۔ جنہوں نے قادریہ سلسلے کے ہندوستانی مرکز اوچھ سے نہیں، بلکہ اس طریقے کی ایک اور شاخ سے فیض حاصل کیا۔ اور جن کو نہ صرف عوام الناس میں، بلکہ علمی اور درباری حلقوں میں اسقدر قبولیت ہوئی۔ کہ انکے سامنے دوسروں کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ معصوم کے ہمعصر تھے لیکن عہدِ شاہجہانی کی عام ملکی تاریخیں دیکھیں تو حضرت میاں میر کے متعلق طویل اندراجات ملیں گے۔ لیکن خواجہ محمدؐ معصوم کی نسبت کہیں ایک آدھ سطر۔ بلکہ اس زمانے کی بعض مشہور تاریخیں (مثلاً عملِ صالح۔ بادشاہ نامہ۔ منتخب اللباب) تو خواجہ صاحب کے ذکر سے یکسر عاری ہیں اور اور اس کی وجہ یہی خیال میں آتی ہے۔ کہ خاص خاص حلقوں سے قطع نظر، جو رنگ عہدِ شاہجہانی میں مقبول تھا۔ وہ قادری تھا۔ نقشبندی نہ تھا۔ اور اس زمانے کے سب سے باثر شیخ، حضرت میاں میر ہی تھے۔

حضرت شیخ میاں میر، بالا پیر قدس سرہ کا اصل نام میر محمدؐ تھا۔ اور وہ سندھ کے قدیمی شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے۔

جس میں علم وفضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کے تھے۔ کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ لیکن علومِ دینی آپ نے اچھی طرح حاصل کئے۔ اور آپ کی والدہ ماجدہ نے خود آپ کو سلسلۂ قادریہ میں تعلیم دی۔ اس کے بعد علائقِ دُنیا سے مُنہ موڑ کر آپ شیخ خضر سیوستانی کے مُرید ہوئے۔ جو سیہوان کے باہر ایک پہاڑ پر قیام فرما تھے۔ پچیس سال کی عمر میں آپ لاہور آئے۔ اور یہاں ریاضت وعبادت اور تلقین وہدائت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صُوفی بزرگوں میں سے تھے۔ جو فنافی اللہ ہوتے ہیں۔ اور شرع کی ترویج پر اس قدر زور نہیں دیتے۔ جس قدر عبادت وریاضت پر۔ آپ عبادتِ الٰہی میں اس طرح منہمک رہتے تھے۔ کہ زاویۂ خمول سے بالکل باہر نہ نکلتے۔ اور چالیس سال تک اہلِ لاہور کو پتہ بھی نہ ہُوا۔ کہ اس پائے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے۔ آپ کو وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ عملِ صالح میں لکھا ہے۔ "واکثر عباراتِ فتوحاتِ مکّی شیخ الموحدین ابن عربی بخاطر داشتند۔ وصفحہ صفحہ شرح فصوص الحکم حضرت مولوی جامیؔ را از برمے خواندند۔" آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

آپ کی وفات ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵-۳۶ء) میں ہُوئی۔ مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ہے۔ جو اس مزار کی بنا پر میاں میر کہلاتا ہے۔ داراشکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفا کے تفصیلی حالات سکینۃ الاولیاء میں لکھے ہیں۔ آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے مزار کے لئے مسالہ جمع کیا۔ لیکن تعمیر کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضا وقدر نے اس کا تختہ اُلٹ دیا۔ مزار کچھ عرصہ

نامکمل رہا۔ پھر چند سال بعد اورنگ زیب خود مزار پہ آیا۔ اور اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب ہی بارہ دری ہے۔ جس میں داراشکوہ کی رفیقِ حیات نادرہ کی قبر ہے۔

حضرت میاں میر کو اپنے زمانے میں بڑا فروغ ہوا تھا۔ جہانگیر ان کی نسبت تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے:۔

چوں بعرض رسید۔ کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است سندی الاصل۔ بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحبِ حال در گوشۂ توکل و عزلت منزوی گشتہ، از فقر غنی و از دنیا مستغنی نشستہ است۔ بنابریں خاطرِ حق طلب بے ملاقاتِ ایشاں قرار نگیرد۔ و دیدنِ ایشاں رغبت افزود۔ چوں بہ لاہور رفتن متعذر بود۔ رقعہ بخدمتِ ایشاں نوشتہ شوقِ باطن را ظاہر ساختم۔ وآں عزیز باوجودِ کبرِ سن وضعفِ بینہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آوردہ و مدتِ ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذاتِ شریف است۔ و دریں عہد بغائت غنیمت و عزیز الوجود۔ ایں نیازمند از خود بہ آمدہ با ایشاں صحبت داشت۔ و بسا سخنانِ بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نیازے بگذرانم۔ چوں پایۂ ہمتِ ایشاں را از آں عالی تر یافتم۔ خاطر با ظہار ایں مطلب رخصت نداد۔ پوستِ آہوسفید بجہت جائے نماز بایشاں گذرانیدم"

اس کے بعد حضرت لاہور واپس چلے گئے۔ لیکن جہانگیر نے ان سے خط وکتابت جاری رکھی۔ اور اس کے دو خط سکینۃ الاولیا میں نقل ہوئے ہیں۔

شاہجہاں بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ وہ دو دفعہ حضرت سے ملا۔ بادشاہ نامہ میں

ایک ملاقات کی نسبت لکھا ہے۔ (ہشتم رجب۔ سنہ ہزار و چہل و چہار)

"خدیو خدا آگاہ، بکاشانہ فیض آشیانہ، پیشوائے ارباب صفوت و صفا رہنمائے اصحاب معرفت و تقیٰ۔ قدوۂ حق شناسان صافی ضمیر۔ میاں میر کہ پیشتر نیز بقدوم سعادت لزوم مہبط انوار گشتہ بود۔ تشریف فرمودہ، بگذارش بساط دقائق حقائق و غوامض معارف، باعث انشراح صدور و انبساط قلب آں زاویہ نشین تجرد گزیں گشتند۔"

معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہاں آپ کا بڑا قائل ہو گیا تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے۔

"حضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحوے شیفتۂ صحبت آں مقتدائے اصحاب عرفاں شدند۔ کہ مزیدے بر آں متصور نباشد۔ چنانچہ بارہا اطوار محمودہ و احوال ستودۂ ایشاں را ستودہ مے فرمودند۔ کہ از مشائخ متصوفۂ ایں کشور میاں میر را کامل تر یافتم و از ایشاں گزشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔"

دارا شکوہ کا بیان ہے۔ کہ میں بیس۲۰ سال کی عمر میں اس طرح بیمار ہوا۔ کہ اطبا میرے علاج سے عاجز آ گئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے گھر گیا۔ اور کہا کہ یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ معالج اس کا علاج نہیں کر سکے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجئے۔ حضرت نے پانی کا ایک پیالہ منگایا۔ اور اس پر دم کر کے دارا شکوہ کو پینے کے لئے دیا۔ دارا شکوہ کہتا ہے۔ کہ اسی ہفتے مجھے صحت ہو گئی اور میری بیماری بالکل جاتی رہی۔

شاید دارا کی روحانی خوش اعتقادی اور فقیر طلبی کی ابتداء اسی واقعہ سے ہوئی۔ دارا شکوہ نے حضرت میاں میر اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کی (جو حضرت مجددؒ کے

مرید تھے) ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ حضرت اور مجددیہ طریقہ کے بزرگوں میں اختلافات نمودار ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے وقت غالباً بادشاہ بھی موجود تھا۔ اور حضرت میاں میر اسے خدا تک پہنچنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا۔ کہ جب سالک پر عالمِ ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جنگلوں میں بھیج دیتے ہیں۔ تاکہ وہ تنہا یادِ الٰہی میں مصروف ہو جائے۔ اس پر مولانا عبد الحکیم نے اعتراض کیا۔ کہ اس طرح تو نمازِ باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔ حضرت میاں میر نے اس کا مناسب جواب دیا۔ لیکن اس اعتراض اور جواب سے بھی خیال ہوتا ہے۔ کہ شرع کی پوری پوری پابندی میں جو اعتراض مجددیوں کو قادریوں سے تھے۔ اور جنہوں نے آگے چل کر داراشکوہ اور عالمگیر کی مخالفت کو چمکا دیا۔ وہ حضرت میاں میر کے زمانے میں ہی رونما ہو رہے تھے۔

ملاشاہ قادری

داراشکوہ حضرت میاں میر پر فریفتہ تھا۔ اور انہوں نے اس کے روحانی ذوق و شوق کو ترقی دی۔ لیکن اس نے بیعت ان سے نہیں، بلکہ ان کے خلیفہ شیخ شاہ محمدؐ المعروف ملاشاہ قادری سے کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ جس وقت داراشکوہ نے بیعت کا ارادہ کیا۔ (۱۶۳۹ء) اس وقت حضرت میاں میر وفات پا چکے تھے۔

شیخ ملاشاہ اپنے زمانے کے بڑے بااثر بزرگ گزرے ہیں۔ وہ علاقہ بدخشاں کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ لیکن صغرسنی میں ہی کشمیر آ گئے۔ اور وہاں سے لاہور آ کر حضرت میاں میر کے مرید ہوئے۔ چونکہ لاہور کی گرمی آپکے زار و نزار جسم کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لئے آپ مرشد کی اجازت سے

موسمِ گرما میں کشمیر تشریف لے جاتے۔ جہاں دارا شکوہ اور جہاں آرا نے آپکے
لئے دامنِ کوہ میں ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرادی تھی۔ اور موسمِ سرما میں (جب تک
مُرشد زندہ رہے) لاہور آجاتے۔ تذکرہ نگار آپ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا
اس طرح ذکر کرتے ہیں۔ کہ حیرانی ہوتی ہے۔ دارا شکوہ ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ
مَیں نے لوگوں سے سُنا ہے۔ کہ شروع میں آپ نے سات سال تک عشاء کی نماز کے
بعد سے صبح تک حبسِ نفس سے ذکرِ خفی کیا ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے (ترجمہ) "آپکی
ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ اب (سنہ ۱۰۵۲ھ) تک، تیس سال سے کچھ
اوپر آپ نے ایک لحظہ اور ایک لمحہ بھی نیند نہیں کی"

ان غیر معمولی ریاضتوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں بڑی کشش اور بات
میں بڑی تاثیر پیدا ہوگئی تھی۔ جن دِنوں آپ کشمیر میں مقیم تھے۔ تو وہاں شیعہ سُنی
اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ برسرِ مجلس چاروں خلفا کی تعریف کرتے۔ اور کئی
مخالف نزاع کے لئے آتے۔ لیکن آپ اس خوش اسلوبی سے پیش آتے۔ اور
آپ کی بات میں اتنی تاثیر تھی۔ کہ مخالفین قائل ہوجاتے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ کئی
ہزار مخالف آپ کی وجہ سے اہلِ سُنت ہوگئے۔ تصوّف میں آپ کا طریقہ وحدت الوجود
کا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم مشرب لوگوں سے ملنے سے آپ کو احتراز نہ تھا۔
اور بسا اوقات ان پر نیک اثر ڈالتے۔ چنانچہ ایک کائستھ کی نسبت، جو ولی رام کے
نام سے مشہور ہوا۔ کہتے ہیں۔ کہ وہ پہلے مغلیہ حکومت کے تابع ایک برسرِ اقتدار
امیر تھا۔ دارا شکوہ اور ملا شاہ کے فیضِ صحبت سے اسے عشقِ الٰہی دامنگیر ہوا۔
اور سب جاہ و مال ترک کرکے شیخ ملا شاہ کے ہاتھ پر مُرید ہوا۔ دبستان مذاہب میں

اس کی نسبت لکھا ہے۔ "در کشمیر بخدمت مُلا شاہ بدخشی رسیدہ کامیاب شناخت گشت وبمقتضائے "الصوفی لامذہب لہٗ" بقید ہیچ دین و آئین پا نہ بستہ۔ با بُت و بُت خانہ آشناست و از مسجد بیگانہ نیست" اسی کتاب میں ولی رام کے بعض شعر درج ہیں:

ما نہ آنِ خودیم، آنِ تو ایم	بے نشانیٔ تو، ما نشانِ تو ایم
ایں نشانہا نشانِ ذاتِ تو اند	مظہرِ جلوہ صفاتِ تو اند
پاکی از فکر و از قیاسِ ما	اے تو پیدا درین لباسِ ما
مظہرِ ذاتِ تو ہمہ اشیا	بے تو و ما توئی، وخود تو و ما
ذاتِ تو در صفاتِ تو پیدا	صفتِ عینِ ذات اے مولا
ما ہمہ ہیچ، ہر چہ ہست توئی	اے منزہ ز فہم و وہم دوئی
ما ہمہ موجِ بحرِ ذاتِ تو ایم	مظہرِ مجملِ صفاتِ تو ایم

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ملا شاہ کے کلام سے جو انتخاب دیا ہے۔ اس میں بھی وہی وحدت الوجودی رنگ جھلکتا ہے۔ جو ولی رام کے اشعار میں ہے ایک غزل کے چند اشعار ہیں:

حرفِ دیوانگی است در دلِ ما	چہ زند سر دگر ازیں گِلِ ما
در تماشاش فرصتہا ہمہ رفت	چلیست پر سیدن از تو افل ما
روئے او در مقابلِ مرأت	روئے ما بود در مقابلِ ما
در رہِ عشق آنکہ یار اکشت	غیرِ ما کس نبود قاتلِ ما
وصل داد ایں خبر کہ غیر یکے	نیست موصول ما و واصلِ ما
از سرِ اتحاد ایں بر خاست	میلِ ما دست، اوست مائلِ ما

ماکہ جز حق نہ ایم از عرفاں   پس چہ پُرسی ز حق و باطلِ ما

ایک جگہ اور کہتے ہیں ؎

بردیم بسر نہ دد الابد را   رفتیم تمام راہِ بُود و نبُود را

شد تا مطلب مقابلِ آئینۂ دل   دیدیم در آئینہ جمالِ خود را

ایک اور رُباعی ہے ؎

آنرا کہ بجاست بر سرِ ایماں جنگ   او مومن و زایمانِ من او را صد ننگ

مومن نشود تا کہ برابر نشود   با بانگِ نماز، بانگِ ناقوسِ فرنگ!

آخری شعر میں مُلّا شاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اسی پر دارا شکوہ نے عمل کیا۔ اور دوسرے مذاہب، بالخصوص ہندو ویدانتیوں کی کتابوں میں حقیقت کی اس طرح تلاش کی۔ کہ گویا وہ اس کے اپنے طریقے کی کتابیں ہیں۔ اور اسلامی تصوف اور ویدانت میں ہم آہنگی ثابت کی۔

بعض دفعہ تو ملا شاہ کی وارستہ گوئی اس حد تک بڑھ جاتی۔ کہ اعتراض کی زبانیں بے محابا کھُل جاتیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک شعر لکھا (نقلِ کفر، کفر نباشد)

؎ پنجہ در پنجۂ خدا دارم   من چہ پروائے مصطفٰے دارم

اس پر علمائے کشمیر نے ملا شاہ کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتوےٰ دے کر شاہجہاں سے استدعا کی۔ کہ وہ اس کے خلاف حدِ شرعی جاری کرے۔ شاہجہاں یہ فیصلہ کرنے والا تھا۔ اور کشمیر کے گورنر ظفر خاں کے نام فرمان لکھا جا چکا تھا۔ مگر دارا شکوہ نے سفارش کی۔ کہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور کسی اور بزرگ، مثلاً حضرت میاں میر سے استصواب کیا جائے۔ بادشاہ نے یہ بات قبول کر لی۔

اور حضرت میاں میر سے ملاشاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت میاں میر نے فرمایا۔ کہ احوال کے تابع ملاشاہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے۔ جن سے پرہیز واجب ہے لیکن اُسے ان کی بنا پر قتل کرنا نامناسب اور ناموزوں ہوگا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کرلیا۔ اور ملاشاہ کے خلاف قدم نہ اُٹھایا۔

اس کے کچھ عرصے بعد جب ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں کشمیر آیا۔ تو اس نے ملاشاہ کو بلابھیجا۔ اور دیر تک اِس سے صوفیانہ مسائل کی نسبت گفت وشنید کی۔ بادشاہ نامہ میں یکم جمادی الثانی ۱۰۵۰ھ روز سہ شنبہ کے بیان میں لکھا ہے۔

"در تاریخِ مذکور، غواصِ لجہ توحید ملاشاہ بدخشی کہ مہینِ خلیفہ مصباحِ سبلِ ہدایت مفتاحِ ابوابِ ولایت۔ میاں میر قادری است۔ و درنزہت گاہِ کشمیر برسم انزوا بسرمے برد حسب الطلب بادشاہِ درویش نواز بشرفِ حضورِ محفلِ فیض منزل کہ وسیلۂ دریافت مآربِ دینی و ذریعۂ ادراکِ مطالبِ معنوی است رسید۔ و لبانکاتِ بلند دراں صحبتِ فیض منقبت گزارش یافت۔ پادشاہِ حق آگاہ باقسامِ تلطف و مہربانی آں ایزد پرست را منبسط ساختہ مرخص گردانید۔"

اسی سال داراشکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا ملاشاہ کے حلقۂ بیعت میں آئے۔ ملاشاہ اپنے شاہی مرید کے ذوق وشوق سے بڑے خوش تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ یہ عزیز قادریہ سلسلے کو فروغ دیگا۔

کچھ عرصہ بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ اور داراشکوہ کو شکست دے کر ۱۶۵۸ء میں تختِ شاہی پر اورنگ زیب متمکن ہُوا۔ اب علما نے پھر مُلاشاہ کے خلاف آواز اُٹھائی۔ چنانچہ دارالخلافے سے ملاشاہ کی طلب کا پروانہ جاری ہوا لیکن مُلاشاہ

ان دنوں کمزور اور بیمار تھا۔ اس لئے کشمیر کے گورنر نے لکھا۔ کہ اس وقت شیخ سفر کرنے کے ناقابل ہے۔ بحالی صحت پر حاضر خدمت ہوگا۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا۔ اور اس دوران میں ملا شاہ کے بعض اشعار جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھے تھے۔ اور نگ زیب تک پہنچائے گئے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

صحن دل من چون گل خورشید شگفت — کآمد حق و غبار باطل را رفت

تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را — ظل الحق گفت الحق این را حق گفت

اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا۔ اور فقط یہی لکھا۔ کہ ملا شاہ بجائے کشمیر کے لاہور میں قیام کرے۔ چنانچہ سنہ ۱۰۶۹ھ کے موسم سرما میں شیخ نے نقل مکان کیا۔ اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اب اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ نئے حالات کی بنا پر اس نے گوشہ گزینی اختیار کی۔ اور آمد و رفت کا دروازہ خلقت کے لئے بند کر دیا۔ فقط چند مخلص معتقد اور مرید گاہے گاہے ملتے۔ اور شیخ ان کے ساتھ اپنے روحانی تجربات کا بیان کرتے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ کے حاشیہ نشینوں نے شاہی معتقدوں کے خواب ابھی نہیں بھولے تھے۔ ایک دفعہ اس کے ایک دوست کابل خاں نے کہا "قدیم زمانے میں اورنگ زیب تصوف کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے۔ کہ جب میں اس کی خدمت میں مثنوی مولینا روم کے بند پڑھا کرتا تھا۔ تو وہ بعض بند سن کر آنسو بہایا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ جب وہ لاہور آئے گا۔ تو آپ سے ملنے کی خواہش کرے گا"۔ لیکن شیخ نے نفی میں جواب دیا۔ اور کہا۔ کہ "ہماری ملاقات کبھی نہ ہوگی"۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ عارضۂ بخار میں مبتلا ہوا۔

اور اگرچہ اس وقت آرام آگیا۔ لیکن چند دنوں بعد مرض کا پھر حملہ ہوا۔ اور ۱۰۶۱ھ میں ۱۵ ار صفر کو شیخ نے انتقال کیا ‌+

سرمد — اس زمانے کی ایک دلچسپ ہستی سرمد ہے۔ جسے اوائل عہد عالمگیری میں سزائے موت دی گئی۔ مذہبی تاریخ کے علاوہ وہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بھی ایک باعزت جگہ کا مستحق ہے۔ اُس کی کئی رباعیات بڑی پُرلطف ہیں۔ اور جب اُس کے با اثر اور پُر خلوص اشعار کا متاخرین کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو معنی آفرینی اور نازک خیالی کی بھول بھلیاں میں گرفتار تھے۔ تو خیال ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ اسے غنی اور ناصر علی سرہندی کی ادبی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُس کا مختصر مجموعۂ کلام اس زمانے کے دوسرے شعرا کے کلام سے زیادہ شیریں اور صحیح شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ باوقعت ہے۔

سرمد کے حالات پر مولینا ابوالکلام آزاد نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اور مولینا محمد حسین آزاد نے بھی نگارستان فارس میں چند صفحے اُس کے لئے وقف رکھے ہیں۔ دونوں نے تذکرہ نگاروں کی کم نویسی کی شکایت کی ہے۔ شمس العلما آزاد تو لکھتے ہیں "نام اُس کا کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتا" مولینا ابوالکلام آزاد بھی کہتے ہیں۔ "خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا"۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ بعض تذکروں میں سرمد کے حالات "سعیدائے سرمد" کے عنوان سے درج ہیں۔ قیاس لگاتے ہیں۔ کہ "اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا"۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دبستان مذاہب کا اندراج ہر دو مورخین کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کتاب کا مصنف

ملا محسن فانی[1] سرمد کا معاصر اور عزیز دوست تھا۔ دونوں آزاد خیالوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو شہزادہ دارا شکوہ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ دبستان میں سرمد کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔

محسن لکھتا ہے۔ کہ سرمد اصل میں یہودی تھا۔ اور یہودیوں کے اس معزز طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جنہیں ربّی کہتے ہیں۔ یہودی عقائد اور تورات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ اور ایران کے مشہور فضلا مثلاً ملّا صدرا اور میر ابوالقاسم اندرسکی کی خدمت میں حاضر ہو کر حکمت و فلسفہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد تجارت کی غرض سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ سندھ کے مشہور مقام ٹھٹھہ میں پہنچا تھا۔ کہ وہاں ابھے چند نام ایک ہندو بچے کو دیکھا۔ اور مال و متاع کے ساتھ سب حکمت فلسفہ بلکہ عقل و تمیز کھو بیٹھا۔ اور ترک لباس کر کے مادر زاد سنیاسیوں کی طرح معشوق کے در پر دھونی رمائی۔ اس لڑکے کے والد نے جب دیکھا۔ کہ سرمد کی محبت پاک، اور خیالات جسمانی سے منزّہ ہے۔ تو اس نے سرمد اور ابھے چند کے تعلقات میں روڑے نہ اڑکائے۔ ابھے چند نے سرمد سے تورات اور انجیل اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں۔ اور فارسی شعر گوئی بھی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ شعر، جو اس زمانے کے روحانی رجحانات کا آئینہ ہے، اُسی کا ہے ؎

ہم مطیعِ فرقانم، ہم کیشِ رہبانم ربّیِ یہودانم، کافرم، مسلمانم

---

[1] عام طور پر محسن فانی دبستانِ مذاہب کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مآثر الامرا کے مطابق یہ کتاب ذوالفقار خاں اردستانی کی تصنیف ہے۔ (مقالاتِ شبلی)

اس کے بعد کے واقعات دبستان میں تسلسل سے درج نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرمد نے کچھ عرصہ حیدر آباد، دکن میں بھی گزارا۔ اور دبستان کے مصنف سے اس کی پہلی ملاقات ۱۰۵۷ھ؁ میں وہیں ہوئی۔

جس وقت دبستان مذاہب لکھی گئی۔ سرمد بقید حیات تھا۔ اور سرمد کے آخری ایام کے حالات اس کتاب میں نہیں ملتے۔ لیکن مصنف نے سرمد کے کئی اشعار اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ رباعی

سرمد کہ زجام عشق مستش کردند | خواندند سرافرازش و پستش کردند
مے خواست خدا پرستی و ہشیاری | مستش کردند و بت پرستش کردند

نعت رسول میں کہا ہے۔ رباعی

اے از رخ تو شکستہ خاطر گل سرخ | باطن ہمہ خون دل و ظاہر گل سرخ
زاں دیر بر آمدی ز یوسف کہ بباغ | اوّل گل زرد آمد و آخر گل سرخ

فرد

در کعبہ و بتخانہ سنگ او شد و چوب او شد | یکجا حجر الاسود، یکجا بت ہندو شد

ابھے چند نے، جس کی وجہ سے سرمد نے ترک لباس کیا تھا۔ سرمد کی رفاقت اختیار کر لی تھی۔ اور اس کے ساتھ حیدر آباد میں موجود تھا۔ چنانچہ جب ملا محسن فانی نے اپنی کتاب کے لئے یہودی عقائد کی تفصیل چاہی تو ابھے چند نے تورات کے ایک باب (کتاب پیدائش Genesis کے ابتدائی حصے) کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جسے سرمد کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد محسن نے درج کتاب کیا۔

اس کے بعد سرمد شاہجہان آباد آیا۔ یہاں دارا شکوہ کو تصوف سے دلچسپی اور دیوانہ مزاج لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ سرمد نے اس کی مصاحبت اختیار کی۔ اور بالآخر یہی مصاحبت اُس کی جان جانے کا باعث ہوئی۔ اس زمانے میں شاہجہان تختِ دہلی پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کی ولائت کا شہرہ سُن کر اس نے عنائت خاں آشنا کو بھیجا۔ کہ سرمد سے ملے اور اس کی کشف و کرامات کا حال معلوم کرے۔ عنائت خاں نے وہاں برہنگی کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اور واپس آکر یہ شعر پڑھا۔

برسرمدِ برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است ازو کشفِ عورت است

۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ نشین ہُوا۔ اور معاملات ملکی کو شرع کے قواعد پر ترتیب دینا شروع کیا۔ اس کے نزدیک سرمد کی برہنگی خلاف شرع اور قابل سزا تھی۔ چنانچہ اس نے مُلا عبدالقوی کو بھیجا۔ کہ سرمد کو کپڑے پہننے کی تاکید کرے۔ مُلا نے سرمد کو بلا بھیجا۔ اور پوچھا۔ کہ تم برہنہ و عریاں کیوں رہتے ہو[۱]۔ سرمد پتہ نہیں۔ اس وقت کس لہر میں تھا۔ پکار اُٹھا۔ کیا کروں۔ شیطان قوی ہے۔ اور ساتھ ہی رباعی پڑھی ؎

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا	چشمے بدو جام بُردہ از دستِ مرا
او در بغلِ من است و من در طلبش	دُزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

مُلا قوی کو شیطان قوی ہے کا فقرہ خاص طور پر کڑوا معلوم ہُوا ہوگا۔ لیکن

---

[۱] دبستانِ مذاہب میں لکھا ہے۔ کہ سرمد کہتا تھا۔ کہ یہودی مذہب میں برہنگی عیب نہیں۔ اور حضرت اشعیا بھی اخیر عمر میں برہنہ رہتے تھے۔

فقط برہنگی وجہ قتل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے سرمد کی فردِ جرم میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ قتل کا ایک بہانہ ذیل کی رباعی تھی۔ جس کے متعلق کہا گیا۔ کہ اس سے معراج کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ رُباعی

آنکس کہ سرِ حقیقتش باور شُد — خود پہن تر از سپہرِ پہناور شُد
مُلّا گوید کہ بر فلک شُد احمدؐ — سرمد گوید فلک باحمد در شُد

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اورنگ زیب کی محتاط طبیعت نے اسے بھی کافی نہ سمجھا۔ اور علما سے کہا۔ کہ سرمد سے کہا جائے۔ کہ کلمۂ طیبہ پڑھے۔ اسے معلوم تھا۔ کہ سرمد کی ایک عجیب عادت یہ ہے۔ کہ جب وہ کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے۔ تو لاالٰہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ جب علما نے سرمد سے کلمۂ طیبہ پڑھنے کے لئے کہا۔ تو اس نے لاالٰہ سے زیادہ نہ پڑھا کہ کلمۂ نفی ہے۔ اس پر علما نے اعتراض شروع کیا۔ تو سرمد نے کہا۔ کہ ابھی تک مَیں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبۂ اثبات تک نہیں پہنچا۔ جب پہنچوں گا۔ تو الا اللہ بھی کہوں گا۔ علما نے فتوے دیا۔ کہ فقط لاالٰہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے۔ تو ٹھیک، ورنہ واجب القتل۔ سرمد نے توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے روز سرمد کو قتل کے لئے مسجد جامع کے سامنے لے گئے۔ کہتے ہیں۔ کہ قتل کے وقت سرمد بڑا ہشاش بشاش تھا۔ جلاد سامنے آیا۔ تو اسے مُسکرا کر کہا۔ "فدائے توشوم۔ بیا بیا۔ کہ بہر صورتے کہ مے آئی۔ من ترا خوب مے شناسم" یہ کہا۔ اور ذیل کا شعر پڑھ کر تلوار کے نیچے گردن رکھ دی ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم

مآثر الامرا میں سرمد کے اسباب قتل کا ذکر کر کے لکھا ہے ۔ اگر سچ پوچھا جائے ۔ تو قتل کا اصل سبب دارا شکوہ کی مصاحبت تھی ۔ ورنہ سرمد جیسے برہنہ مجذوب' اور آزادانہ گفتگو کرنے والے ہر گلی کوچے میں پھرتے ہیں ۔ اور کوئی پرسان نہیں ہوتا ۔ اس دور کا ایک اور تذکرہ نگار لکھتا ہے :۔

"گویند کہ او با دارا شکوہ نیز سرے داشت ۔ و اکثر اوقات نیز بماتم عالمگیر فشغوف بود ۔ لہذا بقتل رسید ۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال "

مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی خیال کی تائید کر کے لکھتے ہیں :۔

"ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے ۔ اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں ۔ انہیں مذہب ہی کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے "

سرخوش اپنے تذکرے میں لکھتا ہے ۔ کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعر خوانی کر رہے تھے ۔ کہ سرمد آیا ۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا ؎

دیر است کہ افسانۂ منصور کہن شد   من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

چنانچہ اس کے بعد جلد ہی قتل ہوا !

اس کی کئی پُر لطف رُباعیات مختلف تذکروں میں ملتی ہیں

رُباعی

سرمد غمِ عشق بو الہوس را نہ دہند   سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار   ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

رُباعی

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد   یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یا تن برضائے یار مے باید داد   یا قطع نظر ز یار مے باید کرد

رباعی

سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن   در کوچۂ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو راہروی ز شیطاں آموز   یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن

دبستانِ مذاہب۔ دبستانِ مذاہب جس پر ہم نے سرمد والے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے کی ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ اس کے مصنف کے بہت کم حالات معلوم ہیں۔ یقین سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کون تھا کب پیدا ہُوا۔ اور کب اِس دارِ فانی سے چل بسا۔ لیکن اس کی تصنیف سے اس کے خیالات اور رجحانِ طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مذہبی معاملات میں صلح کل اور آزاد خیال تھا۔ اور اسے دوسروں کے عقائد و اطوار جاننے کی غیر معمولی اٹک تھی۔

اس نے دبستانِ مذاہب میں ایشیا کے تمام مشہور مذاہب کے خیالات اور عقائد جمع کئے ہیں۔ لیکن کوشش کی ہے۔ کہ کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے۔ جس کی مذہب متعلقہ کے ماننے والے خود تصدیق نہ کریں۔ نصف کے قریب کتاب پارسی مذہب کے عقائد اور مختلف پارسی فرقوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ قریباً ایک چوتھائی کتاب میں مختلف ہندو فرقوں کے حالات ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ باب نانک پنتھیوں یعنی سکھوں کے حالات کے متعلق ہے۔ کتاب کا مصنف گورو ہرگوبند کے جاننے والوں میں سے تھا۔ اس لئے اس نے ذاتی واقفیت کی

بنا پر ایسے واقعات درج کئے ہیں۔ جو معاصرانہ تواریخی کتب میں عنقا ہیں۔ اور جن سے سکھوں کی تنظیمی کوششوں پہ خوب روشنی پڑتی ہے۔

ایک باب میں ایسے متفرق فرقوں کے حالات درج ہیں۔ جن کا نہ ہندو نہ مسلمان مذہب سے کوئی خاص تعلق تھا۔ اور جن کے عقائد دیکھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ عوام، بالخصوص خوش اعتقاد اور صوفی نما عوام، کے خیالات میں اس وقت بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ سب سے عبرت آموز باب براگیوں کے متعلق ہے۔ دبستان میں لکھا ہے۔ کہ ان میں مسلمان بھی داخل تھے۔ اور وہ وشنو کی پرستش کرتے تھے۔ "از ہندو و مسلم وغیرہم ہرکس خواہد، بہ کیشِ ایشاں در آید۔ مانع نشوند۔ در پذیرند۔ و گویند مسلماناں نیز بشن را مے پرستند، چہ بسم اللہ ایں معنی دارد۔ یعنی بشن و بسم، بشن را گویند"۔ جو مسلمان براگیوں میں شامل ہوئے تھے۔ وہ محض جاہل، عوام الناس نہ تھے۔ "جمعے کثیر از مسلماناں بکیشِ ایشاں در رفتہ اند۔ مانند مرزا صالح و مرزا حیدر، کہ از نجبائے مسلمانانند۔ و براگی شدند"!

کتاب کے ربع آخر میں اختصار سے عیسائی۔ یہودی۔ بودھ مذاہب اور مختلف مسلمان فرقوں [مثلاً سنی۔ شیعہ۔ صادقیہ (پیروانِ مسیلمہ کذاب)۔ واحدیہ۔ روشنیہ۔ پیروانِ دینِ الٰہی] کے خیالات درج کئے ہیں۔ دینِ الٰہی کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں۔ وہ تو زیادہ تر بدایونی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے درمیان ایک مباحثہ درج کیا ہے۔ جو غالباً خیالی ہے۔ اور مصنف کے اپنے دماغ کی تخلیق۔ اس مباحثے کے دوران میں شیعہ۔ سنی۔ یہودی۔ نصرانی اور ہندو عقائد پہ بہت کڑے اعتراضات

ہوتے ہیں۔ اور سب مذاہبِ متداول کے ترجمان لاجواب ہو جاتے ہیں۔ اور حکیم و فلسفی "جو حضرت عقل علیہ السلام" کا معتقد ہے۔ سب پر غالب آتا ہے۔ اس بحث سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مصنف کسی مذہب سے وابستہ نہ تھا۔ اور ایک آزاد خیال صوفی تھا۔ ایک مستقل باب میں اس نے ارشادات قرآنی اور اہم احادیث کی تاویل کر کے انہیں عقائدِ حکما کے مطابق کیا ہے۔ آخری باب میں چند ایسے بزرگوں کے حالات ہیں۔ جن سے مصنف کی ملاقات ہوئی تھی۔ سب سے پہلے داراشکوہ کے مرشد حضرت ملاشاہ بدخشی کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں داراشکوہ کو "حضرت محی الدین محمدؐ۔ خداوندِ مکان و مکیں و صاحبِ زمان و زمیں" کا خطاب دیا ہے۔ جہاں آرا بیگم کا ذکر بھی بڑے احترام سے ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ وہ حضرت ملاشاہ کی غائبانہ مرید تھی۔ "و دیگر مریم روزگار۔ فاطمۂ زمان و اعصار۔ عفت عنصر۔ عصمت پیکر۔ جہاں آرا بیگم بنت ابو المظفر شہاب الدین محمدؐ صاحبقران ثانی امیر المسلمین شاہ جہاں بادشاہ غازی غائبانہ بفرمانِ حضرت ملاشاہ بحضورِ دل روبسلوک آوردہ۔ و کامیابِ شناختِ تام گشت"۔ اپنی نسبت ایک جگہ لکھتا ہے۔ "بریں فقیر از برکت شیخ خود 'غوث الآفاق' استادِ اہل اللہ' عارف باللہ حضرت مولینا شاہ (ملاشاہ) سلمہ اللہ و ابقاہ' ہمچو آفتاب روشن گشتہ"۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی ملاشاہ کا مرید تھا۔ اور آزاد خیال صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو داراشکوہ اور اس کے مرشد ملاشاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے ؛

شہزادہ داراشکوہ قادری

عہدِ شاہجہانی میں آزاد خیال صوفیوں کا جو جمگھٹا ہو گیا تھا۔ اس میں بعض بڑی

دلچسپ ہستیاں شامل تھیں۔ لیکن ان میں جو کشش ایک مورخ کے لئے دارا شکوہ میں ہے۔ کسی اور میں نہیں۔ اور وہ صرف اس لئے نہیں۔ کہ دارا بادشاہ وقت کا بیٹا تھا۔ اور اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس کا علمی مرتبہ بلند تھا۔ اور اس کی تصانیف میں جو وضاحت اور باقاعدگی ہے۔ وہ صوفیانہ ادب کی بھول بھلیاں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے +

دارا شکوہ، شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ایک مدت تک شاہجہاں کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اور اسے اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی۔ چنانچہ اس نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی درگاہ عالیہ پر حاضر ہو کر دعا کی۔ نذر و نیاز مانی۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد، ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ کو دارا شکوہ بمقام اجمیر پیدا ہوا۔

جو اولاد بڑی خواہش کے بعد حاصل ہو، اس سے خاص لگاؤ ہو جاتا ہے۔ کچھ اس وجہ سے اور شاید کچھ اس لئے، کہ بڑے بیٹے کو واضح ترجیح دینے سے تخت و تاج کی وراثت، بغیر کسی خانہ جنگی کے طے پا سکے، شاہجہاں "مہین پورِ خلافت" کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا تھا۔ اُسے "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس کے مراتب و مناصب بھی اپنے بھائیوں سے بدرجہا بلند تھے۔ اور شاہجہاں اسے دور دراز صوبوں میں بھیجنے کے بجائے زیادہ اپنے پاس دارالخلافہ میں ہی رکھتا۔

شاہجہاں کی یہ کورانہ محبت دارا شکوہ کو دنیوی لحاظ سے بہت مہنگی پڑی۔ کیونکہ ایک تو اس لاڈ پیار سے وہ زیادہ خودسر اور ضدی ہو گیا۔ اور دوسرے اسے

عملی نظم و نسق کا وہ سلیقہ حاصل نہ ہوا۔ جو اورنگ زیب نے گجرات۔ دکن اور دوسرے علاقوں کی صوبیداری میں حاصل کیا تھا۔ لیکن اس کی علمی اور روحانی دلچسپیوں کے لئے اسے دارالخلافہ میں بہت وقت ملتا رہا۔ اور اس نے اس کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

اس کی روحانی نشوونما کی بسم اللہ شاید اس دن ہوئی۔ جب ۷ شوال ۱۰۴۳ھ کو شاہجہان اسے لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے التجا کی۔ کہ وہ اس کی صحت کے لئے دعا کریں۔ اس وقت دارا کی عمر انیس سال کی تھی۔ اور اگرچہ اس کے عقائد اور تاثرات کا اس وقت کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن قرین قیاس ہے۔ کہ صحت پا جانے پر، جسے وہ حضرت کی کرامات پر محمول کرتا ہے۔ اس کی عقیدت اہل اللہ سے ضرور بڑھ گئی ہوگی۔ اس کے ایک سال بعد جب آٹھ رجب ۱۰۴۴ھ کو شاہجہان حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو دارا شکوہ اس کے ہمراہ تھا۔ اور اس وقت دارا کی عقیدت مندی کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ حضرت کے مکان کی دوسری منزل میں، جہاں حضرت کا قیام تھا۔ برہنہ پا گیا۔ اور جو لونگ وہ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔ انہیں اُٹھا کر کھاتا رہا۔ اس کے بعد جب بادشاہ چلا گیا، تو دارا شکوہ تنہا شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ بھی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ اور اسکے حق میں دعا کی۔

اس کے اگلے سال حضرت میاں میر کی تو وفات ہوگئی۔ لیکن جو چنگاری دارا کے دل میں جا لگی تھی۔ وہ برابر سلگتی رہی۔ وہ کہتا ہے۔ کہ حضرت کی وفات کے بعد

اُنہوں نے غائبانہ طور پر اسے مشاہدہ اور مراقبہ سکھایا۔ اور ان کی وجہ سے اسے لیلۃ القدر کی زیارت ہوئی۔

داراشکوہ کی پہلی تصنیف سفینۃ الاولیا ہے۔ جسے خاتمۂ کتاب کے مطابق اس نے ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو یعنی پچیس سال کی عمر میں ختم کیا۔ غالباً اس تاریخ کے بعد بھی کتاب میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ کیونکہ حضرت میاں میر کے ذکر میں وہ یہاں کہتا ہے۔ "چوں پیش ازیں رسالۂ مسمیٰ بہ سکینۃ الاولیا در احوال و اوضاع آنحضرت پیر و مریدان ایشاں مفصل نوشتہ بود۔ دریں کتاب ہمیں قدر اکتفا نمود"۔ سفینۃ الاولیا میں دُنیائے اسلام کے اہم بزرگانِ دین کے مختصر حالات ہیں۔ یہ تذکرہ نفحات الانس اور دوسرے قدیمی تذکروں سے ماخوذ ہے۔ عام طور پر اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں۔ لیکن کہیں کہیں داراشکوہ نے اپنے تاثرات بھی درج کئے ہیں۔ اور وہ دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں دارا نے اپنے آپ کو "حنفی قادری" لکھا ہے۔ اور صُوفی سلسلوں کا ذکر کرتے ہوئے' قادریہ سلسلے کو پہلی جگہ دی ہے۔ لیکن یہ کتاب اس نے صحیح اسلامی وسیع القلبی کے ساتھ لکھی ہے۔ اور یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ اگرچہ قلّتِ صفحات کی بنا پر اس نے بہت تھوڑے ہندوستانی مشائخ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی ("حضرت احمد کابلی و سرہندی قدس سرہ) کا ذکر اہتمام سے کیا ہے۔ اور ان کے مخالف ان کی نسبت جو الزام لگاتے تھے۔ ان کی بالتفصیل تردید کی ہے۔

جس سال سفینۃ الاولیا ختم ہوئی۔ اسی سال ۲۹ ذی الحجہ کو داراشکوہ نے

ملاشاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور اس کے تین سال بعد ۱۰۵۲ھ میں سکینۃ الاولیا لکھی۔ جس میں حضرت میاں میر۔ ملا شاہ بدخشی اور حضرت میاں میر کے دُوسرے خلفا کے حالات ہیں۔ اس دوران میں دارا شکوہ نے شاعری شروع کر دی۔ اور قادری تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ جب اس نے ۱۰۵۶ھ میں ایک مختصر سا صوفیانہ رسالہ حق نما کے نام سے لکھا۔ تو اس کے خاتمے میں کہا ؎

این رسالہ حق نما باشد تمام ۔۔۔ در ہزار و پنجہ و شش شد تمام
ہست از قادری مداں از قادری ۔۔۔ آنچہ ما گفتیم فافہم و السلام

معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں لوگوں نے دارا کے بعض اقوال پر اعتراض شروع کر دئے تھے۔ چنانچہ دارا نے ان کا جواب دینے کے لئے اور اس امر کی تائید میں کہ جو الفاظ حالتِ جذب میں کہے جائیں۔ وہ قابلِ گرفت نہیں ہوتے، رسولِ کریمؐ اور اصحابِ کبارؓ کے بعض صحیح اور موضوع اقوال اور مشہور مشائخ کے ایسے فقرے، جو حالتِ جذب میں کہے گئے تھے۔ شطحیات یا حسنات العارفین (۱۰۶۲ھ) میں جمع کئے۔

اس دوران میں دارا کے رُوحانی تجسس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک اس کی تلاش و تحقیق مسلمان صوفیہ تک محدود تھی۔ لیکن ملاشاہ اور دوسرے مسلمان مشائخ، جن کا طریقہ دارا نے اختیار کیا تھا۔ ان کے وحدت الوجودی مشرب اور ہندو ویدانت میں کوئی بُنیادی بُعد نہ تھا۔ اور فلسفۂ وحدت الوجود سے وحدتِ ادیان کے تصوّر تک پہنچنے میں کوئی نا قابلِ عبور مشکل نہ تھی۔ چنانچہ دارا نے دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانت میں چھان بین شروع کی۔

جس کا پہلا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں ۱۰۶۵ھ میں نمودار ہوا۔ اس میں وہ لکھتا ہے :۔

"میگوید فقیر بے اندوہ، محمد دارا شکوہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیۂ عظمیٰ درصدد آں شد۔ کہ درک کہنہ مشرب موحدان ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید۔ با بعضے از کاملان ایشاں کہ بہ نہایت رضائت و ادراک و فہمیدگی و غائت تصوف و خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند۔ مکرر صحبت ہا داشتہ و گفتگو نمودہ ۔ جز اختلافات لفظی دریافت و شناخت تفاوتے ندیدہ۔ ازیں جہت سخنان فریقین را باہم تطبیق دادہ و بعضے سخناں کہ طالبان حق را دانستن ناگزیر و سودمند است، فراہم آوردہ"

چونکہ یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے۔ اسلئے اس کا نام مجمع البحرین رکھا گیا۔ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جس میں عناصر۔ حواس۔ صفات الٰہی۔ نبوت۔ دلالت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کئے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ انوکھی ہے۔ اور عہد عالمگیری میں غالباً اسی کی تصنیف پر ("کفر و اسلام را برادر توام خواندہ") دارا کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا۔ لیکن دارا کے علاوہ دوسرے کئی صوفیوں نے وقتاً فوقتاً، تصوف اور یوگ کی ہم آہنگی کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں نقشبندیہ سلسلے کے مشہور بزرگ مرزا مظہر جانجاناں کا بیان ہم آئندہ صفحات میں درج کریں گے۔ اور ان کے علاوہ خود حضرت مجدد الف ثانی نے ہندوستان قدیم میں پیغمبروں کے وجود کا بالصراحت اعتراف کیا ہے۔

اب دارا نے ویدانتیوں اور "ہندو موحدین" کے خیالات کو زیادہ محنت سے فارسی زبان میں منتقل کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ "مکالمۂ دارا شکوہ و بابا لال" کے نام سے دارا شکوہ کے میر منشی چندر بھان نے مرتب کیا۔ جس میں دارا کے سوالات اور بابا لال کے جوابات جمع ہیں۔ پھر سنہ ۱۰۶۶ھ میں دارا کے ایما پر جوگ بششٹ کا آسان فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس میں شری رام چندر جی کے گرو بششٹ کے ارشادات جمع ہیں۔ ان دونوں سے بھی اہم کتاب سرِ اکبر ہے۔ جس میں دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کے قریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ دارا شکوہ نے بھاگوت گیتا کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

اس زمانے میں دارا شکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کی اس جماعت کا سرگروہ ہو گیا تھا۔ جو تصوّف اور ویدانت میں دونوں قوموں کے لئے ایک مشترک روحانی مطمحِ نظر تلاش کر رہی تھی۔ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ مغلیہ حکومت کے تابع یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا۔ اُدھر اکبر کے عہدِ حکومت میں بھاگوت گیتا اور سنسکرت کی کئی دوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہُوا۔ اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور اہلِ فکر سے ربط و ضبط کے زیادہ موقع میسّر آئے۔ ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ہندو ویدانتی دیکھنے لگے۔ کہ مثنوی مولینا روم اور اسلامی تصوّف کی کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہیں۔ جنہیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں۔ اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے۔ کہ ہندوؤں میں فقط بُت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب

کرنے والے لوگ نہیں۔ بلکہ کئی پاکیزہ خیال، بے حرص اور بے ریا، تارکانِ دُنیا بھی ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں دینِ الٰہی اکبر شاہی کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ لیکن اس رُوحانی مفاہمت کا سلسلہ بند نہ ہُوا۔ جہانگیر نے کئی موقعوں پر اسلامی نقطۂ نظر کی جرأت و استقلال سے پیروی کی۔ لیکن وہ بھی ہندو جوگیوں کا معتقد تھا۔ اور گسائیں جادروپ سے اس کی ملاقاتوں کا حال تزکِ جہانگیری میں کئی جگہ درج ہے۔

شاہجہاں، جہانگیر کی طرح ہندو سنیاسیوں کا قائل نہ تھا۔ لیکن اس کے عہدِ حکومت میں یہ رجحانات ختم نہ ہُوئے۔ اور اس کے آخری ایام میں دارا کی شرکت سے انہیں بڑی تقویت ملی۔ مُسلمانوں میں اس رُوحانی مفاہمت کے ترجمان خود داراشکوہ۔ سرمد۔ دبستانِ مذاہب کا مصنف اور دوسرے کئی آزاد خیال تھے۔ جو داراشکوہ کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی مسلمان تھے۔ جو ہندو سادھوؤں کی روحانیت سے متاثر ہوتے تھے۔ دبستان میں مشہور فارسی شاعر، مُلا شیدا کی رائے ایک گیانی کی نسبت درج ہے:۔

"ملا شیدائے ہندی کہ از شعرائے نامدار و فصحائے عصر بود۔ نوبتے با راقم بخانہ گیانی رنی رفت۔ و با ایشاں صحبت داشت۔ مریدانِ او را دید۔ و وضعِ اہلِ خانہ را مشاہدہ نمودہ بہ شگفتگی فرو ماند۔ و گفت۔ تمام عمرِ من در خدمتِ وارستگاں گذشت۔ چشمِ من چنیں آزادے ندید۔ و گوشم چیزے از انساں وارستہ نشنود"۔

ہندوؤں میں بھی اس رُوحانی آمیزش کو ترقی دینے والے کئی تھے۔ ایک چندر بھان برہمن تھا۔ جو داراشکوہ کا منشی اور فارسی میں پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔

اس کا یہ شعر کئی تذکروں میں نقل ہوا ہے ؎

مرا دلے ایست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

عملِ صالح میں جو عہدِ شاہجہانی کی مستند تاریخ ہے۔ اس کی نسبت لکھا ہے۔" ہر چند بصورت ہندو است۔ لیکن دم در اسلام مے زند" ڈاکٹر سیّد محمدؐ عبداللہ ایک محققانہ مضمون میں اس کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں :-
"دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برہمن فارسی و اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی کیفیات، محبت کی صعوبتیں، تصوّف کی منزلیں، وحدت الوجود کے مراحل، براہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں۔ جس طرح باقی (مسلمان ؟) شعرا کے کلام میں"۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر کہ دارد ہوسِ عشق، نشانے با اوست	چوں گلِ لالہ، بدل داغِ نہانے با اوست
در جہاں باش و لیکن ز جہاں فارغ باش	ہر کہ فارغ ز جہانست، جہانے با اوست
مردِ را سود و زیاں در نظر آید یکساں	ہر کہ شد در گردِ سود، زیانے با اوست

اسی زمانے کا ایک اور ہندو شاعر تھا۔ بھوپت رائے نام، بینغم تخلص، بیراگی لقب۔ شاعری میں خوشگو کا شاگرد اور طریقت میں شیخ الشیوخ محمدؐ صادق اور نارائن بیراگی کا مرید تھا۔ اس کی نسبت سید عبداللہ لکھتے ہیں۔" بینغم کی وفات ۱۱۳۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے۔ کہ بینغم نے ملا شاہ اور دارا شکوہ کے زمانے کی کچھ جھلک ضرور پائی ہو گی۔ دارا شکوہ کا ماحول کچھ اِسقدر صوفیانہ اور فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے اکثر ہندو منشیوں کے متعلق

یہ امر ثابت ہے۔ کہ انہوں نے ترکِ دُنیا کو احساس وجود اور علتِ زندگی کی مصیبت کے ختم کرنے کا واحد ذریعہ سمجھا۔ منشی چندر بھان برہمن نے دارا شکوہ کی وفات کے بعد عزلت گزینی کر لی۔ منشی ولی رام ولی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ اور کلفتِ حیات کو ترکِ آرزو سے مٹایا۔ اگرچہ بنغم بیراگی کا دارا شکوہ کے دربار سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم نارائن چند کی محبت میں وہ بھی ازخود رفتہ ہوگیا۔ اور پھر اس نگری کی راہ لی۔ جہاں دارا شکوہ کا مقام تھا۔ نرائن بیراگی اور شیخ محمد صادق کے دوگونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی میں جابجا ان دورنگی موجوں کا سراغ پاتے ہیں۔ جن کو اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ پائیں گے اس زمانے میں مُلا شاہ (المتوفی سنہ ۷۲ھ) بہت بڑے صوفی اور عالم تھے۔ یہ میاں شاہ میر لاہوری کے شاگرد تھے۔ اور انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی بنغم میں مصنف نے خود حضرت ملا شاہ کا ذکر کیا ہے۔

وہ چہ خوش فرمود مُلا شاہ ما ۔۔۔ شاہِ ما، آں عارفِ آگاہ ما

سینِ انساں گر نبودے درمیاں ۔۔۔ اوّل و آخر نہ بودے غیر آں

بنغم کی مثنوی کی نسبت سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں۔ "مثنوی بنغم کا مطالعہ بتاتا ہے۔ کہ مولوی رومی بنغم بیراگی کے رُوحانی اُستاد تھے۔ مثنوی بنغم، مولانائے روم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب، خیالات کی نوعیت، تصوف کے ساتھ تفلسف کی جھلک سب باتیں، اس حقیقت نفس الامری کو عالم آشکارا کر رہی ہیں۔ کہ اگرچہ

ہم نے ملا شاہ، نارائن بیراگی اور شیخ صادق قدس سرہ کی تصانیف اور فیوضِ صحبت کا اثر بہنجم پر ثابت کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہنجم کا اصلی سرچشمۂ فیض اور سب سے بڑا منبعِ عرفان رُومی تھا"۔ اپنے دعوے کو طویل اقتباسات سے استوار کرنے کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں۔ "مثنوی بہنجم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں ویدانت اور اسلامی تصوّف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے ان ہر دو رُوحانی سلسلوں کے انصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً تصویرِ استغراق۔ بے ثباتیٔ عالم۔ دُنیا کا ایک وہم اور افسانہ ہونا۔ وحدت الوجود وغیرہ مسائل اسلامی اور ہندو تصوّف میں مشترک ہیں"

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے مضمون میں مثنوی بہنجم کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس سے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔ ہم ان میں سے فقط دو اندراجات نقل کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین دیکھ سکیں۔ کہ اس رُوحانی تحریک کے دوران میں، اسلامی خیالات، اور زبان و بیان، کس طرح ایک ہندو کے دل و دماغ کو رنگ رہے تھے۔ بہنجم ایک جگہ دہر کے متعلق کہتا ہے:-

دہر اسمِ اعظمِ اللہ ہست — جلوۂ انوارِ مہر و ماہ ہست
عارفان و عاقلان و عالماں — ساجد دہر اند، جملہ بے گماں
جامعِ اسماست چوں اسمِ آلہ — پس چہ می پرسی زمن اے دادخواہ
نغمہ ام در گوش کن، اے مردِ راہ — لاتسبّ الدہر برخواں رمزِ شاہ
خود انا الدہر بگفتا در کلام — پس چہ می پرسی زمن اے ناتمام
من چو غیر از حق ندیدم در جہاں — پس چہ خوانم دہر را اے نورِ جاں

ایک اور جگہ شیخ شبلیؒ اور جنیدؒ کے درمیان ایک مکالمہ نظم کیا ہے۔ شبلی پوچھتے ہیں۔ اصل علوم کیا ہے؟ جنیدؒ جواب دیتے ہیں ؎

ذات اللہ است اصلِ ہر علوم   نیست صرف و نحو و نے طب و نجوم
اصلِ جملہ علمہا ذاتِ خدا است   کز فروغش روشن این ارض و سما ست
گفت دیگر چیست۔ گفتا غیر ازیں
نیست چیزے در زمان و در زمیں

ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی آمیزش کی یہ کوششیں صرف فارسی زبان میں ہی فروغ نہ پا رہی تھیں۔ بلکہ دارا شکوہ کے ہندو دوستوں نے سنسکرت میں بھی انہیں منتقل کیا۔ چنانچہ مجمع البحرین کا سمودر سنگم کے نام سے اسی زمانے میں سنسکرت میں ترجمہ ہوا۔

علمی نقطۂ نظر سے دارا اور اس کے ہمخیال، ہندو اور مسلمان صوفیہ کی کوششیں بڑی دلچسپ تھیں۔ اور جو مسلمان یہ چاہتے ہیں۔ کہ پورا اسلامی مذہب نہ سہی، لیکن کم از کم اس کے بنیادی اصول ہی دوسرے مذہبوں میں اخذ ہو جائیں۔ اور ان کی اسلام سے بھڑک دُور ہو، وہ بھی ان کوششوں کو پسند کرتے ہوں گے۔ لیکن شخصی حکومتوں میں جو غلامانہ ذہنیت عوام میں راسخ ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ اُن کوششوں کے حق میں جو بادشاہ یا کسی وارثِ تاج و تخت کے زیرِ سایہ شروع ہوں۔ بُرا بُرا ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہ یا شاہزادہ کی ہر جدت کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ حتےٰ کہ انہیں اپنی بوالعجبیوں کا احساس نہیں رہتا۔ خوشامدی درباریوں کے زیرِ اثر اکبر جن قباحتوں کا مرتکب ہوا تھا۔ ان کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

دارا اکبر سے کہیں زیادہ باعلم تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں اختیار بھی بہت کم تھا۔ اس لئے وہ ان انتہائی حماقتوں کا مرتکب نہیں ہُوا۔ جو بدایونی اکبر سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن وہ بھی سادہ لوح اور زُود الاعتقاد تھا۔ اور کشفی واقعات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا۔ اپنی علمی اور رُوحانی کوششوں میں وہ گاہ گاہ جن عجیب و غریب نتائج پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اُس نظریے سے ہو سکتا ہے۔ جس کے مطابق کُلام مجید، اپنشدوں سے ماخوذ ہے!!

داراشکوہ کی تصنیفات میں تلاش و تفتیش کے باوجود کوئی ایسا اندراج نظر نہیں آتا، جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے۔ لیکن ایسے بیانات کئی ہیں، جن کے نمونے آزاد صوفیائے کبار کی تصانیف میں ہی مل سکتے ہیں۔ اور جن کا اظہار ایک تاج و تخت کے مسلمان طالب کے لئے ضرور خلافِ مصلحت ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں حضرت شاہ دلربا کو لکھتا ہے۔ "الحمدللہ الحمدللہ۔ کہ از برکتِ صحبتِ ایں طائفہ شریفہ مکرمہ معظمہ از دل ایں فقیر اسلامِ مجازی برخاست۔ و کفرِ حقیقی رُونمود۔ و معنی ایں رباعیِ عارف نامی مولینا عبدالرحمان جامی ظاہر گشت ؎

در دیدہ عیاں تو بودہ، من غافل — در سینہ نہاں تو بودہ، من غافل
از جملہ جہاں نشاں تو بودہ، من غافل — خود جملہ نہاں تو بودہ، من غافل

اکنوں قدرِ کفرِ حقیقی دانستم۔ زنار پوش و بت پرست بلکہ خود پرست و دیر نشین گشتم ؎

مسلماں گر بدانستے کہ بُت چیست — بدانستے کہ دیں در بُت پرستی است
درونِ ہر بُتے جانیست پنہاں — بزیرِ کفر ایمانیست پنہاں"

اس کے اشعار میں بھی آزاد خیالی اور وحدت الوجودی مسلک صاف طور پر

جھلکتا ہے ؎

ہر خم و پیچے کہ شد، از تاب زلف یار شد　　دام شد، تسبیح شد، زنجیر شد، زنار شد

رباعی

مردم شدم تاکہ بقرآں گشتم　　عارف شدم و زخویش عریاں گشتم
پیدا کر دی مرا ولیکن من ہم　　پیدا کر دم ترا و قرباں گشتم

ابیات

تا دوست رسیدیم، چو از خویش بریدیم　　از خویش گذشتن، چہ مبارک سفرے بود

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن　　قطرہ تا دریا تواند شد، چرا گوہر شود

دارا کی کوششوں کو اس وجہ سے بھی ضعف پہنچا۔ کہ وہ حضرت خواجہ اجمیریؒ۔ حضرت سلطان المشائخؒ اور قدیمی صوفیہ کے زمانے میں شروع نہ ہوئیں۔ بلکہ ان کا آغاز اُس وقت ہُوا۔ جب تصوّف کی اصلاح اور اس کی شرع کے مطابق تطبیق ہو رہی تھی۔ ہم نے حضرت سلطان المشائخؒ کی وفات کے ضمن میں کہا تھا کہ اسکے ساتھ ہی، دہلی میں صوفیہ کا عہدِ زرّیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد تصوّف کو شرع کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ عہدِ مغلیہ میں جوں جوں علومِ اسلامی کو فروغ ہُوا۔ یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔ اور شیخ عبدالوہاب متقیؒ۔ شیخ عبدالحق محدّثؒ۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ جس طرح تصوّف کو تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا تذکرہ ان صفحات میں ہو چکا ہے۔ حضرت مجدّد الف ثانی نے جس طرح ہردے رام نامی ایک ہندو کو رام اور رحیم کے ایک کہنے پر دھتکار

دیا تھا۔ اس کا بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان رجحانات کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ مسلمان علماؒ اور اہلِ فکر کی ایک بااثر جماعت تصوّف میں کوئی غیر اسلامی عنصر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ داراشکوہ کی مساعی ان رجحانات کی صریح مخالف تھیں۔ اس لیئے ان کا متشرع اور محتاط مسلمانوں کی نظروں میں ناپسند ہونا لابُد تھا۔

داراشکوہ کو شخصی اور اتفاقی واقعات سے بھی نقصان پہنچا۔ وہ تاج و تخت کا دعویدار تھا۔ مراد۔ شجاع۔ اور اورنگ زیب اس کے حریف تھے۔ اور وہ سب چاہتے تھے۔ کہ دارا کو عیوب اور نقائص کا مجموعہ ثابت کریں۔ اورنگ زیب کو تو دارا سے اصولی اختلافات تھے۔ لیکن اب مراد جیسے رنگیلے انسان، جو ہر وقت شراب میں غرق رہتے تھے، دارا پہ بدمذہبی کا الزام لگانے لگے۔ اور اپنے خطوط میں اُس کی نسبت "ملحد" "بے دین" "دشمنِ دینِ متین" کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔

داراشکوہ کے ہم خیال تو اسے "محی الدین و ملت" کہتے تھے لیکن مسلمانوں کو اس کی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں سے صحبت ضرور ناپسند ہوگی۔ بھائیوں کی مخالفانہ کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ مسلمان امرا اور علما بھی دارا کو ملحد سمجھنے لگے۔ اور انہیں یہ ڈر پیدا ہوگیا۔ کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوگیا۔ تو اکبر کی مذہبی بے قاعدگیاں پھر ہندوستان میں عام ہو جائیں گی۔

لہ داراشکوہ بعض علما کی طرف اپنے اختلافات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ "در ہندوستانِ حدت نشاں گفتگوئے توحید بسیار است۔ و علمائے ظاہری و باطنی طائفۂ قدیم ہند را از وحدت انکارے و بر موحداں گفتارے نیست۔ بلکہ پایۂ اعتبار است۔ برخلاف جہلائے ایں وقت کہ خود را علما قرار دادہ اند۔ و در پئے قتل و آزار و تکفیر و انکارِ خدا شناساں و موحداں افتادہ۔ جمیع کتبِ توحید را کہ از فرقانِ حمید و احادیثِ صحیحۂ نبوی صریح ظاہر است ردّ مے نمایند و راہزنانِ راہِ خدا یند" (سرِ اکبر۔ دیباچہ)

عہدِ عالمگیری

فقہ اور شریعت کا عروج

عالمگیر اورنگ زیب شاہجہاں کا تیسرا بیٹا تھا۔ داراشکوہ اور شجاع، دونو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ لیکن قابلیت اور کیرکٹر کی پختگی میں وہ ان سے کہیں بڑھا ہُوا تھا۔ وہ محنتی، دور اندیش اور منتظمانہ نقطۂ نظر سے بڑا قابل تھا۔ اس نے ملک کے دُور دراز حصّوں میں صوبیداری کر کے انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا۔ اور اس دوران میں بطور ایک باتدبیر جرنیل اور بہادر سپاہی کے نام پیدا کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈپلومیسی میں بھی اسے کوئی نہ پہنچتا۔ داراشکوہ کی باا ثر مخالفت کی وجہ سے اس کے لئے شہزادگی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ اور اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کے لئے اسے شروع سے ہی بُوڑھے سیاستدانوں کی سب چالیں سیکھنی پڑیں۔ وہ طبیعت کا بڑا ٹھنڈا اور محتاط تھا۔ ضرورت کے وقت اپنے جذبات کو خوب قابو میں رکھتا۔ اور ایسی سب تدبیریں تیزی سے سوچ لیتا۔ جو اسے حصُولِ مقصد میں کام آسکتی تھیں۔

شاہجہاں، جب اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا۔ تو اسے بھی عالمگیر کے عزم و جزم اور اس کی دماغی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا۔ اس کی اپنے بیٹوں کی نسبت

جو رائے تھی۔ اسے اورنگ زیب نے ایک خط میں نقل کیا ہے:۔

مارا بعضے اوقات بہ خاطر راہ مے یابد۔ کہ مہین پور عدوئے نیکو کاران واقع شدہ۔ و مراد بخش بکار تشرب دل بستگی دارد۔ و محمد شجاع جز سیر حشمی وصفے ندارد۔ مگر عزم و شعورِ اورنگ زیب اقتضا مے کند۔ کہ متحمل ایں امرِ خطیر مے تواند شد اما ر کا کت سقمِ عظیم در نوعِ انسانی اوست۔

شاہجہاں اورنگ زیب کے "عزم و شعور" سے خوب واقف تھا۔ لیکن اپنی حکومت کے آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا۔ شاہجہاں کے اس زمانے کے خطوط و احکام پڑھیں۔ تو نظر آتا ہے۔ کہ نہ صرف اورنگ زیب کی نسبت اس کا رویہ پدرانہ شفقت و محبّت سے عاری تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو اس کا طرزِ عمل یکسر معاندانہ ہو جاتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اورنگ زیب سے باز پرس ہوتی ہے۔ اس کے لائقِ فخر کارناموں کی کوئی تعریف نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات تو ان کوششوں میں، جو اورنگ زیب مغلیہ حکومت کی توسیع کے لئے (مثلاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں) باپ کے زیرِ فرمان شروع کرتا ہے۔ روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ اور اُسے دوسروں کی نظر میں ذلیل کیا جاتا ہے شاید شاہجہاں چاہتا تھا۔ کہ اس کے بعد دارا شکوہ، بغیر کسی کشمکش کے وارثِ تاج و تخت ہو جائے۔ اور اس لئے وہ اس کے سب سے قوی حریف کو دبا کے رکھنا چاہتا تھا۔ یا ممکن ہے۔ کہ وہ سمجھتا ہو۔ کہ اورنگ زیب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظر رکھنے کی عادت اور خشک، فقیہانہ طبیعت مستقبل کے لئے ایک خطرہ ہے اور اس وجہ سے وہ بار بار ایسی باتوں پر الجھتا ہو جو، آج ہمیں بالکل بے ضرر نظر

آتی ہیں۔

شاہجہاں اور اورنگ زیب کے جو اختلافات تھے۔ وہ تو پھر جزوی اور ضمنی تھے۔ لیکن اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی مخالفت بنیادی اور بڑی گہری تھی۔ ایک تو وہ دونو تخت اور تاج کے دعویدار تھے۔ جس کا مغلیہ خاندان کی قاموس میں یہ مطلب ہے۔ کہ اگرچہ وہ دونو بھائی بھائی تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور پھر ان کے درمیان فقط ذاتی مقاصد و خواہشات کی ہی دیوار حائل نہ تھی۔ بلکہ ان کے خیالات، ان کے عقائد، ان کے طور طریقوں اور ان کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونو مذہب میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دارا شکوہ آزاد خیال صوفیوں کا پیرو تھا۔ اور اورنگ زیب متشرع بلکہ متشدد علما کا۔ دارا کی وسعتِ مشرب کا تو یہ عالم تھا۔ کہ وہ ہندو موحدین کی مجلس میں اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتا جس طرح مسلمان صوفیہ کی محفل میں۔ اور اورنگ زیب کا یہ حال تھا۔ کہ اس کے نزدیک شیعہ مسلمان بھی کافر اور زندیق تھے[1]۔

ہم حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر کرتے ہوئے۔ اس اختلافِ رجحانات کا ذکر کر چکے ہیں۔ جس کی آئینہ داری اسلامی فکر کے دو نظریئے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کرتے ہیں۔ ان نظریوں کی سب سے نمایاں کارفرمائی دارا اور عالمگیر کی زندگیوں میں

---

[1] بعد میں یہ رنگ ہلکا ہو گیا۔ لیکن شروع میں جو اورنگ زیب کا حال تھا۔ اسکا اندازہ ایک خط سے ہوتا ہے۔ جو اس نے ایامِ شاہزادگی میں شاہجہاں کو لکھا۔ درجمیں والیٔ گولکنڈہ کی نسبت کہا ہے۔ "رفض و سبِ اصحاب کبار را کہ محض کفر و زندقہ است۔ در قلمروِ خویش شائع گردانیدہ"

نظر آتی ہے۔ دارا ایک انتہا پسند وحدت الوجودی تھا۔ اور عالمگیر ایک انتہا پسند وحدت الشہودی۔ داراشکوہ کے مُرشد ملا شاہ اور ان کے پیرِ طریقت حضرت میاں میرؒ سبھی وحدت الوجود کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور اورنگ زیب جن بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلا۔ وہ وحدت الشہود کے قائل تھے۔ اورنگ زیب کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ عقیدۂ وحدت الشہود کے مؤسس، حضرت مجدد الف ثانی کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کا مُرید ہوگیا تھا۔ اس قسم کی کوئی معاصرانہ شہادت ہماری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن وہ خواجہ اور ان کے بھائی خواجہ محمد سعیدؒ کا معترف ضرور تھا۔ اس کی تخت نشینی کے چند سال بعد ہی خواجہ کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اس دوران میں بھی خواجہ اور ان کے بھائی دربارِ عالمگیری میں آئے۔ اور بادشاہ نے کئی سو اشرفیاں ان کی خدمت میں پیش کیں۔ اِن شخصی تعلقات کے علاوہ اورنگزیب نے جن اصولوں پر اپنی حکومت کا نظم و نسق قائم کیا۔ وہ بالکل وہی تھے۔ جن کی تلقین حضرت مجدّد کے مکتوبات میں ہو چکی تھی۔

عالمگیر اور دارا علی الترتیب، وحدت الشہود اور وحدت الوجود یعنی شریعت اور طریقت کے ترجمان تھے۔ اور جس طرح قابل اور جواں ہمت طرفداروں کی مدد سے بالآخر ایک عقیدے اور طریقے کی فتح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مغلوں کے عہد میں ہوا۔ اس سے کوئی اسّی سال پہلے دینِ الٰہی اور شرع کے جھگڑوں میں اکبر اور محمد حکیم مرزا کا مقابلہ ہُوا۔ لیکن حکیم مرزا کی اکبر کے مقابلے میں کوئی ہستی نہ تھی۔ چنانچہ اکبر کامیاب رہا۔ اور اس کی کامیابی سے اہلِ شرع کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اب شریعت اور طریقت کا مقابلہ تھا۔ اور ان کے نمائندے عالمگیر

اور دارا تھے۔ لیکن عالمگیر دارا کی بہ نسبت کہیں زیادہ باتدبیر اور بہادر تھا۔ چنانچہ وہی کامیاب ہوا۔ اور طریقت کا طرفدار ناکام رہا۔ روضۃ القیومیہ میں تو اورنگ زیب کی کامیابی کی وجہ خواجہ محمد معصوم کی دعا لکھی ہے۔ لیکن مورخین کو اس سے بھی زیادہ واضح وجوہ نظر آئیں گے۔ ایک تو اورنگ زیب نے تدبر سے کام لیا۔ اور دارا کے خلاف باقی سب بھائیوں کو اکٹھا کر لیا۔ دوسرے بہادری میں دارا اورنگ زیب کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بہادری اور بے خوفی کا پہلا ثبوت چودہ برس کی عمر میں دیا تھا۔ جب وہ ایک مست ہاتھی کے سامنے کھلے میدان میں ڈٹ گیا۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ ۹ر جون ۱۶۴۶ء کو پیش آیا۔ جب بلخ کی مہم پر اورنگ زیب عبدالعزیز بلخی کے خلاف معرکہ آرا تھا۔ دونوں لشکر آپس میں لڑ رہے تھے۔ کہ نمازِ ظہر کا وقت آ گیا۔ "در عین گرمیٔ ہنگامۂ پیکار وقتِ نمازِ ظہر در رسید۔ و آنحضرت باوجود التماس و امتناع بندہائے ظاہر بیں از مرکوب خاص فرود آمدہ، صف آرائے جماعت شدہ فرض و سنت و نوافل را...... (بہ) کمال حضور و اطمینان ادا کردند"۔

عبدالعزیز خاں پر اورنگ زیب کی اس جرأت کا اتنا اثر پڑا۔ کہ اس نے کہا۔ "باچنیں کسے در اُفتادن بر اُفتادن است" اور اورنگ زیب سے صلح کا خواستگار ہوا۔

اورنگ زیب اور دارا کی قابلیت اور بہادری کا بہترین امتحان جنگِ تخت نشینی کے دوران میں ہوا۔ سموگڑھ کے میدان میں دونوں کی فوجیں لڑ رہی تھیں۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہونا شروع ہوا تو دارا فوراً ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر

سوار ہو بیٹھا۔ فوج نے سمجھا۔ کہ شاہزادہ مارا گیا۔ اور تتر بتر ہو گئی۔ اورنگ زیب کو بھی کھجوہ کے مقام پر یہی صورت پیش آئی۔ وہ ایک ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے خلاف لڑ رہا تھا۔ کہ ایک مست جنگی ہاتھی نے اس کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس موقعے پر اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ جاتا۔ تو ساری فوج تتر بتر ہو جاتی۔ لیکن اورنگ زیب کی جرأت اور قوتِ فیصلہ کام آئی۔ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہونا تو کیا۔ اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں۔ کہ کہیں گھبرا کے بھاگ نہ جائے۔

دارا اور اورنگ زیب کے اوصاف میں جب یہ بیّن فرق تھا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ کامیاب کون ہوتا۔ چنانچہ سنتِ الٰہی کے مطابق زیادہ قابل آدمی کامیاب رہا اور اورنگ زیب تختِ دہلی کا مالک بنا۔

اصلاحاتِ عالمگیری

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے زمانے کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "لیکن نہ اکبر کا بیٹا اور نہ اس کا پوتا شاہجہاں بدچلنی اور بد اخلاقی کے اس طوفان کا مقابلہ کر سکا۔ جو الحاد و تشکک کی تین نسلوں کے درمیان بڑھتا چلا آتا تھا۔ اکبر کے ایک بیٹے نے اپنے آپ کو شراب پی پی کے ہلاک کر دیا تھا۔ اور جب اس کی شراب بند کی گئی۔ تو وہ بندوق کی نالی میں چوری شراب منگوا لیا کرتا تھا۔ دہلی کا وہ محلہ جسے شیطان پورہ کہتے ہیں۔ اکبر کے زمانے کی یادگار ہے بدچلنی کے سیلاب کے ساتھ توہم پرستی بھی آگئی تھی۔ جادوگروں۔ رمّالوں اور کرامت کے دعوے داروں سے دارالخلافہ بھرا پڑا تھا۔ مغل دربار کا ایک

فرانسیسی طبیب لکھتا ہے۔ "یہاں دو پیسے لے کر ایک آدمی کی قسمت بتائی جاتی اور اس جگہ ایک کونے میں ایک پرتگیز خونی دوسروں کے ساتھ دری پر بیٹھا رمل ونجوم کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہے۔ اور اپنی انجیل کی تصویروں کو نجوم کے برج بتاکر اور اپنا قطب نما استعمال کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے" بداخلاقی توہم پرستی اور الحاد کی یہ دنیا تھی۔ جس میں نوجوان زاہد خشک اورنگ زیب نے اپنی آنکھیں کھولیں"۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوا۔ تو اس نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کا قلع قمع کرنے میں صرف کر دیں۔ تخت نشین ہونے کے بعد ہی اس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دے دی۔ جوا بند کر دیا۔ بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا۔ کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لئے محتسب مقرر کئے۔ سنہ ۱۶۶۴ء میں اس نے "ستی" کی ممانعت کی۔ اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کی رسموں کے خلاف احکام جاری کئے۔

اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کیلئے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کی رسم کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا۔ لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا۔ اسے ترک کر دیا۔ اور شاہجہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر ٹیکسوں کا جو بوجھ پڑا ہوا تھا۔ اسے بہت ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اسی ٹیکس معاف کئے۔

وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر

قائم کیا تھا۔ اور عدل و انصاف کا محکمہ علما کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اُس نے تمام مُلک کے قابل علما کو جمع کر کے فتاوائے عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی۔ جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا۔ اُس نے ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء کو بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وفات پائی۔ اور "روضۂ[1] خُلد آباد" میں دفن ہوا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں۔ اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں مساکین میں تقسیم کئے جائیں۔ حسب وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی۔ اور اس کی قبر پر کوئی عالیشان عمارت نہیں۔

ریاست ظاہر اورنگ زیب کی زندگی ایک لحاظ سے اتباعِ و ترویج شریعت کی ایک نہایت روشن مثال ہے۔ لیکن جہاں اس کے عہدِ حکومت میں

---

[1] روضہ خلد آباد اورنگ آباد (دکن) سے بارہ میل کے فاصلے پر مسلمانوں کی ایک پرانی بستی ہے۔ جسے "کربلائے دکن" بھی کہتے ہیں۔ یہاں مشائخ کبار کے مزاروں کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ۔ ابو الحسن تانا شاہ۔ میر حسن دہلوی اور حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کی قبریں بھی ہیں۔ نہایت پُر فضا جگہ ہے۔ اور دولت آباد کے تاریخی قلعے اور الورا کے مشہور غاروں سے بہت دور نہیں۔

اتباعِ شریعت کی کوششیں بداخلاقی۔ شراب خوری۔ جوئے اور بد چلنی وغیرہ کی بیخ کنی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہاں بعض اربابِ شریعت کی تنگ نظری کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مولینا ابوالکلام آزاد نے اہلِ ظاہر کی ایک اہم خصوصیت پر اپنے شاہکار تذکرہ میں تبصرہ کیا ہے :۔

"افسوس جزئیات مزعومہ عقائد کے غرورِ باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا۔ کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عملِ صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی۔ اور سارا دارومدار چند مزعومہ عقائد پہ آکر رہ گیا۔ ساری جستجو اور کاوش صرف اسکی ہوتی ہے۔ کہ فلاں شخص کے عقائد کیسے ہیں۔ یعنی چند مزعومہ جزئیات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے ؟ اس کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ اس کا عمل کیسا ہے۔ اللہ اور اس کے رسُول کی محبت میں انفاق جان و مال کا کیا حال ہے ؟ تقوےٰ و طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے ؟ بندوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھر پور۔ معاملات میں کیا حال ہے۔ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں ؟ ایک شفیق باپ۔ رفیق بھائی۔ وفادار شوہر اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے۔ یا ایک بے رحم وجود۔ بے حس پتھر اور موذی و مُہلک مخلوق ؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر چند اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے۔ تو پھر ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی رُوئے زمین پہ کوئی نہیں۔"

مولٰینا ابوالکلام نے اعمالِ حسنہ پر عقائد کو ترجیح دینے اور جزوی اختلافات کے لئے تکفیر و تذلیل کرنے کی جس مہلک غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ آج کے ظاہر بینوں کی خصوصیت نہیں بلکہ اہلِ ظاہر کا پرانا شیوہ ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ اور چونکہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اہلِ شرع کو زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ایسے واقعات بھی زیادہ ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے انگریزی لیکچروں میں ایک جگہ کہا ہے۔ کہ "فقہ اسلامی' آخری ایام میں اسلام کے بہترین دماغوں کے ہاتھ میں نہیں رہی"۔ اور اگر ہندوستان میں بعض قاضیوں اور مُفتیوں کے حالات پڑھے جائیں تو اِس خیال کی تائید ہو گی۔ ہندوستان میں جو قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام ہُوئے ہیں اور جن کے احکام کو صاحب ایمان اور خوش عقیدہ بادشاہوں نے اس طرح نافذ کیا ہے۔ کہ گویا بہشت و دوزخ کی کنجی ہی ان بزرگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حالات دیکھیں۔ تو حیرانی ہوتی ہے۔ کہ ان بزرگوں کی زندگیوں کو کس طرح مسلمانوں کے لئے نمونہ سمجھا جائے۔

اورنگ زیب کے قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے۔ جنکے متعلق منوچی لکھتا ہے۔ "اورنگ زیب نے ایک دن کہا۔ کہ ہندوستان میں صرف دو آدمی ہیں۔ جو شراب نوشی سے بالکل مبرّا ہیں۔ ایک مَیں اور ایک قاضی عبدالوہاب۔ لیکن عبدالوہاب کے متعلق وہ دھوکے میں تھا۔ کیونکہ مَیں (منوچی) اُسے خود ہر روز شراب بھیجا کرتا تھا"۔ ہمارے خیال میں یہ

قصہ جسے زمانۂ حال کے اکثر مورخین نے صحیح تسلیم کر لیا ہے محض بہتان ہے۔ اور ہم منوچی کو قابل اعتماد راوی نہیں سمجھتے لیکن آخر اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ جب قاضی عبدالوہاب ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء) میں فوت ہوئے۔ تو انہوں نے "ایک لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپیہ نقد علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑا"[1] جمع اموال اور کسب زر میں وہ بھی مخدوم الملک سے پیچھے نہیں رہے۔

مورخین ان کی زراندوزی بلکہ بددیانتی کی صاف شکایت کرتے ہیں۔ مآثر الامرا میں ان کے متعلق لکھا ہے:۔

"قضات بلاد وقصبات باحکام وولات شاد (بمبئی قصاص وداد قتیل) بزر مے فروختند۔ قاضی حضور (کہ بزہد وتدین خود را وانمودہ در تمشیت امور جزوی وکلی لوائے اقتدار بے غیری مے افراشت) امرائے عمدہ اندر حساب بر مید اشتند۔ واز حسد چوں کباب مے سوختند۔ دیا این ہمہ میگویند۔ کہ قاضی در اخذ وجر ید طولی داشت۔ وزرہائے خطیر اندوختہ بود"

اسی سلسلے میں ایک لطیفہ لکھا ہے۔ مہابت خاں لہراسپ اورنگ زیب کا ایک امیر تھا۔ اسے حکم ہوا۔ کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ دکن جائے۔ اور وہ اس کے لئے تیار بھی ہوا۔ ابھی وہ دارالخلافہ کے گردونواح میں ہی تھا۔ کہ اسے پتہ چلا۔ کہ قاضی (عبدالوہاب) تین چار لاکھ روپے کی چیزیں کشمیر اور آگرہ سے خرید کر تاجروں کے مال کے ساتھ احمد آباد بھیج رہا ہے۔ اس کی اور قاضی کی نہ بنتی تھی۔ اس نے

---

[1] "یاد ایام" از مولانا عبدالحی (صفحہ ۶۸)

آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سب کچھ بلا منگوایا۔ اور اپنی سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ کے پاس شکائت ہوئی۔ تو اس نے کہہ دیا کہ مجھے اخراجاتِ فوج کے لئے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ سوداگروں سے بطور قرض کے لیا ہے۔ منافع کے ساتھ واپس کردونگا۔ اب قاضی اس امر کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ کہ اتنا مال متاع سب میرا ہے۔ چنانچہ اسے لہو کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔

قاضی عبدالوہاب کے صاحبزادے قاضی شیخ الاسلام کی نسبت لکھا ہے۔ "او بخلافِ پدر دیانت واقعی داشت۔ وورع وصلاح او منسوب بریا نبود"۔ قاضی شیخ الاسلام کا نام اس اندھیری رات میں چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ واقعی پرہیزگار اور دیانتدار تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کے ورثے سے ایک پائی نہ لی۔ اور جب اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کرنے کے متعلق ان سے استصواب کیا۔ تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس طرح جنگ شروع کرنی ناجائز ہے۔ لیکن ان کا دل قضا میں نہ لگتا تھا۔ چند سال خدمت کرنے کے بعد انہوں نے استعفےٰ دے دیا۔ اور باوجودیکہ بادشاہ بڑا زور دیتا تھا۔ کہ وہ یہ کام سنبھالے رکھیں۔ لیکن انہوں نے طریقے طریقے سے ٹال دیا۔ پہلے حج پر چلے گئے۔ پھر "زیارتِ مقابر بزرگاں وملاقاتِ عیال واطفال" کے لئے رخصت لی۔ اور اپنے آپ کو اس سلسلے میں الجھنے نہ دیا۔ اپنی قضاۃ کے زمانے میں بھی ان کا اصول تھا۔ کہ گواہ بالعموم جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے بیان پر فیصلہ نہیں دینا چاہیئے۔ "نظر بر فسادِ زمانہ (کہ مزاجہا بکذب وزور آشنا شدہ) انفصالِ قضایا بر بینہ وشواہد نمے نمود" ان کے باقی سارے

خاندان میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان کا اپنا بیٹا شیخ سراج دین' برار کا دیوان تھا۔ سرکاری روپیہ غبن کر کے خرقۂ درویشی پہن لیا۔ تاکہ کوئی باز پرس نہ ہو۔ ان کے بھتیجے یعنی قاضی عبدالوہاب کے پوتے محمدؐ معالی خاں کی نسبت لکھا ہے۔ "خوگر شراب وشیفتۂ راگ بُود"۔

ماثرالامرا میں اس زمانے کے قاضیوں کی بڑی شکائت کی گئی ہے۔

"ایں امر جلیل القدر را دین بدنیا فروشاں سخت آساں گرفتہ اند۔ زرہا برشوت خرج مے کنند۔ کہ تا بابطال حقوقِ مردم صد چنداں ستانند۔ نکاحانہ ومہرانہ را حلال تر از شیر مادر میدانند۔ از قضات ارتیٔ قصبات چہ تواں گفت۔ کہ مس علم ایشاں نصیب اعداست۔ وگفتۂ دلیسپاندیہ وگفتۂ زمینداراں' کتاب وشرع آنہاست۔ ہرگاہ درشانِ قضات باعلم وعمل حدیثے وارد شدہ (کہ از سہ قاضی یکے بہشتی است)۔ (وخواجہ محمدؐ پارسا (قدس سرہ) در فصل الخطاب گوید۔ کہ آں قاضیٔ بہشتی ہم مگر قاضیٔ بہشت باشد!) اندازۂ گمراہی وضلالتِ ایں قوم کہ کمتر از جہال اند۔ کہ تواند گرفت"۔

جب شرع کی تدوین وترویج اور اہلِ شرع کی تنظیم قاضی عبدالوہاب اور اُن جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں رہی ہو۔ تو ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ کہ اسلامی حکومت کی سات آٹھ صدیوں میں ایک بھی صاحب اجتہاد فقیہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوا۔ جو بزرگ شیخ عبدالحق کی طرح قابل سمجھدار۔ اور اسلامی مذہب اور شریعت کی گہرائیاں سمجھنے والے تھے۔ یا مجدد الف ثانی کی طرح اسلام کا درد اور اعلےٰ درجے کی اخلاقی جرأت رکھتے تھے۔ وہ قاضی یا مفتی بننے سے کوسوں

بھاگتے تھے۔ شریعت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسی کے اہل تھے کہ فقہ کی کتابیں دیکھ کر حرام حلال کے مسئلے بتادیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ملکی ضروریات کا خیال کر کے اور قوم کی بہبودی کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرع اور فقہ کی ترویج ان اصولوں پر کرے۔ جن سے حکومت اسلامی زبرپا اور محکم ہو۔ جن لوگوں میں شریعت رائج ہے۔ ان کے آرام و فلاح کا انتظام ہو۔ قوم کی اصلاح اور ترقی اس طرح ہو۔ کہ وہ دُنیا کی دوسری قوموں سے آگے بڑھی رہے۔ ان بزرگوں کی نظر کتابوں سے آگے نہ جاتی تھی۔ اور ان کی ترجمانی میں بھی مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے پڑتے۔ آج بھی کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں۔ جن میں تمباکو پینے پر تو دُرّے لگائے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص شرعی حیلوں سے شارع کا تمام مقصد ضائع کر دے۔ تو اس سے کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ ایک شخص کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے آجائے تو وہ مستوجبِ سزا ہے۔ لیکن اگر وہی شخص سو عورتوں سے یکے بعد دیگرے اس طرح شادی کرے۔ کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتیں اس کے نکاح میں نہ ہوں۔ تو خواہ وہ نفس پرستی اور ہوس رانی میں اپنی زندگی گذار دے۔ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنادے۔ وہ قابلِ الزام نہیں۔ بعض اربابِ شریعت کی اسی ظاہر پرستی پر اہلِ طریقت کو اعتراض رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے شریعت اور طریقت کا اختلاف بڑھا۔ اگر دونوں فریق افراط و تفریط کو ترک کر دیں۔ میانہ روی کا راستہ اختیار کریں۔ جو قرآن کا صحیح صحیح طریقہ ہے۔ اور جس پر رسولِ اکرمؐ عامل تھے۔ تو یہ اختلاف مٹ جائے۔ اور اس کے مٹ جانے سے اسلام کی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مشکل دُور ہو ؎

اسلامی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم

اورنگ زیب ایک متدین بادشاہ تھا۔ اس نے شرع کے احکام پر اپنا نظام حکومت ترتیب دیا۔ اور اُنکی پوری پوری پیروی کی۔ لیکن وہ کوئی تنگ نظر اور سادہ لوح بادشاہ نہ تھا۔ اس کو اپنے زمانے کے علما اور مدرسین کے نقائص سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک اُستاد کے سامنے اس زمانے کے طرزِ تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُس زمانے کے طریقۂ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

برنیر لکھتا ہے۔ کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک اُستاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا۔ اور درباری اُمرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہُوا۔ تو اورنگ زیب نے ایکدن اسے تخلئے میں بُلا کر ایک طویل تقریر کی۔ اور کہا:۔

"مُلاجی! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مَیں آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے امرا میں داخل کروں؟ مَیں جانتا ہوں۔ کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا۔ اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن مجھے آپ نے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا۔ کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے۔ جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا۔ پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہُوا۔ اور اب شاہِ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا۔ کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں۔ اور شاہنشاہانِ ہندوستان اُن سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ انہی میں ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں

برہوتے ہیں۔ جو شاہان عظیم۔ فاتحانِ جہاں اور بادشاہان عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران۔ کاشغر۔ تاتار۔ پیگو۔ سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کے علم جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کرتے۔ یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار۔ اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں؟۔ ان کے رسم و رواج اور مذہب اور حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی پولیٹکل پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا۔ کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر سلطنتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و تنزل کے اسباب بتاتے'' ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آبا و اجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے!

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لئے کونسے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف و نحو کی بڑی مہارت چاہیئے۔ اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیئے۔ جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک، بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ

مسائل سے پریشان کیا۔ جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دل پسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیئے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی۔ تو مجھے علم و فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی۔ کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا۔ جن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں۔ اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے۔ اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا ہے۔ یا مجھے وہ باتیں پڑھاتے جن سے رُوح کو عظمت حاصل ہوتی ہے۔ یا وہ اصُول بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبُوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی ہیں۔ اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کر دیتے۔ یا مجھے دُنیا کا، اس کے مختلف حصّوں کا اور اس کے نظام کا پُورا پورا حال بتا دیتے۔ تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندرِ اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے۔ اور مَیں پُوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔"

اس طویل اقتباس سے جس کا لفظ لفظ آج بھی اسلامی مدارس سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔ دو باتیں ظاہر ہیں۔ ایک تو عالمگیر کی ذہانت اور قوتِ مشاہدہ۔ اور دوسرے اس نظامِ تعلیم کی خامیاں جس کے

نقائص کی وجہ سے اسلامی حکومت ہندوستان میں پائیدار نہ ہو سکی۔ اور جس کی "استخوان پرستی" آج بھی اسلامی مدارس کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑا روڑا ہے!

یہ اندراج ہم نے برنیر کے سفر نامے سے لیا ہے۔ جو عہدِ عالمگیری میں دیر تک اس ملک میں مقیم رہا۔ اور بعض امرائے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اب بعض اہلِ تحقیق کہتے ہیں۔ کہ یہ تقریر، برنیر کے اپنے نہانخانہ دماغ کی تخلیق ہے۔ عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں۔ ممکن ہے۔ کہ یہ شبہ جائز ہو۔ لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات اس میں درج ہیں۔ وہ فی نفسہٖ اس قدر وزنی ہیں۔ کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کیا یہ امر قابلِ افسوس نہیں۔ کہ جو کوتاہیاں ایک ژرف بیں اجنبی کو تھوڑے ہی قیام کے بعد نظر آ گئیں۔ ان سے ہمارے اربابِ حل و عقد اتنی صدیاں غافل رہے؟

عالمگیر اور غیر مسلم

اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے غیر مسلموں سے منصفانہ سلوک نہ کیا۔ اور مغلیہ رواداری کی دیرینہ روایات کو برقرار نہ رکھا۔ مولانا شبلیؒ نے ایک زوردار اُردو رسالے میں اور مسٹر فاروقی نے ایک مبسوط انگریزی کتاب میں اس اعتراض کی تردید کی ہے۔ لیکن پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے سالوں کی محنت اور تحقیق و تفتیش کے بعد اورنگ زیب کے خلاف جو مواد جمع کیا ہے۔ اور جس چالاکی سے اسے عالمگیر کے خلاف استعمال کیا ہے۔ اُس کا تدارک ان کتابوں سے نہیں ہوتا۔ اسکے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے۔ جو اس زمانے کے ایک ایک واقعہ سے پوری طرح واقف ہو۔ کوئی معاصرانہ تصنیف اس کے مطالعہ سے باہر نہ رہی ہو۔

اور پھر وہ پروفیسر سرکار سے زیادہ قابلیت اور زیادہ انصاف پسندی کے ساتھ ان کے زہر کے لئے تریاق تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ہماری مختصر سی کتاب میں اس مسئلے پر طویل بحث کی گنجائش نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک دو باتوں کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلی توجہ طلب بات یہ ہے۔ کہ جو غیر مسلم مورخین اورنگ زیب کے احکام سے اسلام کے متعلق نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یا جو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اگر اورنگ زیب فرشتہ ثابت نہ ہُوا۔ تو اسلام مطعون ہوگا۔ وہ تناسبِ اُمور کا خیال نہیں رکھتے۔ اسلام کی بُنیاد احکامِ عالمگیری یا فتاوائے عالمگیری پر نہیں۔ بلکہ "کتابِ الہدے" پر ہے اور اسی کے مطابق یہ مذہب پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر عالمگیر یا کوئی دوسرا مسلمان اس کے سمجھنے میں غلطی کرے۔ تو اس سے سارا مذہب مطعون نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے حسن و قبح کا اندازہ تو قرآن کریم سے ہی ہوسکتا ہے۔ جو مذہبی رواداری کے معاملے میں بہت واضح ہے۔ "لَا اِکرَاہَ فِی الدِّین"!

اس کے علاوہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے طرزِ عمل سے ہندو برگشتہ ہو گئے تھے۔ اور اس سے مغلیہ حکومت کو زوال ہوا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کی رائے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب ہوئی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں۔ اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگ زیب نے انہیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لئے ایک بڑا بوجھ ثابت ہوئی۔ لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی

نہ مذہبی۔ بلکہ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی۔ اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی۔ راجپوت۔ بندیلے اور سیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر سیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے۔ اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کئے۔ اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے"

سرپی۔سی رائے نے حال میں اپنی ایک تقریر میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔کہ "جو لوگ سیواجی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیا تھا۔ اور وہ مغلوں کے خلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا۔ وہ غلطی پر ہیں"

اس مسئلے پر ہم سرپی۔سی رائے سے پوری طرح متفق ہیں۔ سیواجی افغان قبائل کے راہنما خوشحال خاں خٹک کی طرح حکومت سے برسر پیکار تھا۔ اور اورنگ زیب سے وہ اس لئے زیادہ ناخوش تھا۔ کہ وہ سمجھتا تھا کہ اورنگزیب نے میری مناسب قدر و منزلت نہیں کی۔ اور مجھے کوئی اچھا منصب نہیں دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مورخین کی رائے کے مطابق وہ اپنا مقصد گاؤ اور برہمن کی رکھشا بتاتا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ بیان محمود غزنوی یا حال کے فرقہ پرست لیڈروں کے بیانوں کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اپنی ذاتی مصلحتوں کے لئے قومی خدمت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سیواجی کے حالات میں یہ بات قابل غور ہے کہ اُس نے سُورت اور دوسری جگہ کے ہندوؤں کو برابر لُوٹا۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ اورنگ زیب کے دربار سے محض اس لئے بھاگ آیا کہ اُسے پنجہزاری سے

زیادہ عہدہ نہ ملا۔ تو اس کا اصل مقصد ذاتی شان و شوکت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ سیواجی کا دادا مُسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا۔ اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا۔ جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے۔ جو حقیقتاً مسلمانوں کے نام ہیں۔

مرہٹوں کے علاوہ اورنگ زیب کے صوبیداروں کو گورو گوبند سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کشمکش میں بعض افسوس ناک واقعات ظہور پذیر ہُوئے لیکن غیر مسلم مورخین یہ امر بھُول جاتے ہیں۔ کہ اپنی وفات سے پہلے گورو گوبند سنگھ جی مُغل فوج میں ایک عہدے پر مقرر ہو گئے تھے۔ اور جب انہیں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر زخمی کیا۔ تو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے اپنا خاص طبیب ان کے معالجے کے لئے بھیجا۔

خوشحال خاں خٹک

اورنگ زیب کے مخالفین میں صرف مرہٹے اور سکھ نہ تھے۔ بلکہ اسے افغان قبائل کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ اور معاصرانہ ادب سے خیال ہوتا ہے۔ کہ افغانوں کی بغاوتیں وہ عام سرحدی شورشیں نہ تھیں۔ جن سے حکومت دہلی کو اکثر دوچار ہونا پڑا ہے۔ بلکہ بعض افغان اپنے قبائل کی اُسی طرح تنظیم کر رہے تھے۔ جس طرح گورو گوبند سنگھ سکھوں کی، اور سیواجی مرہٹوں کی۔ اور چاہتے تھے۔ کہ اپنے علاقے کو مغلیہ حکومت سے آزادی دلائیں۔

افغان بغاوت کا راہنما خوشحال خاں خٹک تھا۔ جو پشتو شعرا کا سرتاج ہے۔ وہ بیک وقت صاحب السیف و القلم تھا۔ اور اس کے اشعار میں جوشِ آزادی، افغانوں کی فوقیت اور مغلوں کی مخالفت کی آگ اس طرح بھری ہوئی ہے۔ کہ ایک زمانہ گزرنے پر بھی ان سے افسردہ دل گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ قبیلہ خٹک کا سردار تھا۔ شاہجہاں نے اس کا حق سرداری قبول کر لیا۔ لیکن اورنگ زیب نے چند شکوک کی بنا پر اسے گرفتار کیا۔ اور گوالیار کے قلعے میں سات سال تک قید رکھا۔ اس قید و بند نے خوشحال کو ہمیشہ کے لئے مغلوں اور اورنگ زیب کا دشمن بنا دیا۔ اور جب اسے وفاداری کے وعدے پر آزادی ملی۔ تو اس نے اس وعدہ کا ایفا ضروری نہ سمجھا۔ اور کچھ دیر بعد جب سرحد پر آفریدیوں نے بغاوت کی تو اس نے اپنے پُر اثر اشعار سے اس آگ کو اور بھڑکایا۔ اور کئی سال تک بغاوت کی تنظیم کی۔ حتےٰ کہ اورنگ زیب کو اٹک کے قریب دو سال تک خود ڈیرے ڈالنے پڑے۔ یوسف زئی افغانوں کی مدد، اور زر و مال کی تقسیم سے (جس سے سرحد کے اکثر مسائل حل ہوتے ہیں!) اورنگ زیب نے بالآخر اس شورش کو فرو کیا۔ اور خوشحال خاں کا اپنا بیٹا بہرام باپ کے خلاف مغلوں سے مل گیا۔ لیکن خوشحال خاں کی آتشِ انتقام فرو نہ ہوئی۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور جب ساتھیوں کے ترکِ رفاقت سے بے بس ہو گیا۔ تو اشعار میں ہی اپنے دل کا بخار نکالا ؎

ظلم سے اکبر بتوں کے چپ نہ رہنا چاہیئے
اور نہ کچھ بن پڑے تو شعر کہنا چاہیئے

ہندوستانی ادبیات میں خوشحال خاں کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ فقط اس کی تصنیفات پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ جن سے پتہ چلے گا۔ کہ اس جوشیلے مگر زرف بیں افغان کے دل میں مغلوں اور مغل بادشاہ کی نسبت کیا خیالات گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب کا وہ جانی دُشمن تھا۔ اس لئے اورنگ زیب کی نسبت اس کی رائے اعتبار کے قابل نہیں۔ لیکن اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے دُشمن اس کی نسبت کیا کہتے تھے۔ خوشحال مغل بادشاہ کے متعلق ایک غزل میں لکھتا ہے (ترجمہ)

"مَیں اورنگ زیب کے عدل و انصاف کو خوب جانتا ہُوں!
اور اس کے دین و مذہب، اور نفس کُشی اور روزہ داری سے بھی واقف ہُوں!
کیا اس کے سب بھائی ایک ایک کر کے اس کی تلوار کے شکار نہیں ہُوئے؟
اور اس کے باپ کو خود، شکست کھا کر، قید خانہ کی مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں؟
خواہ کوئی شخص دن میں ہزار بار سجدے کرے اور زمین پر سر مارے،
اور روزوں کی کثرت سے اس کی ناف ریڑھ کی ہڈی سے مل جائے،
جب تک اس کے دل میں نیک کام کرنے کی خواہش نہ ہو۔
اس کی سب عبادتیں اور طہارتیں مکر و ریا ہیں۔
اورنگ زیب کی زبان کچھ اور کہتی ہے۔ اور اس کا دِل کچھ اور ہی سوچتا ہے۔

خدا کرے کہ اس کے دل اور گردے مجروح ہو جائیں اور وہ تیغ و تفنگ کا شکار ہو!"

لیکن خوشحال کو فقط اورنگ زیب سے عداوت نہ تھی۔ وہ افغان تحریک کا راہنما تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ افغان پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لیں۔ اس نے کئی نظموں میں قدیم افغان بادشاہوں اور بہادروں کا ذکر کر کے افغانوں کو تلقینِ عمل کی ہے۔ ایک قصیدہ میں مغل فوج کے خلاف اپنی فتوحات گنا کر، اور اورنگزیب کی گھبراہٹ کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

جب صورتِ حالات یہ ہو، تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں
کہ یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں۔ یا افغان تباہ ہو جائیں۔
اگر جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یہی نیرنگئ روزگار کا تقاضا ہے
اور یہی خدا کی مرضی ہے۔ تو پھر یہ کچھ ہو کے رہے گا۔
زمانہ ہمیشہ ایک ہی روش پر نہیں چلتا۔
آج یہ پھول پہ مہربان ہے۔ اور کل کانٹے پر۔
سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نجات نہیں ملتی
جو افغان اس کے سوا کچھ اور سوچتا ہے۔ وہ گمراہ ہے۔
افغان تیغ زنی میں مغلوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔
کاش کہ عقل اور سمجھ میں بھی وہ زیادہ محتاط و ہوشیار ہوں۔
اگر جدا جدا قبیلے سب ایک دوسرے کی مدد کریں
تو بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑے۔

ایک غزل میں افغان بادشاہوں کا ذکر کر کے افغانوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ (ترجمہ)

بہلول کی شہرت اور شیر شاہ کی، میرے کانوں میں آتی ہے
جو ہندوستان کے افغان بادشاہ تھے۔ بڑے بہادر اور منتظم
انہوں نے چھ سات نسلوں تک اس عقل سمجھ سے حکومت کی
کہ ساری دنیا ان کی تعریف سے گونجتی تھی۔

خوشحال نے ہندوستان میں ایک عرصہ گزارا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ مغلوں کا عسکری نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ ایک غزل میں کہتا ہے (ترجمہ)

مغل جو اب میری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ پہلوں کی طرح نہیں۔
اب ان کی تیغ و تفنگ کا زمانہ گزر گیا۔ اور فقط قلم ان کے پاس ہے۔
وہ افغانوں کو زر و مال سے خریدتے ہیں۔ اور مکر و فن سے انہیں پھسلاتے ہیں۔

مغلوں سے افغان عداوت کے آثار صرف خوشحال کی شاعری میں ہی نہیں ملتے۔ بلکہ اس زمانے کے دوسرے افغان شعرا کے کلام میں بھی اس کا اظہار ہے۔ حمید کا ایک پشتو شعر ہے۔ (ترجمہ)

مغل جس گھر میں پہنچے پتھروں کی طرح
ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا دنیا میں بے انصافی کی وجہ سے آگ لگ گئی۔

ایک اور مشہور شاعر خواجہ محمدؒ کا شعر ہے۔ (ترجمہ)

اورنگ زیب کی بادشاہی میں انصاف نہیں ملے گا۔

میں، خواجہ محمدؐ نکل جاؤں گا کسی اور طرف کو۔

افغان عصبیت کے اس اظہار سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ ان لوگوں کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی۔ ابھی تک اسلامی قومیت اور ملّی یکجہتی کے زیر اثر افغان اور مغل قبائلی اختلافات رفع نہ ہوئے تھے۔ لیکن اسلام سے خوشحال خاں خٹک کو بھی اسی طرح محبت تھی۔ جس طرح اورنگ زیب کو۔ اور اس کی کئی نظموں میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔ (ترجمہ)

تمام تیراہ میں مؤذن کی آواز نہیں سنائی دیتی

سوائے اس بانگ کے جو مرغِ سحر کے گلے سے نکلتی ہے۔

اور بارک زئی، وہ بھی راہِ ہدایت سے دُور جا پڑے ہیں

اور آفریدی تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

نہ وہ نماز پڑھتے ہیں، اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی مُلّا ہے

نہ وہ زکوٰۃ صدقہ دیتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کے دلوں میں خُدا کا خوف ہے!

نیک وہی ہے۔ جو نبی کے احکام اور شرع کی پیروی کرتا ہے۔

اور بدبخت وہ ہے۔ جو ان کی بجا آوری میں ٹال مٹول کرے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ تصوّف کی مرّوجہ صورت سے خوشحال کو بڑی شکایت تھی اس نظم میں آگے چل کر لکھتا ہے (ترجمہ)

صوفیہ کے قائل اور ملحد سبھی ایک سے ہیں۔

کیونکہ دونوں شرع اور احکام نبوی سے پہلو بچاتے ہیں

گاہے گاہے، کبھی کبھار، وہ کہہ لیتے ہیں

(ان میں سے چند ایک) لا الٰہ الا ہو

لیکن وہ ہمیشہ گناہوں میں شرابور رہتے ہیں۔ اور تائب نہیں ہوتے۔
خدا بچائے ان لوگوں سے" یہی خوشحال کی دعا ہے!

علوم و فنون
۱۶۰۵ – ۱۷۰۷ء

اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء میں ہوئی۔ اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ وہ شراب اور عیش کا دلدادہ لیکن سمجھدار اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ تزک جہانگیری سے اس کی قوتِ مشاہدہ اور ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کا خاتمہ کر دیا لیکن باقی باتوں میں اکبر کی پیروی کی اور اس کے زمانے میں فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا۔ وہ شعرا کا قدردان تھا۔ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا جس کے کئی اشعار پُر لطف ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ طالب آملی اور اس کا جانشین کلیم، فارسی شاعری کے دورِ زوال کی یادگار ہیں۔ انھوں نے ایک خاص طرز میں شعرگوئی اختیار کیا۔ جو بعض لحاظ سے دلچسپ لیکن شاعرانہ روح سے عاری تھا۔ فنِ تعمیر میں بھی عہدِ جہانگیری کے کئی نمونے موجود ہیں۔ لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ فروغ مصوّری کو ہوا۔ جس کا جہانگیر ایک اچھا نقاد تھا۔ عہدِ جہانگیری کے بہترین مصوّر چار تھے۔ ابوالحسن جسے "نادر الزمان" کا خطاب ملا تھا۔ اور منصور جسے "نادر العصر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بشن داس اور فرخ بیگ بھی مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ اس عہد کے علما و صلحا کا ذکر شیخ عبدالحق کے تذکرے کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

۱۶۲۶ء میں شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ خاندانِ مغلیہ کا سب سے زیادہ شان دار اور پُرشکوہ عہدِ حکومت ہے۔ فارسی کا مشہور شاعر صائب اسی

زمانے میں ہندوستان آیا۔ لیکن ملک الشعرائے دربار کلیمؔ تھا۔ جس کا قدِ مقابل قدسی سمجھا جاتا تھا۔ علما و فضلا میں عبد الحکیم سیالکوٹی۔ سعد اللہ خاں وزیر اعظم۔ اور مُلّا محمود جونپوری مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ جن میں محمدؐ امین قزوینی۔ عبد الحمید لاہوری۔ اور راجہ بہاری مل قابلِ ذکر ہیں۔ مصوّر بھی بہت تھے۔ شاہجہان کے زمانے میں ہندوستانی مصوّر ایرانی اور ولائتی مصوّروں سے فن مصوّری سیکھ کر خود اتنے کامل ہو گئے تھے۔ کہ وہ ایرانی مصوّروں کا بخوبی مُقابلہ کر سکتے تھے۔ اور اس عہد کے مشہور مصوّروں میں زیادہ تر ہندوستانی بلکہ ہندو ہیں۔ مصوّری سے زیادہ جس بات میں شاہجہاں کا زمانہ ممتاز ہے۔ وہ اسلامی فن تعمیر کا عُروج ہے۔ اس زمانے میں تاج محل لال قلعہ۔ جامع مسجد دہلی۔ جہانگیر کا مقبرہ اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور جن سے بہتر فن تعمیر کے نمونے شائد ہی دنیا میں کہیں ہوں۔

اورنگ زیب کے زمانے میں موسیقی اور مصوّری کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ خود شعر کا صحیح نقاد تھا اور اس نے کم از کم ایک نہایت پُراثر اور بلیغ شعر خود لکھا ہے ؎

غمِ عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم

چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

لیکن اس نے ملک الشعرا کا عہدہ موقوف کر دیا۔ مرزا مُعزّ الدین فطرتؔ۔ ناصر علی سرہندی اور نعمت خاں عالیؔ اس کے زمانے کے شعرا ہیں۔ لیکن کفایت شعار اورنگ زیب نے ان کی کوئی قدر نہ کی۔ بلکہ دس سال کی وقائع نویسی کے بعد درباری مورّخ کا عہدہ بھی موقوف کر دیا۔ اور تاریخ نویسی کی ممانعت کر دی۔

اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی مورخین ہوئے۔ اورنگ زیب نے اپنی توجہ زیادہ تر رعیت کی خوشحالی ٹیکسوں اور محصولوں کی کمی اور تعلیم کی اشاعت پر مبذول رکھی۔ اس کا زمانہ فنونِ لطیفہ کے لئے سازگار نہ تھا۔ البتہ شریعت اور علوم اسلامی کی اشاعت خوب ہوئی۔ اس نے اشاعتِ علم کو بڑی ترقی دی۔ مدرسوں کے لئے زمینیں وقف کیں۔ اور مدرّسوں کے مشاہرے اور طلبا کے لئے شاہی خزانے سے وظائف مقرر کئے۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں علوم اسلامی کی بڑی قدر ہوئی۔ لیکن قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے۔ کہ پچاس سال کے طویل عرصے میں، نہ تو شیخ عبدالحق محدثؒ یا امام الہند شاہ ولی اللہؒ جیسا کوئی جید عالم اور نہ ہی حضرت سلطان المشائخؒ یا حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسا کوئی زبردست شیخ، نظر آتا ہے۔ البتہ مدرّس اور فقیہ بکثرت تھے۔ اور ان میں سے بعض خاصے تھے۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر ہستی میرزا محمد زاہد ہروی کی تھی۔ جو علمِ کلام و حکمت میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے ان کے والد قاضی محمد اسلم تیس سال تک قاضئ عسکر رہے تھے۔ مرزا زاہد نے بھی بڑا رسوخ حاصل کیا۔ اُن کا وطن کابل تھا۔ اور شاہجہاں نے انہیں وہیں واقعہ نویسی پر معمور کر رکھا تھا۔ عہدِ عالمگیری میں وہ پہلے محتسبِ لشکر اور بعد میں صدارتِ کابل پر مامور ہوئے۔ اس تقریب سے انہیں دلجمعی سے اپنے وطن میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا موقع ملا۔ انہوں نے کئی درسی کتب مثلاً شرحِ مواقف۔ شرحِ تہذیب دوّانی۔ اور رسالۂ تصور و تصدیق مصنّفہ مُلّا قطب الدین رازی پر حاشیے لکھے۔ جو اب بھی رائج ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۰۱ھ میں

ہوئی۔ جن لوگوں نے ان سے براہِ راست استفادہ کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کا نام بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں اس وقت سب سے زیادہ فروغ علمائے پورب کو حاصل تھا۔ شیخ عبدالحق محدث کی جلائی ہوئی شمعیں دہلی میں مدھم پڑ چکی تھیں۔ پنجاب میں ملا عبدالحکیم کا فیض ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ نے جاری رکھا۔ لیکن وہ گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اگرچہ گجرات میں اب بھی درس و تدریس کا معیار بلند تھا۔ اور اواخر عہدِ عالمگیری میں وہاں مولینا نورالدین احمد آبادی جیسے علما ہوئے۔ لیکن جو امتیازی شان اس وقت بلادِ مشرق کے علما کو حاصل تھی۔ وہ کسی دوسرے صوبہ کو میسر نہ ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ شاہ ولی اللہؒ کی مخصوص خوبیوں کے باوجود عہدِ عالمگیری سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک دہلی اور باقی حصص ملک کی نسبت، لکھنؤ اور دوسرے اضلاع شرقی کی درس گاہیں زیادہ رونق پر تھیں۔ اس وقت بھی ان علاقوں میں ایسے علما تھے جنکے سامنے دوسروں کے چراغ ماند پڑ گئے۔ ایک بزرگ شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون امیٹھوی تھے (وفات ۱۱۳۰ھ) جو لکھنؤ کے قریب قصبہ امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر خود ان کا شاگرد تھا۔ ان کی تصانیف میں سے ایک تفسیر احمدی ہے۔ جس میں ان آیات کی تفسیر ہے۔ جن سے مسائل فقہ مستنبط ہوتے ہیں۔ اور نورالانوار اصُولِ فقہ میں منار کی شرح ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور بزرگ حافظ امان اللہ بنارسی تھے۔ (وفات ۱۱۳۲ھ) جو لکھنؤ میں عہدۂ صدارت پر متعین تھے۔ انہوں نے علمِ فقہ اور علمِ کلام پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے

مورثِ اعلیٰ مُلا قطب الدین سہالوی نے بھی اسی زمانے میں شہادت پائی تھی۔ (۱۱۰۳ھ) ان کے علاوہ شیخ غلام نقشبند لکھنوی بھی جنہوں نے علمِ تفسیر اور فن تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ذکر کے قابل ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۲۶ھ میں ہوئی۔ سید عبدالجلیل بلگرامی (وفات ۱۱۳۸ھ) جو حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا اور خود ایک پُر گو شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ طریقت میں شیخ غلام نقشبند کے مرید تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اس زمانے کے جس بزرگ نے علمی حلقوں میں نام پایا۔ اور معقولات کو درسیات میں بڑی ممتاز جگہ دے دی، قاضی محب اللہ بہاری تھے۔ وہ لکھنؤ اور حیدر آباد دکن میں قاضی رہے۔ پھر اورنگ زیب کے پوتے شہزادہ رفیع القدر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اور عالمگیر کی وفات کے بعد چند ماہ تمام ہندوستان کی صدارت پر مامور رہے۔ آپ نے فقہ اور منطق کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے بعض آج بھی مستعمل ہیں۔ مسلّم الثبوت فقہ اور اصولِ فقہ کے متعلق آپ کی ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اور علامہ بحر العلوم اور دوسرے علماء نے اس پر حاشیے لکھے ہیں۔ منطق میں آپ کی مشہور کتاب سلّم العلوم ہے۔ ان کے علاوہ افادات۔ جوہر فرد اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔

عہدِ عالمگیری کی دو تین کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک مُلا محسن (متوفی ۱۷۰۷ء) کی ردِّ شیعہ ہے۔ جس میں اُنہوں نے دلائل و براہین سے شیعوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ دوسری نجم الفرقان ہے۔ جسے مولانا محمد مصطفےٰ بن محمد سعید نے اورنگ زیب کے نام معنون کیا۔ یہ فلوگل کی کتاب

کی طرح کلامِ مجید کے الفاظ کا انڈکس ہے۔ تیسری کتاب عہدِ عالمگیری کی سب سے اہم تصنیف فتاوائے عالمگیری ہے۔ جسے حنفی علما ہدایہ کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں۔ لیکن کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہ تھی۔ جب اورنگ زیب نے باقاعدگی سے شرع رائج کی۔ تو اس نے محسوس کیا۔ کہ کئی باتیں ایسی ہیں۔ جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس نے ہندوستان کے ممتاز علماء کی ایک جماعت کو حکم دیا۔ کہ فقہ کی تمام کتب سے "مفتیٰ بہا مسائل" منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے۔ جو فقہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس جماعت کے صدر شیخ نظام تھے۔ علما کے لئے وظائف مقرر ہوئے۔ اور آٹھ سال کی محنت کے بعد کتاب تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک تھا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ روزانہ مُلا نظام سے پڑھوا کر سُنتا تھا۔ اور اس پر جرح قدح کر کے مناسب تغیّر و تبدّل کروا تا۔ فتاوائے عالمگیری کا اُردو ترجمہ نولکشور پریس نے دس جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق معارف کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں۔ "حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کتاب نے علماء اور طلباء کو فقہ کی تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔"

امام الہند شاہ ولی اللہؒ

۱۷۰۳ء اٹھارویں صدی عیسوی کے تیسرے سال کی ابتدا ہے۔ اسلامی ہندوستان کا آخری جلیل القدر بادشاہ، عالمگیر، دکن میں مخالفوں سے برسرپیکار ہے۔ اس کی عمر پچاسی ۸۵ سال کی ہو رہی ہے۔ بڑھاپے کے بوجھ سے کمر جھک گئی ہے۔ لیکن اس کمزور اور نحیف جسم کے اندر ابھی وہی آہنی دل ہے۔ جسکے بل بوتے پر عالمگیر چودہ برس کی عمر میں ایک مست ہاتھی کے سامنے یکہ و تنہا ڈٹ گیا تھا۔ اس کی دماغی محنت اور مستعدی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فوج کی کمان بذاتِ خود کر رہا ہے۔ مختلف مہموں کے نقشے خود سوچتا ہے اور قلعوں پر حملے کے وقت اپنے جرنیلوں کی خود راہنمائی کرتا ہے۔

اسے اپنے مقاصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے مرہٹوں کا شیرازہ، اگر اس کا دار و مدار کسی ایک شخص یا کسی ایک مرکز پر تھا، منتشر کر دیا ہے۔ لیکن اس کا دل جانتا ہے۔ کہ وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے بڑے بڑے قلعے فتح کر لئے ہیں۔ لیکن اب ہر مرہٹے کا گھر قلعہ ہے جس میں بادشاہ کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں۔ بیشک اب سب بڑے بڑے علم برداران بغاوت مٹ گئے ہیں۔ یا مٹا دئے گئے ہیں۔ لیکن اس سے

دکن میں سناٹا نہیں ہوا۔ اب ہر مرہٹہ کاشتکار سپاہی ہے۔ جو کبھی شیواجی کے کسی خوردسال جانشین کی زیرِ قیادت اور کبھی کسی من چلی رانی کی متابعت میں، مغلوں کے لئے عذابِ جان بنا ہوا ہے۔

مولینا شبلی کا بیان ہے۔ کہ اب مرہٹے محض "اڑتے ہوئے ذرّے" رہ گئے تھے۔ یہ تشبیہ کسی حد تک گمراہ کن ہے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ اس وقت مرہٹوں کی مرکزیت تباہ ہو گئی تھی۔ تو سوچنا چاہئے۔ کہ اس کے لئے حکومتِ دہلی کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ بیجاپور اور گولکنڈہ کی وسیع، خودمختار ریاستیں تو ایک سال کے اندر مغلیہ مقبوضات میں داخل ہو گئیں۔ لیکن مرہٹوں کو سر کرنے میں اورنگ زیب نے پچیس ۲۵ سال صرف کئے۔ اور اس تمام تگ و دو کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ جونہی اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں۔ یہ اڑتے ہوئے ذرّے بگولے بن گئے۔ اور خیامِ شاہی کو اپنی تند رفتاری کے ساتھ لے اڑے۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کو، اس کی ذاتی خوبیوں کے باوجود حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ لیکن سب سے اہم وجہ، جس میں اسلامی حکومت کے زوال کا راز پنہاں ہے، مغل اُمرا اور مغل لشکریوں کی اخلاقی اور عسکری کمزوری تھی۔ بادشاہ کی بیدار مغزی۔ ہمت۔ محنت اور استقلال میں کلام نہیں۔ لیکن اس کے سپہ سالاروں اور سپاہیوں میں آرام طلبی۔ غداری۔ فرض ناشناسی اور خودغرضی جیسی قبیح خصلتیں اچھی طرح گھر کر چکی تھیں۔ اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے کہیں پست درجے پر تھے۔ مرہٹوں میں ابھی ابھی پنڈھرپور کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب ایک

زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خاندانی نزاعیں دب گئی تھیں۔ اور ان کا ہر فرد، مغلوں کے مقابلے میں قلمے، قدمے، درمے جس طرح بھی ہو سکتا تھا۔ برسرِ کار تھا۔ دوسری طرف وہ مغل امرا اور لشکری تھے۔ جنہیں عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کے عیش و عشرت نے پوری طرح متاثر کیا تھا۔ ان کے لئے اتنی مدت تک، شمالی ہندوستان سے دور دکن کی لڑائیوں میں مبتلا رہنا ہی ایک ایسی مصیبتِ عظمیٰ تھی۔ کہ شاید وہ مرہٹوں کی فتح کو بھی اس پر ترجیح دیتے۔ ان کے دل میں اس وقت جو گزر رہا تھا۔ اس کی ترجمانی نعمت خاں عالیؔ اس طرح کرتا ہے ؎

سخن را بود در تقارب قبول	فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعول
الٰہ است اللہ در جہاں خدا	مگر او کند رحم بر فوجِ شاہ
رحیم است و غفار آموزگار	ندانم چہ شد حصۂ ایں سپاہ!

لیکن مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض نہ تھا۔ بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بھی بہت تھے۔ جن کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں کے ساتھ مل جاتے تھے۔ اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور تو اور مغل شاہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جنجی کے محاصرے کے وقت شاہزادہ کام بخش نے، جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا۔ راجا رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا۔ اور وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا۔ کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتہ لگ گیا۔ اور انہوں نے اسے گرفتار کر کے زیرِ حراست

اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شاہزادہ محمد اعظم کو رشوتیں دے کر یہ طے کر لیا تھا۔ کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مخل نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت دو ماہ کی رسد تھی۔ چھ ماہ تک فتح نہ ہُوا!

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی۔ وہی حالت قلعہ داروں۔ منصب داروں۔ محاسبوں اور معمولی سپاہیوں اور امیروں وزیروں کی تھی۔ اور جن قلعوں کی فتح میں کئی مہینے صرف ہوئے تھے۔ وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دنوں میں دشمن کو، بغیر کسی کشت وخون کے واپس مل جاتے۔ جب ۱۷۰۴ء میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر واکن کھیڑہ کی طرف متوجہ ہُوا۔ تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ، پرنالہ اور پاڈ گڑھ کے قلعے مُغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے!

دُشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی۔ کہ لڑنے سے جی چُراتے اور اگر انہیں کہیں خطروں کا سامنا کرنا پڑتا۔ تو بجائے، ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے، راہِ فرار اختیار کرتے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ اس "فنِ کثیف" میں بادشاہ کے بھائی بند تورانی، "بدمذہب" ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب سے ایک تورانی امیر، امیر محمد امین نے شکائت کی۔ کہ فوج کے اعلےٰ عہدے "بدمذہب اور دیو سیرت" ایرانیوں کو مِل رہے ہیں۔ تو بادشاہ نے لکھا:۔

"جماعتِ تورانیاں، کہ برادرانِ ہمشہری بزرگان ما اند ..... بہ مضمون

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ یعنی میندازید خود را بدستہائے خود در ہلاکت، در عین گیرودار مراجعت را معیوب نمے دانند۔ اگر در آوردن کسے این حالت رو دہد۔ چنداں مضائقہ ندارد۔ لیکن در عین کارزار سخت مشکل است۔ اگر عیاذاً باللہ از ہمراہیان حضور این صورت واقع شود۔ در یک لحظہ مقدمۂ تمام حکایت بانجام برسد۔

اگر دریں امر مجرب و آزمودہ انکارے داشتہ باشد۔ مفصل معروض دارد۔ وجماعتِ ایرانیاں، خواہ ولایت زا، خواہ ہندوستان زا، کہ بجہلِ مرکب مشہور اند، بصد مرحلہ ازیں حرکت دور اند ؎

انصاف بدہ کہ جہلِ آں مردمِ زشت

بہتر زہزار عقلِ روباہ سرشت

اورنگ زیب اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ اور وہ بار بار اپنے رقعات میں دیانتدار، کاردان ملازموں کی کمی پر آنسو بہاتا ہے ایک جگہ لکھتا ہے۔ "آدم ہوشیار، امانت دار، خداترس، آباداں کار، کمیاب ؎

آنچہ بر جستیم و کم دیدیم و بسیار ست و نیست

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست و نیست"

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ "حالا یک کس برائے دیوانیٔ بنگالہ کہ بہ حلیۂ راستی و کاردانی آراستہ باشد، مے خواہم، یافتہ نمے شود۔ از نایابیٔ آدمِ کار، آہ۔ آہ"۔

پوچھنے والے پوچھیں گے۔ کہ عجب معاملہ ہے۔ کہ اسلامی ہندوستان کا سب سے زیادہ مذہب پرست بادشاہ برسرِ اقتدار ہے۔ ہر طرف اہلِ شرع کا

بول بولا ہے۔ لیکن وہی انسانی خوبیاں، جن کے لئے مذہب مفید بتایا جاتا ہے۔ مفقود ہوگئی ہیں۔ اور بادشاہ خود کہتا ہے۔ کہ راستی، خدا ترسی، امانتداری کمیاب، بلکہ نایاب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ شرع اور فقہ کی گرم بازاری سے باطنی بُرائیوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے۔ (محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟) ان کا کام شعائرِ اسلامی کی حفاظت ہے۔ قمار بازی کا سدِ باب، شراب کی بندش۔ جزیئے کا نفاذ۔ نئے بُت خانوں کی ممانعت۔ صغائر و کبائر کی سزا دہی۔ ان پر فقیہ زور دیتے ہیں۔ لیکن رُوحانی اور باطنی کوتاہیوں کا ان سے مداوا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہی ان کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔

سرہند سے بیشک ایک تحریک اُٹھی تھی۔ جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا۔ لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی۔ اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور حقارت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی۔ اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔ مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی۔ اور تجدیدی تحریک قیومیت کے سراب میں گم ہوگئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی۔ تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک نام نہاد قیومیت کا دعویدار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ کہ قیوم میں ہوں اور دُنیا میرے سر پر قائم ہے! حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے۔ اس کا بیان ایک معتقد کی زبان سے سُنئے۔ "آپ کی بارگاہ عالی اطلس کی بنی ہوئی

تھی۔ جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس بارگاہ میں سُنہری کُرسی جواہرات سے جڑاؤ رکھی جاتی۔ جس پر آپ بیٹھتے تھے۔ اس کے گردونواح۔ امرا۔ بادشاہ۔ خان۔ نہائت ادب سے دست بستہ کھڑے رہتے تھے"!!

یہ تھے حالات، جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھر، اخیر عمر میں ایک فرزندِ ارجمند تولّد ہُوا۔ جس کی قسمت میں لکھا تھا۔ کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے۔ اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سدِباب کرے!

یہ تو نہیں کہا جاسکتا۔ کہ وہ مردِ گرامی حالات کی پُورے طور پر اصلاح کر سکا! اور جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دُور اندیش اور مستعد منتظم نہ روک سکا۔ اسکا فوری سدّباب ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہوسکتا تھا) لیکن اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہُوا۔ کہ جب اس سیلاب کے بند ٹُوٹے۔ تو جہاں مغلوں کا تخت و تاج اس سیلاب میں بہہ گیا۔ وہاں تسبیح و سجّادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ، قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ہو گیا۔

اِس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمتِ عظمیٰ عطا کی۔ اور دوسرے اس نے اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا۔ جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا ہے۔ یہ اِس خاندان کا ہی فیض تھا۔ کہ جب ہندوستان میں اسلام پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہُوئے۔ تو لوگ مذہبِ اسلام سے واقف تھے۔ اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور دوسری مشرقی درس گاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آ رہا تھا۔ وہ اس مذہبی کشمکش میں مفید نہ تھا۔ اسکے لئے

روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی۔ جو فقہ اور منطق سے نہیں۔ بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی۔ اور انہیں اس خاندان نے جس طرح عام کیا۔ اس پر تاریخ گواہ ہے۔

اخلاقی حیثیت سے اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی روح پھونک دی تھی۔ اس کا اندازہ مولینا سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی۔ لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے۔ روہیلے۔ انگریز۔ جو کوئی بھی آیا۔ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ولی الٰہی تحریک کا اثر تھا۔ کہ لوگ، اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور، بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں دیوانہ وار اپنی جان پر کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی۔ لیکن کیا ان لوگوں کے ایثار۔ مذہبی غیرت۔ اور اخلاقی جرأت میں کوئی شک ہے؟

بسودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو کھو سکا!

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہؒ ۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء کو یعنی اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی حیثیت سے اسلام کے زوال کا زمانہ ہے۔ لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ جس سال شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ اسی کے قریب اسلام کے دورِ جدید کا دوسرا بڑا مصلح اور مجدد ریگستانِ نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی حکومت

کے آغاز میں ہندوستان آئے۔ اور بمقام رہتک مقیم ہوئے۔ پہلے ان کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا۔ لیکن ایک بزرگ شیخ محمود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کی۔ اور اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری اور دلیری کے لئے نامور رہا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہہ الدین، صاحب السیف و القلم تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد نے قرآن مجید انہی سے پڑھا۔ لیکن شیخ وجیہہ الدین کی اصل شہرت بطور ایک بہادر سپاہی کے ہے۔ اور ان کی بہادری کے کئی قصے شاہ عبدالرحیم اپنے گھر والوں کو سنایا کرتے تھے۔ تاکہ انہیں بھی اخلاقِ فاضلہ حاصل کرنے کا شوق ہو۔ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے۔ اور جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے درمیان معرکہ ہوا۔ تو اُن چند باہمت اور وفادار سرداروں میں سے تھے جو اُس وقت بھی ثابت قدم رہے جب شجاع کے مست ہاتھیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اور تمام لشکر تتر بتر ہو رہا تھا۔

شاہ عبدالرحیمؒ

شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم تھے۔ انہوں نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی۔ آپ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کچھ گھر پر پائی۔ کچھ اکبرآباد میں میرزا محمد زاہد ہروی کے پاس اور کچھ عرصے کے لئے خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے بھی فیض حاصل کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے "مہندیوں" کے محلے کے نزدیک مدرسۂ رحیمیہ قائم کر کے وہاں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے اہلِ دل علما میں سے ہوتا تھا۔ آپ عام طور پر عہدِ عالمگیری کے درباری علماء سے الگ تھلگ رہے۔ اور شاید اس زمانے کا فقہی ماحول، اور علما کا دنیادارانہ

رنگ آپ کو ناپسند تھا۔ لیکن آپ کے تعلقات دار الخلافے کی اکثر علمی شخصیتوں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً" ان کی طرح تبحر رکھتا ہو۔ وفات آپ کی ۷۷ سال کی عمر میں، جب شاہ ولی اللہ ابھی سترہ سال کے تھے، ۱۱۳۱ھ میں ہوئی۔

شاہ عبد الرحیمؒ کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی ہے۔ اور فی الحقیقت علمی اور دینی خدمات میں بیٹا باپ سے بازی لے گیا۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے۔ کہ شاہ عبد الرحیم خود بڑے سمجھدار اور بلند پایہ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے۔ اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشو و نما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ کہ شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت انکی "جامعیت" ہے یعنی وہ اختلافی مسائل میں ایسا رستہ ڈھونڈتے اور اپنی علمی وسعت اور ذہانت کی مدد سے اکثر ایسا رستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ جس پر فریقین متفق ہو سکیں۔ لیکن یہ خصوصیت ایک حد تک شاہ عبد الرحیم میں بھی موجود تھی۔ مولٰینا عبد اللہ سندھی اُن کی اور ان کے دوسرے فاضل بھائی کی نسبت لکھتے ہیں۔

"ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے۔ جس پر مسلمان فلاسفرین (صوفیہ و متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔

شاہ عبد الرحیم ایک کامل صوفی تھے۔ انہیں خدا رسیدہ

بزرگوں کی بڑی تلاش رہتی۔ اور ان کی صحبت میں وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ابن العربی کے بھی وہ مداح تھے۔ (اگرچہ عوام کے سامنے وحدت الوجود کے مسائل اس لئے نہ بیان کرتے تھے۔ کہ مبادا لوگ انہیں صحیح طور پر نہ سمجھیں اور الحاد و زندقہ میں گرفتار ہو جائیں)۔ لیکن تصوف سے اس قدر شغف کے ساتھ ساتھ وہ فقہ اور علومِ ظاہری سے بھی واقف تھے۔ انفاس العارفین سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ فقہ کی سب سے مفصل کتاب فتاوائے عالمگیری کی تصحیح میں بھی کچھ عرصہ کے لئے شریک تھے۔ اور اس زمانے کے سب مشہور علما و فقہا سے ان کے روابط رہے۔ اسی جامعیت کا یہ اثر ہوا۔ کہ انکا فرزندِ عالی مرتبہ نہ فقہ سے متنفر تھا۔ نہ تصوف کا مخالف اور دونوں کے اختلافات دُور کرنے کی طرف مائل تھا۔

اس اعتدال پسندی اور ہمہ گیری کے علاوہ ایک خصوصیت جو شاہ عبدالرحیم' اور ان کے خاندان کو دوسرے علما سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی عملی سوجھ بوجھ ہے۔ عام علما کتابوں میں ہر وقت محصور رہتے ہیں اور بالعموم مسائل کے نظری اور خیالی پہلوؤں پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ بھی اربابِ عمل نہ تھے۔ اہلِ علم تھے۔ اور وہ نظر کی پختگی اور حقیقت پسندی جو زمانے کے تھپیڑے کھانے اور اہم امور و معاملات کا انتظام کرنے سے آجاتی ہے۔ ان میں بدرجۂ اتم موجود نہ تھی۔ لیکن عام علما سے وہ اس معاملے میں بدرجہا ممتاز ہیں۔ اور انہیں کم از کم اس امر کا قوی احساس تھا کہ مسائل کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ جو نظری پہلوؤں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

شاہ عبدالرحیم نے اس پر بہت زور دیا۔ شاہ ولی اللہ ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفائت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند" شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں جو نصیحتیں انفاس العارفین میں نقل کی ہیں۔ وہ سب عملی سوجھ بوجھ کا نمونہ ہیں۔ اور ان میں ایک دو تو اس طرح دنیاداری سے بھری ہوئی ہیں۔ کہ شائد انہیں بعض علما ایک مذہبی عالم اور خدا رسیدہ بزرگ کے شایانِ شان نہ سمجھیں مثلاً "میفرمودند اگر از تو شجاعتے یا سخاوتے یا فتوتے بظہور آید۔ باید کہ ابنائے روزگار از تو آنرا بینند۔ و دانند۔ عیادت، مقصود اعظم ازاں رضامندئ مریض است نہ محض اطلاع بر کیفیت مزاج وے۔ ہمچنیں تعزیت و ہمچنیں سپارش و امثال آں۔ پس کسے کہ ایں جملہ بجا آورد و صاحبِ معاملہ را بر محنت خود مطلع نہ ساخت، محنت خود را ضائع ساختہ"

ان کی نصیحتوں میں کئی پتے کی باتیں ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا:۔

"از خصلت احمقان است کہ بہ چیزے از لباس و عادت نشان مند شوند۔ یا تکیۂ کلام مقرر کنند یا طعامے مقرر کنند کہ ازاں متنفر شوند و مردم بسببِ آں مزاح کنند"۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

"در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن بر سمِ اقویا و عادتِ ایشاں کار کن، اگرچہ ضعیف باشی۔ و اگر عیبے یا جبنی یا بخلے بناگاہ از تو صادر شود

در کتمان و اخفائے آں باید کوشید۔ و ازاں معتجی باید بود و خود را بہ تکلف بصفت مقابل فرا باید نمود تا نفس بداں خلل خو نگیرد"۔

یعنی بقولِ اقبالؔ ؎

گرفتم ایں کہ غریبی و رہ شناس نۂ
زکوئے دوست باندازِ محرمانہ گزر

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ بڑے دیدہ ور صاحبِ نظر بزرگ تھے ان کا قاعدہ تھا۔ کہ امرا کے گھر قطعاً نہ جاتے تھے۔ لیکن اگر امرا میں سے کوئی آپ کی زیارت کے لئے آتا۔ تو اس کا بہت پاس کرتے۔ اور پیار محبت سے اسے نصیحت کرتے۔ بعض مجذوبوں کی طرح بد خلقی سے پیش نہ آتے۔ آپ اپنی معاشرت اور لباس اور وضع قطع میں معتدل مزاج تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ "در ہر امر توسط دوست میداشتند۔ نہ چنداں در تنسک و تعمق فرو رفتہ بودند کہ برہبانیت کشند و نہ چنداں ترک تقید بآداب مترسل بودند۔ کہ بنہادن میل کنند"

شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت

شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کر دیا۔ دو سال میں کلام مجید پڑھ لیا اور ساتویں سال سے نماز اور روزہ کی پابندی شروع کی۔ پھر فارسی کتابیں اور عربی رسالے پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی اور پھر معقولات ختم کر کے منقولات تک جا پہنچے۔ فقہ۔ منطق۔ حدیث۔ کلام کے علاوہ آپ نے اپنے والد سے طب اور معانی اور ہندسہ

وحساب کی کتابیں بھی پڑھیں۔ ۱۵ سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت[1] کیا۔ اس کے دو سال بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسند سنبھالنی پڑی۔ اور قریباً بارہ برس تک آپ نے اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں علوم دینی و عقلی کی تعلیم دی اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کما بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ۔ و در ہر علمے خوض واقع شد"۔ اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ اور آپ عرب تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ فریضۂ حج ادا کیا۔ اور حدیث شریف' جسے ہندوستان میں آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹیؒ سے پڑھا تھا۔ اس کی سند شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے لی۔ شیخ ابوطاہر شاہ صاحب کے بڑے مداح تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ ولی اللہؒ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں۔ اور میں اُن سے معانی کی۔

شاہ صاحب نے شیخ ابوطاہرؒ کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ اسلامی دُنیا کے بہترین اساتذہ میں سے تھے' شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "بالجملہ متصف بود بصفات سلف صالح از ورع و اجتہاد و طاعت و اشتغال بعلم و انصاف در مذاکرہ۔ در ادنیٰ مراجعت تا تامل وافی نکردے و تتبع کتب نہ نمودے' جواب ندادے" اختلافی نظریوں کو تطبیق دینے کا جو اصول شاہ ولی اللہ

---

[1] شاہ صاحب نے القول الجمیل میں اپنے والد کے متعدد مرشدوں کے نام گنائے ہیں اوّل خواجہ خرد "جو شیخ احمد سرہندی اور شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدین کی صحبت میں رہے۔ اور تینوں خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں رہے"۔ ایک اور مرشد سید عظمت اللہ اکبر آبادی تھے۔ طریقۂ چشتیہ میں۔ وغیرہ

نے اختیار کیا۔ ان پر شیخ بھی عامل تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "در اثنائے قراۃ صحیح بخاری سخن در اختلاف روایات احادیث دفقہ افتاد۔ شیخ ابو طاہر گفتند۔ اینہمہ از انست کہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ و آلہ وسلم در نہایت جمیعت است واز فرط جمعیت اضداد را راجح میتواند کرد۔"

انفاس العارفین میں شاہ صاحب نے اپنے والد اور چچا کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان سے یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس خاندان پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔ شاید شاہ صاحب بھی اپنے خاندانی رجحانات سے متاثر ہوئے ہوں۔ اور ان اثرات کی کسی حد تک اصلاح مدینہ منورہ میں ہوئی ہو۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے کے قریب مدینہ میں بطور طالب علم وارد تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ امر قرین قیاس ہے۔ کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے۔ جنہیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے دونوں راہنما جانتے ہوں گے۔ اور ممکن ہے کہ دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔

قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں حضرت امام الہند نے ایک خواب دیکھا۔ جس کے دوران میں خود رسول کریم نے آپ کو اس بشارت سے مفتخر فرمایا۔ کہ (ترجمہ) "تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے۔ کہ اُمت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعے کی جائے۔"

جن دنوں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ ہندوستان میں مرہٹہ گردی کی وجہ سے لوگوں کی بُری حالت تھی۔ اور آپ کو ہندوستان سے اِس امر کا

مشورہ بھی دیا گیا۔ کہ آپ عرب میں ہی اقامت پذیر ہو جائیں۔ لیکن جس ہستی سے خدائے تعالےٰ نے اس ملک میں بے شمار خدمتیں لینی تھیں۔ وہ بھلا اپنے آرام وسہولت کے لئے یہ مشورہ کیوں قبول کرتی۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دینے والوں کو لکھا۔ کہ مجھے ہندوستان واپس آنے سے نہ روکو۔

جب آپ نے واپسی کی تیاری کی۔ تو اپنے شفیق اُستاد شیخ ابوطاہر کے پاس گئے۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

نسیت کل طریق کنت اعرفہ
الا طریقا یؤدینی الی ربعکم

شاہ صاحب نے کسی ایسے حال سے معمور ہو کر یہ شعر پڑھا۔ کہ شیخ پر رقت طاری ہو گئی۔ دیر تک متاثر رہا۔ اور پھر آنکھوں میں آنسو لا کر اپنے ہونہار شاگرد کو الوداع کہا ؛

باقی حالات اوائل ۱۱۴۵ھ میں روانہ ہو کر آپ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو ٹھیک جمعہ کے دن دہلی واپس پہنچے اور اپنے نصب العین کی تکمیل میں سرگرم ہوئے۔ مکہ معظمہ جانے سے پہلے آپ کا اصل کام درس تدریس تھا۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک فن کے لئے ایک ایک قابل شخص کی تربیت کی۔ اور پھر ان فنون کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ خود فقط حدیث پڑھاتے۔ اور باقی وقت معارف گوئی اور تصنیف وتالیف میں بسر ہوتا۔ خدائے تعالےٰ نے آپ کو صحت بھی بہت اچھی عطا کی تھی۔ اور آپ کے اعتدال اور باقاعدگی سے حفظِ صحت میں آسانی ہوتی ہو گی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں

"مریض ہم کم مے شد"۔ اور اپنے کام میں اس انہماک سے مشغول ہوتے۔ "کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے ۔ تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے۔ نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے۔" آپ کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ (شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام) اور اس محنت، حسن تدبیر اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت آپ نے چند سالوں میں ہی اتنا کام کرلیا۔ کہ دوسروں سے اس کا عشر عشیر بھی مکمل نہیں ہوتا! آپ کی وفات ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں بمقام دہلی ہوئی۔ تاریخ وفات یہ ہے ع

اُو بود امامِ اعظمِ دیں

۷۶ ۱۱ ھ

مولینا شبلیؒ "تاریخ علم الکلام" میں لکھتے ہیں: "ابن تیمیہ اور ابنِ رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اسکے لحاظ سے یہ اُمید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں "اگر وجودِ اُو در صدرِ اوّل و در زمانہ ماضی مے بود۔ امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ مے شد"۔ یعنی اگر آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوتے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے ۔ ورنہ

جہاں تک علمی تبحّر۔ دماغی قابلیت۔ مجتہدانہ نظر۔ سلیم الخیالی۔ اور اشاعتِ کتاب وسنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے۔ دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ پیچھے رہے ہوں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر۔ حدیث۔ تصوّف۔ فقہ۔ تاریخ۔ علم الکلام غرضیکہ علومِ اسلامی کی کوئی شاخ نہیں جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو۔ اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی ٭

قرآن آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علومِ قرآنی کی اشاعت ہے۔ اور اس سلسلے میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآنِ مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں عربی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ فارسی دفتری اور تعلیمی زبان تھی۔ لیکن اس زبان میں قرآنِ مجید کا کوئی ترجمہ نہ تھا[1]۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان۔ بوستان۔ سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے۔ لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ تھا۔ ناواقف رہتے۔ پرانے علما اور خواص میں سے قرآنِ مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ۔ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ شاہ صاحب کو اس الجھن کا احساس ہوا۔ اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷-۳۸ء) میں آپ نے

---

[1] شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے۔ لیکن شیخ سعدی سے اسکی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی۔ جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے۔ اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی ٭

کلام مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ جب علما کو اس کا پتہ چلا۔ تو تلواریں کھینچ کر آ گئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصے کے لئے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ اُنہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لئے نہیں آیا۔ کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر "تبرک" رکھا جائے۔ یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں۔ ہم اسے طوطے کی طرح، بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی۔ اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا۔ بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کے لئے سہولت پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا۔ کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دُشواریاں دُور کر دیتے۔ جو عام عُلما کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے اُن کے راستے میں حائل تھیں تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا۔ لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کلامِ مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے کی

لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج جب کہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے۔ اور قوم کے بہترین علما و ادبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے۔ ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ (اور اصل میں ضرورت یہ ہے۔ کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لئے علما اور اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے) لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کے موزوں ترجمے کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے۔ وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولینا نذیر احمد کہتے ہیں۔ "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کیلئے جتنی باتیں درکار تھیں۔ ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولینا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولینا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر ہیں۔ اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں۔ اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ بلکہ اس مسئلے کے علمی

پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا - اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کار آمد ہدائتیں درج کیں -

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں" اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالےٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں - جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی - اور حضرت رسالت پناہ کے احسانات اس کمترین امت پر بہت ہیں جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی - بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں - جن میں الفوز الکبیر[1] فی اصول التفسیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے - اس کتاب کے چار باب ہیں :-

(۱) پہلا باب علومِ پنجگانہ کے بیان میں ہے - جس میں شاہ صاحب قرآن مجید کے مضامین کو یوں ترتیب دیتے ہیں - (ا) علمِ احکام (ب) علمِ مناظرہ یعنی یہود نصاریٰ - مشرکین و منافقین کی خصوصیات شاہ صاحب نے اس سلسلے میں بتایا ہے کہ ان فرقوں کی باتیں آج بھی بعض نام نہاد مسلمانوں میں موجود ہیں اور قرآن کے ارشادات انکے لئے مفید ہیں (ج) علم التذکیر بالاء اللہ (د) علم تذکیر بایام اللہ (ہ) علم تذکیر موت وبعد الموت -

(۲) دوسرا باب وجوہِ خفا نظم قرآن کے بیان میں ہے - جن میں ان پیچیدگیوں اور مسئلوں کا بیان ہے - جو قرآن مجید کے سمجھنے میں پیدا ہوتے ہیں - اس سلسلے میں آپ نے مسئلہ نسخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے -

---

[1] ترجمہ "فوز الکبیر" جو رشید احمد صاحب انصاری نے علیگڑھ کالج کے لئے شائع کیا ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں -

(۳) تیسرا باب نظم قرآنی کے لطائف اور اس کے اسلوب بدیع کی تشریح میں ہے۔ اس باب میں اسالیب قرآنی کی تشریح کی گئی ہے۔ اور ان اعتراضات کے جواب ہیں۔ جو کئی لوگ قرآن مجید کی ترتیب پر کرتے ہیں۔

(۴) چوتھا باب فنونِ تفسیر کے بیان میں ہے۔ اس میں اُن مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے۔ جن کی رُو سے علما کے مختلف گروہ مثلاً محدثین، متکلمین۔ نحومئین۔ ادبا و متصوفین، کلام مجید کی ترجمانی مختلف پہلوؤں سے کرتے ہیں۔

فوزالکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسبابِ نزول کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اوّل میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو۔ یا احکام کی، ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے۔ اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے۔ کہ نزولِ قرآنی سے مقصود اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب۔ اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لئے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں عقائد باطلہ کا وجود، اور آیاتِ احکام کے لئے انمیں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع، اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لئے اُن کا بغیر ذکر الاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اُٹھائی گئی ہے۔

اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے، جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہُوا ہو۔"

اسی نقطۂ نظر سے اُنہوں نے نسخ کے مسئلے پر مجتہدانہ نظر ڈالی ہے اور اگرچہ اُنہوں نے سر سیّد کی طرح اس سے قطعی انکار نہیں کیا۔ کیونکہ ایک تو واقعی رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں بعض احکام منسوخ ہوئے۔ مثلاً پہلے مُسلمان بیت المقدّس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور پھر حرمِ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم ہُوا۔ اس کے علاوہ فقہا اس مسئلے کو بعض پیچیدگیوں کا حل سمجھتے تھے لیکن شاہ صاحب نے مسئلہ نسخ کو اصولاً ماننے کے باوجود اس کی اہمیّت اتنی کم کر دی کہ اب یہ مسئلہ احکامِ قرآنی کو نظر انداز کرنے کا بہانہ نہ رہا۔ شروع میں آیاتِ منسوخ کی تعداد پانچ سو تک بیان کی جاتی تھی۔ پھر علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بیس[۲] مقرر کی۔ شاہ صاحب نے اس رسالے میں ان بیس "آیات منسوخہ" کو بعد کے احکام کے عین مطابق اور غیر منسوخہ ثابت کیا ہے اور فقط چار ایسی آیات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے خیال میں بعد کی آیات سے منسوخ ہوئیں۔

اس رسالے کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ خُدا نے انہیں چشمِ بصیرت دی تھی اور وہ جانتے تھے کہ بعض لوگ جو کفّار یا اہلِ کتاب کے متعلق غلط باتیں پھیلا کر اسلام کی فوقیت ثابت کرتے ہیں۔ اور اس فعل کو اپنے متدیّن ہونے اور جاہل عوام کو خوش کرنے کا سستا طریقہ سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقتاً قوم کے دشمن ہیں۔ اور عدل و انصاف کے

متعلق صریح قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے خود یہ طریقہ کبھی نہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ انہیں دوسری قوموں کے خیالات سے اتنی واقفیت تھی کہ وہ نادانستہ بھی ان سے بے انصافی نہ کرتے۔ چنانچہ عام مسلمان زمانہ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اصول کو ملحوظ رکھا۔ اور ٹھیک ٹھیک باتیں لکھیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ مشرکوں کے اصل طریقے ہیں "یتیموں اور فقیروں کو صدقہ دینا اور مشکلات میں ان کی اعانت کرنا اور صلۂ رحم مشروع تھا۔ اور مشرکین کے یہاں ان امور کے کرنے والے کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔ لیکن مشرکین نے عام طور پر ان امور کو ترک کر دیا تھا اور ان میں یہ خصائل کان لم یکن ہو گئے تھے۔ اور قتل۔ چوری۔ زنا اور ربا اور غصب کی حرمت بھی اصل امت میں ثابت تھی اور ان افعال پر ان کے یہاں کچھ نہ کچھ اظہارِ نفرت بھی جاری تھا لیکن جمہور مشرکین ان کو کرتے اور نفس امارہ کے اشارے پر چلتے تھے۔ اور خدا تعالےٰ کے وجود کا عقیدہ اور اس بات کا کہ وہ آسمان اور زمین کا خالق ہے اور بندوں کو اُن کے اعمال کی جزا دینے والا ہے۔ ان کے نزدیک ثابت تھا۔ چنانچہ ان کے اشعار ان مضامین پر دلالت کرتے ہیں۔ مگر جمہور مشرکین نے ان عقائد میں بہت سے شبہات بہم پہنچائے تھے"

اس کے بعد انھوں نے مشرکین کے "اعمالِ قبیحہ" اور "مظالم علانیہ" اور

---

[1] زمانہ حال میں مصر کے مشہور آزاد خیال عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایامِ جاہلیت کے متعلق یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

"فاسد رسوم" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ اُنھوں نے تصویر کا فقط ایک پہلو پیش نہیں کیا۔ اور مشرکین عرب کا ذکر کرتے ہوئے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتابوں کو بدل ڈالا ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے وہ لکھتے ہیں "یہودی تحریفِ لفظی توارت کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے۔ نہ کہ اصل تورات میں۔ کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے۔ اور ابنِ عباس کا بھی یہی قول ہے"۔

بعض مفسرین نے اہلِ کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علومِ اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کی ہے۔ مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے۔ "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے۔ کہ حضرات انبیاء سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں۔ اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین برداشت کرتے ہیں۔ وہ سب اِلّا ماشاء اللہ علمائے اہلِ کتاب سے منقول ہیں"۔ اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں "اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے۔ جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ قاعدہ یہ ہے۔ کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب"۔ مفسرین کے بعض قصے جنہیں عوام آج اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں۔ شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے۔" اور محمد بن اسحٰق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے۔ (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے

اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لئے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھونا ہے۔"

مفسرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی۔ جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا۔ کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیئے اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدرِ درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں۔) وہ لکھتے ہیں:
"قرآنِ عظیم اس طرح پڑھاویں۔ کہ صرف (قرآن اور) ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شانِ نزول یا قاعدہ نحو مشکل ہو وہاں ٹھیر جائیں اور بحث کریں۔ بعد اس کے تفسیر جلالین بقدرِ درس پڑھادیں"۔ (ترجمہ)

حدیث

مُلا نظام الدین اور ان کے معاصرین کے حالات سے ظاہر ہے۔ کہ اس زمانے میں اسلامی مدارس جن باتوں پر زور دیتے تھے وہ صرف و نحو۔ یا منطق اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اس میں کچھ تو لکھنؤ اور وہاں کے علما کے مذاق کو دخل تھا۔ اور کچھ یہ وجہ بھی تھی۔ کہ حکومتِ اسلامی کا زمانہ تھا۔ شرع حکومت کا قانون تھی۔ جس طرح آج کل جج یا منصف یا مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں قاضی اور مفتی اور محتسب ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے فیصلوں کے لئے فقہ کی واقفیت درکار تھی۔ منطق بھی فقہی فیصلوں میں مفید تھی۔ اور صرف و نحو عربی جاننے کے لئے ضروری تھی۔ چنانچہ جب تک حکومتِ اسلامی کا اقتدار رہا۔ انہی علوم نے فروغ پایا۔ شیخ عبد الحق نے

حدیث کی اشاعت شروع کی۔ لیکن فقہ و منطق کے فروغ نے حدیث کو چمکنے نہ دیا۔ ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن شاہجہاں اور عالمگیر کی علم پروری انہیں قضا اور افتا کی مسندوں پر لے گئی۔ وہ درس حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے۔ اور ملک میں بہت سے علما ایسے نہ پیدا ہوئے۔ جو طالبین کو درس حدیث دے سکیں۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہؒ صاحب نے کی۔ ایک تو اورنگ زیب کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہوگئی۔ دوسرے شیخ عبدالحق محدث کی طرح شاہ ولی اللہ فنا فی العلم تھے "قاضی القضاۃ" اور "شیخ الاسلام" بننے کی خواہش اُن کے دل میں نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی کوشش اُس علم کی توسیع کے لئے وقف رکھی۔ جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی۔ لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لئے ضروری تھا۔ علم الحدیث پر اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علما کی تربیت کر گئے جنھوں نے درس حدیث کا سلسلہ اُنکے بعد جاری رکھا۔ اور یہ فیض ملک میں عام ہوگیا۔

حدیث میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ امام مالک کے مرتب کردہ اور سب سے قدیمی مجموعۂ حدیث 'موطا' کے وہ بڑے مداح تھے۔ چنانچہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔ "جب عربی زبان کی قدرت ہو جائے موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھا دیں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں۔ کہ علم حدیث کی اصل ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں۔" علم حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد

سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ موطّا کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مولٰینا عبید اللہ سندھی کا یہ بیان بڑا پُرمعنی ہے۔ کہ موطّا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔ جن کا سمجھنا کالجوں کے طلباء کے لئے مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے موطّا کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔ عربی میں المسوّیٰ اور فارسی میں المصفّیٰ نام رکھا۔ اور ان میں احادیث کو فقہی ابواب کے مطابق ترتیب دیا۔

یہ کتابیں تو علماء کیلئے تھیں لیکن شاہ صاحب نے عوام کے لئے بھی مختصر احادیث کی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب چہل حدیث ہے۔ النّوادر من الحدیث میں عجیب اور غیر معمولی حدیثیں جمع کی ہیں۔ الدُّر الثمین فی مبشّرات النّبی کریم میں ایسی چالیس حدیثیں جمع کی ہیں۔ جو خواب میں انہیں بتائی گئیں۔ شرح تراجم ابواب بخاری میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخیوں کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔ اسکے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے بھی علم حدیث سے آپ کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

اصولِ فقہ

شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یا فقہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملتے لیکن وہ تمام علوم اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انہوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیئے۔ لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے اُنہوں نے بڑی کوشش کی۔ اور ایسی کتابیں لکھیں۔ جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فتاوائے عالمگیری سے اوپر فقہ اور شریعت کے

اصلی سرچشمے پر پہنچا دیتی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لئے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کر لے۔ جن کے ماتحت شرع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم الحدیث کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین، کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ، منصفانہ اور پُر از معلومات، تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولینا محمد احسن نانوتوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قدرت استخراج کا معجزہ سمجھنا چاہیئے۔ عام طور پر مسلمان علما کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں۔ وہ جس کتاب کا درس دیں۔ اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے۔ لیکن علم حدیث کی تاریخ سے

لہ شاہ صاحب کی کتابوں کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ پھر ترجمے کو ابواب میں تقسیم کرنا اور سرخیاں دینا ضروری ہے۔ ہر کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ مضامین کتاب کے متعلق ہونا چاہیئے۔ جب جدید طریقوں کے مطابق شاہ صاحب کی کتابیں نئی نسل کے سامنے آئینگی تو وہ دیکھیں گے کہ شاہ صاحب کس پائے کے بزرگ تھے۔ جبتک ان کتابوں کے اچھے ترجمے نہیں ہوتے۔ ایک صفحے پر دو کالموں میں اصل عربی اور اردو ترجمہ ساتھ ساتھ درج کرنے کا طریقہ جو مطبع مجتبائی نے ملحوظ رکھا ہے۔ احسن ہے۔ اور انصاف کا ترجمہ اس طرز میں بہترین ہے۔

انہیں کامل واقفیت نہ ہوگی۔ اور عہدِ نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار جمع احادیث کے طریقے۔ احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات، ان باتوں کے متعلق انہیں مسلسل۔ صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہا ہیں۔ جو فتوے تو دے لیں گے۔ اور جو مسائل انہیں پیش کئے جائیں ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشہور مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے۔ لیکن علمِ فقہ کی تدوین، عہد بعہد کی ترقیاں اور تبدیلیاں، مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔ ان سے انہیں پوری واقفیت نہ ہوگی۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہؒ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اُردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے۔ جن پر علما میں اختلافات ہُوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری۔ مسلم ابوداؤد۔ ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہوگیا۔ ہم اِس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے۔ کہ ہر شخص جسے علومِ اسلامی کی تاریخ سے

ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حرزِ جاں بنائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق متاخرین نے جو غلو کیا ہے۔ اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں :۔

"پھر اُن لوگوں کے بعد بہت سے قرن نرے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جُدا کرتے، نہ جدل کو استنباط سے۔ تو فقیہ اس وقت وُہی تھا جو بہت بکے۔ مُنہ پھٹ ہو کہ فقہا کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدوں تمیز کے یاد کرے اور ان کو باچھیں چیر چیر کر بیان کرے۔ اور محدث وہ تھا۔ جو صحیح اور سقیم حدیثوں کو شمار کرے۔ اور اپنی کلّہ زوری سے ان کو کہانیوں کی طرح بکتا چلا جائے ...... اور اس کے بعد جو قرن ہُوا وہ فِتنے اور تقلید میں اور بھی بڑھ گیا۔ اور لوگوں کے دلوں سے دیانتداری جاتی رہی۔ یہاں تک کہ دین کے معاملے میں غور نہ کرنے پر مطمئن ہو گئے۔ اور یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا۔ اور ہم ان ہی کے قدم کے نشانوں پر ان کی پیروی کرتے ہیں!"

اجتہاد و تقلید

اس کتاب کے علاوہ آپ نے تقلید اور اجتہاد کے مسئلے پر ایک بڑی مفید کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جن میں اجتہاد کی قسموں۔ اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل پر بحث کی ہے۔ کہ ایک عامی، فقہا کے اختلاف کی صُورت میں کیا کرے۔ اور آیا ایک عامی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے؟

اُنہوں نے جماعت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مجتہدین اور عامی۔ مجتہد تین قسم کے ہوتے ہیں۔ (ا) مجتہد مطلق یعنی مجتہد مستقل و مجتہد منتسب۔ (ب) مجتہد فی المذہب اور (ج) مجتہد فی الفتویٰ۔ اجتہاد کی تعریف اُنہوں نے یہ کی ہے "خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس[1] پر"

معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہ صاحب بابِ اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے۔ وہ عوام کو حقِ اجتہاد قطعاً نہیں دیتے۔ مجتہدوں کے بھی اُنہوں نے مدارج مقرر کئے۔ اجتہاد کے لئے بڑی کڑی شرطیں عائد کیں۔ اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دیں۔ لیکن وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ اُنہوں نے اس خیال کی جابجا تردید کی ہے۔ وہ آغازِ کتاب ہی میں فرماتے ہیں:۔

"پھر اب جو گمان کیا جاوے، ایسے شخص عالم کے حق میں، جو اکثر مسائل میں اپنے امام کے موافق ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو اور اس دلیل پر اس کا دِل مطمئن ہو اور اپنے کام کو سمجھ بُوجھ کر کرتا ہو۔ کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمانِ فاسد ہے اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان اوّل پر تو یہ گمان بنا بر فاسد بر فاسد ہے۔"

---

[1] عقد الجید کا ترجمہ مولینا احسن نانوتوی نے کیا ہے۔ ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ارشاداتِ نبوی کی ایک نہایت اہم خصوصیت کیطرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے۔"اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتووں کو خوب جستجو کریگا۔ تو اسکو ایک کلیہ قاعدہ مل جائیگا کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کی سب اقسام کو طرح طرح سے ضبط فرمایا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں میں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی"۔ چنانچہ کئی مثالیں دیکر جنمیں رسولِ اکرمؐ نے کڑی شرطیں نہیں لگائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔"تو ان امور کی وجہ یہ تھی۔ کہ آپ نے ایسی باتیں انہی لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتووں کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا کہ آپ نے کی باتیں چھوڑنے اور اقسامِ ضبط کو زیادہ بیان نہ کرنے میں ایک بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے"۔ چنانچہ شاہ صاحب رسولِ اکرمؐ کے طریقے کو دھیان میں رکھ کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ اختلافات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہئے اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصود فوت نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔"تو جو کوئی اس مسئلے کی ماہیت جوں کی توں جان لے گا۔ اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اوّل یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امرِ حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے دوم یہ کہ دین کے معاملے میں وسعت ہے۔ تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالفت کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں"۔

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدمِ تقلید کا ہے۔ یعنی آیا ایک مسلمان کو فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے یا وہ

مختلف مذاہب (شافعی۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی) کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پر علما میں بڑا اختلاف ہے۔ حنفی علما تو تقلید اور لزوم مذہب معیّنہ کے قائل ہیں۔ اہلِ حدیث جماعت اس کی قائل نہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ چونکہ اُنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی باریکی سے کیا ہے۔ اس لئے یہ رائے بہت واضح اور یک طرفہ نہیں رہی۔ لیکن انکی تصانیف کے مطالعہ سے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ وہ ایک عامی کے لئے لزوم مذہب معیّنہ کے قائل ہیں۔ لیکن علما مجتہدین کے لئے وہ ایسی پابندی نہیں سمجھتے تھے چنانچہ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۷۲ پر لکھتے ہیں۔ "اور علما کو درست ہے۔ کہ ہمارے ائمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحتِ وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔" اسی طرح اُنہوں نے کتاب کے اخیر میں لکھا ہے:۔

"یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے، جس کو اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے۔ جو اسکے نفس پر سہل تر ہو۔ تو ہم کو معلوم نہیں۔ کہ شرع نے اس عمل پر اُسکی بُرائی کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا۔ کہ جو باتیں آپ کی اُمت پر سہولت کی ہوں انہی کو دوست رکھتے تھے۔"

اس کے علاوہ حیاتِ ولی میں مولینا رحیم بخش لکھتے ہیں۔ "آپ کو مذہبی تفریق کے خانہ برانداز جھگڑوں سے چنداں بحث نہ تھی۔ نہ ان مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے پابند تھے۔ کہ خواہ مخواہ اُسی کے مطابق عملدرآمد کریں۔" چنانچہ اس مسئلے کے متعلق خواجہ محمد امین کے سوال کے جواب میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ اس سے آپ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ "سوال دوم آنکہ

عمل تو در مسائل فقیہہ بر کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع مے کنم در مذاہب مشہورہ مثلاً صوم و صلوٰۃ و وضو و غسل و حج بوضعے واقعہ مے شود۔ کہ ہمہ اہلِ مذاہب صحیح دانند۔ و عند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمائیم"۔

شاہ ولی اللہ عامی کو مجتہدین کا مقلّد رکھنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو جس مُلک میں شرع رائج ہے اس کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے۔ جو تمام مہذّب ممالک پُوری طرح کرواتے ہیں لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔ اُنہوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے۔ اور تقلید کی ایک قسم لکھی ہے جسے قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یعنی تقلید کی وہ صورت جس میں دانستہ یا غیر دانستہ، مقلّد صریح احادیث پر بھی مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"اور تقلید حرام کی یہ صُورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے۔ تو ایسے مقلّد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صریح پہنچتی ہے۔ کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو۔ تو اسکے قول کو نہیں چھوڑتا"

تصوّف

تصوّف کا مسئلہ بڑا اٹیڑھا ہے۔ ایک تو اسے بعض ریاکاروں نے دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ لیکن اگر انہیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ کہ ریاکار لوگ کسی مشرب میں نہیں ہوتے۔ تب بھی اسلام کی تاریخ میں ایسے مخلص، مگر وارستہ مزاج کثرت سے ملیں گے۔ جنہیں تصوّف نے رہبانیت، شرع سے آزادی اور پریشاں روی کا راستہ دکھایا۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے۔ کہ

جس کثرت سے شرع کی قیدیں بڑھیں۔ اور اصولی باتوں کو چھوڑ کر، فقیہوں اور محتسبوں نے روزمرہ کی معمولی اور بے ضرر باتوں میں بھی لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنی کتابوں کے مطابق جکڑ بند کرنا چاہا۔ اسی قدر اہلِ تصوّف کی وارفتگی بڑھ گئی۔

یہی وجہ تھی۔ کہ بعض مذہبی حلقوں میں تصوّف کی مروجہ صورتیں شروع سے ہی مشتبہ تھیں۔ آج کچھ وہابی اثرات، کچھ اقبال کی مخالفت اور بڑی حد تک، مغربی مادیت کی فتح سے تصوف اور بھی بدنام ہو گیا ہے۔ اور مذہبی اعتراضات سے قطع نظر اسے بعض سہل انگار، قومی زوال کا اصل سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ تصوف، بالخصوص عجمی تصوف نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا۔ جب دُنیوی نقطۂ نظر سے قوم رُو بہ زوال تھی۔ لیکن غالباً ان زمانوں میں تصوّف کی مقبولیت، قومی زوال اور دنیوی پریشاں حالی کا نتیجہ تھی، سبب نہ تھی۔ اور ان دونو کا باعث قوم اور افراد کی عسکری، اخلاقی اور علمی کمزوریاں تھیں۔

لیکن اگر تصوف میں کئی کوتاہیاں ہوں۔ تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اسے جڑ سے اکھیڑ دینا آسان نہیں۔ ہمارا ادب۔ فلسفہ۔ مذہب، تصوّف کی گود میں پلا ہے۔ اور اگر ہم تصوّف کا قلع قمع کریں۔ تو بہت سی دوسری قیمتی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ اور اس کے علاوہ تصوّف کی اسلامی صورت یعنی احسان یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے۔ اور رہے گی۔ شاید بعض نوجوان خیال کرتے ہوں۔ کہ غلام قادر روہیلہ کی خودی اور میر جعفر کی خودغرضی سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر ان بزرگوں پر تصوّف اور مناسب نفیِ خودی (ایثار) کے چند چھینٹے پڑ جاتے۔ تو غالباً ان کا عمل دوسرا ہوتا۔

تصوّف کی ضرورت صرف خود پرستوں کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کیلئے نہیں۔ بلکہ جو لوگ قومی راہ میں انتہائی قربانی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی یہ عمل مفید پڑتا ہے۔ کہ وہ سیدھی سادھی صُوفیانہ ریاضتوں اور ذکر و شغل کی مدد سے جن کا شرع سے کوئی تضاد نہیں۔ بلکہ جو شرعی فرائض کی تکمیل کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اپنی رُوحانی اصلاح کرے۔ اور شخصی ہوا و ہوس، حسد، غصّہ، خواہشِ انتقام، اور ان علائق دنیوی کو جو ذاتی قربانیوں کی راہ میں حارج ہوتے ہیں، مٹا دے اور اس طرح فرشتہ منش انسان بن کر اپنے تئیں بنی نوع آدم کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہؒ ان رُوحانی ضرورتوں کی اہمیت سمجھتے ہونگے اس کے علاوہ اُنہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہاں تصوّف سے لگاؤ ہو جانا لازمی تھا۔ ان کے والد اور چچا اہلِ طریقت تھے۔ اور معاصرانہ تذکروں (مثلاً روضۃ القیومیہ) میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہُوا ہے، عُلما کے ضمن میں نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی تصوّف سے گہری دلچسپی ہوگی۔ اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمدؒ بن عبدالوہابؒ کی تحریک میں ایک وجہِ امتیاز یہ تھی۔ کہ اگرچہ یہ دونو بزرگ عہدِ نبوی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ اور شاہ صاحب بھی تصوّف کی اصلاح کے خواہاں ہیں لیکن وہابی مصلحین کی طرح وہ اس کے مخالف نہیں۔

شاہ صاحب نے علمِ تصوّف میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لمعات ہے جس کا اُردو ترجمہ نفحات کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ ایک رسالہ فیصلۂ وحدت الوجود والشہود لکھا ہے۔

لہ اس موضوع پر مولوی غلام یحییٰ نے کلمات الحق لکھی جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحب نے

(باقی صفحہ آیندہ پر)

جس میں شیخ اکبر کے "نظریہ وحدت الوجود" کی تاویل کر کے اسے شیخ مجددؒ کے "نظریہ وحدت الشہود" کے مطابق ثابت کیا ہے۔ القول الجمیل میں بیعت کے طریقے اور فائدے اور صاحبِ بیعت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ تفہیماتِ الٰہیہ جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ فارسی میں بیشتر تصوّف کے مسائل سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ الطاف القدس۔ خیرِ کثیر وغیرہ میں علمِ تصوّف کا بیان ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوّف کے بہت سے مسائل ضمناً آ گئے ہیں۔

شاہ صاحب کو تصوّف سے بڑی دلچسپی تھی۔ لیکن انہیں متصوفین کی قابلِ اعتراض باتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی تیسری وصیت ہے۔ "وصیّت دیگر آنست کہ دست در دست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند۔ ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد۔ و بغلو عام مغرور نباید بود۔ و نہ بکرامات۔ زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشانِ ایں زمانہ ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنگیات را کرامات دانستہ اند..."

اس کے علاوہ شاہ صاحب نہ صرف مشائخ کے نقائص پر معترض تھے بلکہ انتہائی نفیٔ خودی کے مخالف تھے۔ اور اقبال کی طرح اسے ملّتِ اسلامیہ کیلئے سخت مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر فریقین کے خیالات تفصیل سے لکھ کر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ)

دمغ الباطل میں مولوی صاحب نے شاہ ولی اللہ سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن انکے مُرشد مرزا مظہر جانجاناں نے ان کے رسالے کی تعریف کر کے لکھا (ترجمہ) "لیکن مسئلہ تطبیق سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ توفیق بین المکشوفین اگرچہ تکلّف سے خالی نہیں لیکن اس میں ایک عُمدہ مصلحت پائی جاتی ہے

آپ فرماتے ہیں "بالجملہ افراط در مقدمات انسلاخ استہلاک و مشغول شدن ہر کس و ناکس بآں داءِ عضال (مرضِ شدید) در ملّتِ مصطفویہ۔ خدا رحمت کناد کسے را کہ سعی خمال آں نہا کند"

حُجۃ اللّٰہ البالغہ شاہ صاحب کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب حجۃ اللّٰہ البالغہ ہے۔ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"ایں کتاب اگرچہ در علمِ حدیث نیست امّا شرح احادیثِ بسیار دراں کردہ و حکم اسرار آں بیان نمودہ۔ تا آنکہ درفن خود مسبوق علیہ واقع شدہ و مثل آن دریں دوازدہ صد سال ہجری ہیچ یکے از علماءِ عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ۔"

مولٰینا شبلی اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"حجۃ اللّٰہ البالغہ، جس میں انہوں (شاہ صاحب) نے شریعت کے حقائق واسرار بیان کئے ہیں۔ درحقیقت علمِ کلام کی رُوح و رواں ہے۔ علمِ کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے۔ کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکّب ہے۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جسقدر تصنیفات لکھی جاچکی تھیں صرف پہلے حصّے کے متعلق تھیں۔ دُوسرے حصّے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔"

یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ چھ سو بیس صفحوں پر محیط ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک "بزرگ بھائی اور گرامی دوست مولٰینا محمد عاشق" کے ایما پر لکھی۔ کتاب کے شروع میں شاہ صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کی غرض و غائت واضح کی ہے۔ آپ نے یہ کتاب اسرارِ علمِ دین کے متعلق لکھی۔ مقدمے میں بتایا ہے۔ کہ محدثین کے مختلف طبقے اور علمِ حدیث کے مختلف پہلو کونسے ہیں۔ بعض علما ایسے ہیں۔ جو احادیث کی

صحت، ضعف، شہرت اور غرابت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے علما کی توجہ غریب احادیث کے معانی اور مشکل احادیث کی شرح پر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ فقہا محدثین کا ہوا ہے۔ جو احادیث کے شرعی معنی بیان کرتے ہیں۔ اور ان سے فقہی احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح علوم حدیث کی اور کئی قسمیں ہیں لیکن شاہ صاحب کے نزدیک "علوم حدیث میں سب سے زیادہ دقیق فن جس کی جڑ نہایت عمیق ہے۔ اور جس کا معیار نہایت بلند ہے" اور جو ان کی "نظر میں تمام علوم شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے۔ وہ اسرار دین کا علم ہے۔ جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور لم اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کئے ہیں۔" حجۃ اللہ البالغہ علم اسرار دین کی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ مذہب اسلام کے جو عقائد یا احکام ہیں۔ ان میں کیا کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب خود اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"بعض لوگ خیال کیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی اور اعمال اور اُن کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت سے تکلیف کرنا بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا حکم دے جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پاوے اور سرکشی کرے تو سزا دی جاوے۔

"یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کے اجماع، جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے۔ اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔ جو شخص امر ذیل کو نہ سمجھ سکے۔ اس کی واقفیت اس سخن کی نہی سے کیا زیادہ ہو سکتی ہے

جس کو دریا میں غوطہ دیا ہو۔ کہ اعمال کا اثر نیتوں پر اور اس کی ان نفسیاتی حالتوں پر موقوف ہے جن سے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ رسولِ خدا نے فرمایا اِنَّمَا الاعمال بالنّیات۔ اعمال کا ثواب نیتوں پر موقوف ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ (ترجمہ) نہ قربانیوں کے گوشت اور نہ خون تمہیں خُدا سے نزدیک کرتے ہیں لیکن تمہاری پرہیزگاری تمہیں اس سے نزدیک کر دیتی ہے۔

"اور نماز خدا کی یاد اور اس کے حضور میں عاجزی کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اقمِ الصّلوٰۃ لذکری (میری یاد کرنے کو نماز پڑھ) اور نماز سے یہ بھی مقصود ہے کہ اس کی طفیل سے آخرت میں دیدارِ خدا نصیب ہو جاوے۔

"اور زکوٰۃ کا حکم شریعت میں اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے بخل کی کمینہ عادت جاتی رہے اور حاجت مندوں کی کاربرآری ہوتی رہے۔ جیسا کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کے حق میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے (ترجمہ) وہ لوگ جو ان نعمتوں میں بُخل کرتے ہیں جو خدا نے اپنے فضل سے ان کو دی ہیں یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے بلکہ بُرا ہے۔ قیامت کے روز یہ چیزیں جس کا انہوں نے بُخل کیا ان کے گلے کا طوق ہوں گی۔ اور جیسا فرمایا رسُولِ خدا نے معاذ بن جبل رضی اللہ سے (ترجمہ) خدا نے ان لوگوں پر صدقہ دینا فرض کیا ہے۔ مالداروں سے لیا جاوے اور غریبوں کو دیا جاوے۔ اور روزہ نفس کو مطیع کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اس لئے کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ اور فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فان الصّوم لہ وجاء کہ روزہ نفس کی خواہش کو روک دیتا ہے۔

"اور حج اس لئے شروع ہُوا ہے کہ اس سے خدا کی نشانیوں کی عظمت ظاہر کی جائے۔

خدا تعالےٰ فرماتا ہے (ترجمہ) بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ گھر ہے جو مکّہ میں ہے۔ اور فرمایا (ترجمہ) صفا اور مروہ خدا کے نشانوں سے ہیں"۔

شاہ صاحب نے کتاب کے دو حصّے کئے ہیں۔ پہلا حصّہ جو اُردو ترجمے میں مقدمہ کے بعد ۲۴۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ان عام اصولوں اور کلّیہ قاعدوں کے متعلق ہے۔ جن پر شریعتوں اور مذہبوں کی مصلحتوں کا مدار ہے۔ پہلے ۱۷ ابواب میں مذہب کی ضرورت۔ عادتِ الہیّہ۔ عالم الامثال۔ حقیقتِ رُوح۔ جزا و سزا۔ دُنیا میں اعمال کی سزا۔ موت کی حقیقت۔ معاشرتی زندگی کی ضرورت۔ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر پُر مغز تبصرہ ہے۔ بہتّرویں باب میں ان اسباب کا بیان ہے جن کی وجہ سے مذہب اسلام، یہوُدیت اور نصرانیت سے مختلف ہو گیا۔ اس کے بعد زمانۂ جاہلیت کا ذکر کر کے نو ابواب میں ان ذرائع کا ذکر کیا ہے۔ جن سے امتِ محمدیہ نے شریعت کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا۔

دُوسرے حصّے میں پہلے حصّے کے قاعدوں اور اصولوں کی کسوٹی پر مذہب اسلام کے مختلف فروعی احکام کو پرکھا ہے۔ ایک تو احادیث کے مطابق ان احکام کی توضیح کی ہے۔ دوسرے ان احکام کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ اس حصّے میں ان اسرار کی تفصیل ہے۔ جو مندرجہ ذیل ابواب سے تعلق رکھتے ہیں (۱) ابوابِ ایمان۔ (۲) ابوابِ طہارت (۳) ابوابِ نماز (۴) ابوابِ زکوٰۃ (۵) ابوابِ روزہ۔ (۶) ابوابِ حج (۷) ابوابِ احسان (۸) ابوابِ معاملات (۹) ابوابِ تربیتِ منزل (۱۰) ابوابِ سیاستِ مدن (۱۱) ابوابِ معیشت (۱۲) چند ابوابِ مختلف۔

شارع نے شریعتِ اسلام کو مرتب کرتے وقت جن مقاصد کو پیشِ نظر رکھا وہ شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"جس مصلحت پہ شارع نے مستند کیا ہے۔ اور جس خرابی سے باز رکھا ہے اسکی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پہ ہوتی ہے:۔

(۱) ان چار اوصاف میں سے جو معاد میں مفید ہیں یا ان تمام خصلتوں میں سے جو دنیا میں سود مند ہیں کوئی نہ کوئی وصف نفس میں پیدا کرنا اور ان کو شائستہ اور مہذب بنانا ہے (۲) کلمۂ الٰہی اور سچے مذہب کو غالب کرنا۔ شرائع کو خوب مستحکم کرنا، ان کی اشاعت میں کوشش کرنا ہوتا ہے (۳) عامہ خلائق کی حالت کو منتظم کرنا۔ ان کے امور نافع اور تدابیر مفیدہ کی درستی کرنا اور ان کی رسموں کو مہذب صورت میں لانا"۔

حجۃ اللہ البالغہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ شاہ صاحب کا نقطۂ نظر عقل اور سمجھ سے کس قدر قریب تھا۔ ان کی ساری کتاب کی غرض وغایت ہی اس خیال کی تائید تھی۔ کہ جو لوگ ڈرا دھمکا کر احکامِ شرعی کی تعمیل کراتے ہیں۔ وہ دین کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے اسلام کے تمام احکام کسی نہ کسی دنیوی یا روحانی مصلحت پر مبنی ہیں۔ چونکہ ان مصلحتوں کی توضیح ہی اسلام کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بہترین دلیل و حجت ہے۔ اسلئے اس کتاب کا نام انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ رکھا۔

شاہ صاحب کی کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ہم ضمناً ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ عام طور پر مذہبی حلقوں میں کہا جاتا ہے۔ کہ زمانہ روز بروز

خراب آرہا ہے۔ اور ماضی کی نسبت حال اور مستقبل دونوں زمانے بُرے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر جس نے قوم میں ایک بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر رکھی ہے۔ فی الحقیقت مواعید قرآنی اور ارشادات نبوی کے صریحاً خلاف ہے۔ اور اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں۔ جو ماضی کی ہر ایک بات کو خوش اعتقادی کی عینک سے اور حال کی ہر ایک چیز کو شک اور وہم اور خوف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازمنۂ ماضیہ کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اور سنت الٰہیہ پر بھی ان کی پوری نظر تھی۔ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے اخیر میں عہد سعادت کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے عام نقطۂ نظر کی پوری طرح تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رسول اکرمؐ کی چند اہم احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے (ترجمہ) کہ میری اُمت کی صفت بارش کی سی ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ پہلا مینہ اچھا ہے یا اخیر۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (ترجمہ) "تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے"۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہُوا کرتی ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "اور یہ بھی ممکن نہیں کہ عمدہ اور بزرگ زمانے کے ہر شخص کو دوسرے مفضول زمانے پر فوقیت اور فضیلت ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو قرون بالاتفاق عمدہ اور بزرگ تھے ان میں بعض لوگ فاسق اور منافق بھی تھے۔ انہی زمانوں میں حجاج۔ یزید بن معاویہ مختار ہیں"۔

دیگر تصانیف

شاہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنّف تھے۔ جن کتابوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں

ملتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب الجزء اللطیف آپ کی نہایت مختصر سوانح عمری ہے۔ جس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جنرل بابت ۱۹۱۲ء میں شائع ہوچکا ہے کہا جاتا ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات میں ایک رسالہ لکھا ہے انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ جو اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ تصوف کے متعلق ہے۔ اسی طرح ایک کتاب قصص الانبیا جس کا اردو ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ آپ کے ایک سوانح نگار نے آپ کی سینتیس ۳۷ تصنیفات کے نام لکھے ہیں۔ جن میں اکثر شائع ہو چکی ہیں اگرچہ بہت سی اب کمیاب ہیں۔ آپکی ایک نہایت دلچسپ کتاب المقدمۃ السنیہ ہے۔ جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک کمیاب فارسی رسالے کا ترجمہ کیا ہے۔ اُن کی سوانح عمری لکھی ہے اور اُنہوں نے شریعت اور تصوف کی تطبیق کی جو کوشش کی تھی اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری دور کے عقائد کا ذکر کرکے اس زمانے کے الحاد پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے وہ اس زمانے کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ کہ اس زمانے میں علما و صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اصلاحِ معاشرت

اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ہم نے شاہ صاحب کی تصانیف کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے لیکن وہ اس زمانے کے باقی علما کی طرح فقط کتابیں پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ قوم کی معاشرتی بیماریوں پر بھی آپ کی نظر تھی اور اپنی تصنیفات میں انہوں نے ان خرابیوں کو جا بجا بے نقاب کیا۔ اس موضوع پر ان کا بہترین اظہارِ خیال

تفہیمات الٰہیہ کے ایک باب میں ہے ۔ جو سارے کا سارا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
لیکن آپ کے مختصر وصیت نامے سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی اصلاح کا جو درخت
مولٰینا سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ہاتھوں پھلا پھُولا۔ اس کا بیج آپ ہی نے
بویا تھا۔ وصیت نامے میں آپ نے ہدائت کی ہے "بقدرِ امکان عادات و رُسومِ عرب
اوّل کہ منشاء آنحضرت است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندہیم ۔ و رُسومِ عجم و عاداتِ ہنود
را از درمیانِ خود نگذاریم"۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے ان احکام کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے
عربوں کو عجمی عیش و عشرت سے بچانے کے لئے نافذ کئے تھے "یعنی چوں عرب برائے
جہاد باطراف عجم مُنتشر شدند حضرت عمر رضی اللہ عنہ ترسیدند کہ رسمِ عجم را اختیار کنند و
رسمِ عرب را ترک نمایند۔ پس بدیشاں نامہ نوشتند۔ کہ ازار بندید و چادر پوشید و
نعل پوشید و بگذارید موزہا و بگذارید شلوارہا و لازم گیرید لباس پدرِ خود اسمٰعیل را و
خود را دُور دارید از تنعم و ہیئت عجم و لازم گیرید نشستن در آفتاب ۔ ہر آئینہ آفتاب
حمامِ عرب است و برسم قوم معد باشید و درشت لباس باشید و سخت گزران باشید
و کُہنہ پوشی خو کنید"

اس کے بعد ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں
میں آگئی ہیں۔ اور جن کی اصلاح کی کوشش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے ۔ سب سے
پہلے نکاح بیوگان کا ذکر کیا ہے :۔

(۱) یکے از عاداتِ شنیعۂ ہنود آنست کہ چون شوہرِ زنے بمیرد۔ نگذارند کہ آں
زن شوہرِ دیگر کند ۔ و این عادت اصلاً در عرب نبود" اس کی مذمت کی ہے اور کہا ہے
"خدائے تعالےٰ رحمت کناد بر آں کس کہ این عادتِ شنیعہ را متلاشی (ابرطرف) سازد۔

(۲) دُوسری بُری رسم بڑے بڑے مہر باندھنا ہے۔ جو سُنت نبوی کے خلاف اور کئی معاشرتی خرابیوں اور خانہ بربادیوں کا سبب ہے (۳) تیسری عادتِ شنیعہ، خوشی کے موقعے پر اسراف کی ہے۔ جس کی وجہ سے قوم غریب ہو رہی ہے۔ (دیگر از عادات شنیعۂ ما مردم اسراف است در ماتمہا و رسوم و چہلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و ایں ہمہ را در عرب اول وجُود نبود)

یہی چار بڑی خرابیاں ہیں۔ جن کی اصلاح کے لئے مولٰنا سید احمد بریلوی اور مولٰنا اسمٰعیل شہید کو کوشش کرنی پڑی۔ اور جن کی اصلاح آج بھی مختلف صُورتوں میں قوم کے لئے ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ کی سمجھ اور قابلیت قابلِ داد ہے کہ اُنہوں نے سات صفحے کے ایک مختصر سے وصیت نامے میں اپنے تجربے کا نچوڑ دے دیا۔ قوم کے فائدے کی تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا۔ اور ان ضروری معاشرتی اصلاحوں پر نظر کر کے، جن کی طرف نہ قاضی کی نظر جاتی تھی نہ فقیہہ کی۔ وہ بیج بو دیا جسے شاہ عبد العزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید کے زمانے میں پھُولنا پھلنا تھا۔

اشعار اور مکاتیب

شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مختلف پہلوؤں پر ہم نے تبصرہ کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے۔ اور فارسی غزلوں اور رُباعیوں میں ایک معقول ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ امین تخلص کیا کرتے تھے۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رُباعیوں میں تصوّف اور معرفت کے مضامین ادا ہوئے ہیں۔ لیکن اشعار میں رسمی عاشقانہ خیالات بھی ہیں۔ ہم آپ کے کلام میں سے دو فارسی رباعیات اور ایک فارسی غزل کے چند اشعار کا انتخاب تبرکاً درج کرتے ہیں ؎

رُباعیات

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃِ نبی است — واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است
جائے کہ بود جلوہ حق حاکمِ وقت — تابع شُدنِ حُکم خرد بوالہبی است

قومے بکتابت احرف موصُوف — جمعے بتلاوتِ اسما معروف
شخصے کہ ازیں قوم قدم پیش نہاد — گشت است بایں صُورتِ ذہنی مشغوف

ابیات

تا بکے محنتِ مہجوری و دُوری بکشم — نازنینِ وطنم سُوئے وطن باز روم
تا بکے ہمدمِ سنگ بود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سُوئے عدن باز روم
تا بکے بستۂ زنجیرِ تعلق باشم — آہوئے از ختنم سُوئے ختن باز روم
بوئے جاں میرسد از بادِ یمن در دو جہاں — شاہِ ملکِ یمنم سُوئے یمن باز روم

شاہ صاحب نے مُستقل تصانیف کے علاوہ عربی اور فارسی خطُوط کا ایک معقُول ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ بعض خطوط ذاتی اور نجی ہیں۔ لیکن کئی خطوں میں مختلف علمی مسائل کی توضیح ہے۔ ان خطوط میں بھی شاہ صاحب کی علمی وسعت، اجتہادانہ نظر اور انصاف پسندی پُوری طرح نمایاں ہے۔ ایک عربی خط کا ترجمہ ہم نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں۔ جسے انُھوں نے بعض دوستوں کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں:۔

"زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ نہایت مکدّر ہوگیا ہے اور ہر شورش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے حقیقت میں اسلامی

نہیں ہے .... تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ
جو حقیقت میں انسان کے منزلہ میں ہیں:۔
ایک بے حیا صوفی ہے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے۔ اور اپنے مجازی
امور میں توقف نہیں کرتا۔
دُوسرا۔ جھگڑالو معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے اور خدا کا منقاد و
مطیع نہیں ہوتا۔
تیسرا۔ شیخی خورا فقیہ جو مُردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلعم نے اپنی
اُمت کیلئے جن باتوں کی توضیح کی ہے اُن کی پیروی نہیں کرتا۔
چوتھا۔ خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی
بارے میں اجازت ہی حاصل نہیں۔
پانچواں۔ سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا
اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے والسلام!

امام الہند کون ہے؟

اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر
تو ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے۔ لیکن اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ
علما یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے وسیع علم اور
نیز قوتِ ادراک کی مدد سے مختلف فریقین کے نقطۂ کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں
اور ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے حالات کچھ ایسے تھے۔ کہ یہاں اس کی

بڑی ضرورت ہے۔

شیعہ سُنی خیالات کی تطبیق:۔ ہندوستان کے مسلمان بیشتر سُنی ہیں۔ لیکن ان پر شیعہ اثرات بھی کثرت سے کارفرما ہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی رہی ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متعدد شیعہ علما، شعرا، فلسفی ہندوستان آتے رہے۔ اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا اثر ان کی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ سُنی مسئلے میں کوئی عالم اسی طرح غلو کرے۔ جس طرح عرب یا ترکستان کے بعض حصّوں میں کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے فریق کا نقطۂ نظر سمجھے بغیر ایک فریق کے خیالات کی تلقین پر شدّت سے مُصر ہو۔ تو وہ قوم میں اختلافات بڑھائے گا۔ اور ہندوستان میں اسلام کی نشوونما تاریخی اتفاقات کی وجہ سے جن اصولوں پر ہوئی ہے۔ ان کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملہ میں ایک احسن طریق عمل اختیار کیا جو دونوں طبقوں کے نقطۂ نظر اور اس بحث پر تمام تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدوّن ہوا ہے۔ اور جس کو، خواہ دونوں فرقوں کے غالی طرفدار پسند نہ کریں لیکن اہلِ انصاف اس کی ضرور قدر کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر، جن کی وجہ سے شیعہ سُنی اختلافات ہوئے کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ ازالۃ الخفا میں انہوں نے بالتفصیل مختلف خلفا کے خصائل اور ان کے حقِ خلافت پر تبصرہ کیا۔ اور اپنی رائے یہ ظاہر کی۔ کہ رسُول کریمؐ کے قطعی اشاروں کے مُطابق خلفا کی ترتیب وہی ہونی چاہئے تھی۔ جو فی الواقع ہوئی۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل گننے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے۔

بلکہ فیوض الحرمین میں کہتے ہیں (ترجمہ) "میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو دونوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہ' کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے'۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ کہ تفضیل شیخین (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے معاملے میں اولیت) کا عقیدہ" ایک ایسی چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا۔ افسوس ہے۔ کہ مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت' (یعنی تمام باتوں کو دھیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے"

"جامعیت" کے علاوہ شاہ صاحب کے معتدلانہ نقطۂ نظر کا باعث ان کا متوازن دل و دماغ ہے۔ حضرت مجددؒ الف ثانی کی امتیازی خصوصیت ان کی "رگِ فاروقیم" یعنی شدید اسلامی احساس ہے لیکن شاہ صاحب کی سب سے نمایاں خوبی "عدل" و "اعتدال" ہے۔ جو کوئی ان کے فلسفہ اور رجحانات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے "متوازن دل و دماغ" "معتدل مزاج" "ہمہ گیر فطرت" "جامعیت" "توازنِ صادق" "اعتدالِ صحیح" یا اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

حضرت امام الہند ہر امر میں طبعی توازن (Balance) برقرار رکھنے کی ضرورت خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس صفت کو عدل یا عدالت کا نام دیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ ہمعات اور دوسری تصانیف میں اس پر بڑا زور دیا ہے۔ اور اجتماعی کے لئے اسے "اصل" یا "معیار" قرار دیا ہے۔ ہمعات میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"خصلت چہارم عدالت است۔ و آں خصلت ہست۔ کہ صدورِ اقامت نظامِ عادل

وسیاستِ کلی از وے باشد۔ و وے را شعب بسیار است۔ مثل ادب و کفایت وحریت و سیاستِ مدینہ و حسنِ معاشرت و بالجملہ ایں ہمہ یک اصل دارند۔

شیعہ سُنی مسئلے میں شاہ صاحب کی رائے اس طرح انتہا پسندی سے دُور تھی۔ کہ جب ایک انتہا پسند سُنّی نے آپ سے پُوچھا۔ کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے۔ اور آپ نے یہ نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علما میں اختلاف ہے۔ تو وہ برہم ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ یہ تو شیعہ ہے! یہ روائت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید۔ آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است۔ بیان کردند۔ چوں مکرّر پرسید ہماں شنید۔ شنیدم کہ میگفت شیعہ است"۔

یہ واقعہ تو شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہُوا۔ شاہ عبدالعزیز نے دوسری باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی اپنے والد کی پیروی کی تھی۔ ان کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہوا۔ ان کا ایک پٹھان شاگرد تھا۔ حافظ آفتاب نام۔ ہمیشہ حاضرِ درس ہوتا تھا۔ ایک دِن حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور شاہ صاحب نے ان کے "بجان و دل فضائل و مناقب بیان" کئے۔ تو وہ اتنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا۔ اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کر دیا!

مولینا مناظر احسن گیلانی اس مسئلے پر شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں پہلے تورانی سُنّی۔ پھر ایرانی شیعہ۔ اور آخر میں متشدد سُنی (روہیلوں) کی

---

[1] حضرات مجددیہ نقشبندیہ کے خیالات بھی شیعوں کے بارے میں انتہا پسندانہ تھے۔ حضرت مجدد ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں۔ "یقینی طور پر تصور فرمائیں۔ کہ بدعتی کی صحبت کا فساد کافر کی صحبت سے زیادہ تر ہے۔ تمام بدعتی فرقوں میں بدتر اس گروہ کے لوگ ہیں۔ جو پیغمبر علیہ السلام کے اصحاب کے ساتھ بغض رکھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنے کلام میں ان کا نام کفار رکھتا ہے"۔

شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنّن وتشیع کے سلسلہ میں عجب افراط وتفریط کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں عجب افراط وتفریط کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات ازالۃ الخفا میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ تو اسی کے ساتھ ان غالی سُنیوں کی شدّت وتیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے۔ جو محض اس لئے کہ شاہ عبد العزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مناقب کیوں بیان کئے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہاء حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں —— اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سدِّباب ہوگیا!"

شریعت اور طریقت:۔ اسی طرح صوفی اور فقیہ یا صوفی اور مُلا کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں کچھ تو مقامی اثرات سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستان میں اسلام، صوفیہ کے ذریعے اشاعت پذیر ہُوا، اور کچھ اس لئے کہ سو میں سے نوّے مُلا اسلام کے اس قدر ظاہری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ کہ اصلاح باطن کے لئے، بلکہ مذہب حقّہ سے کوئی فیض حاصل کرنے کے لئے تصوّف کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں تصوّف نے بڑا فروغ حاصل کیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ بعض صوفیہ کمیٔ اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے۔ یا جیسا کہ

خود شاہ ولی اللہؒ نے یا اب اقبالؔ نے بتایا ہے۔ اصولی باتوں (مثلاً مسئلہ استہلاک یا فنا) میں کبھی کبھی اتنا غلو کرتے ہیں۔ کہ اسلامی نقطۂ نظر یا قومی اور انفرادی فلاح کے اصولوں سے دُور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تصوّف اور فقہ کے درمیان اختلاف کا دروازہ کھلا۔ جو اُس وقت شروع ہوا۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نائبِ دہلی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شہر دہلی کے قاضی میں اختلاف بلکہ مخالفت کی نوبت آئی۔ اور اُس وقت سے آج تک جاری ہے۔ آج تصوّف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوّف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستانی مُسلمان کو خیال بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ کسی صوفیانہ سلسلے میں منسلک ہُوئے سوا، اور کسی مرشدِ کامل کے بغیر، اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصّہ لیا جاسکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تصوّف زوروں پر تھا۔ ضرورت تھی۔ کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اس کے ان اجزا کو جو شرع اور فقہ کے خلاف ہیں علیحدہ کیا جائے۔ تاکہ عوام و خواص کی روحانی اصلاح کے سلسلے بھی منقطع نہ ہوں۔ اور شرع کی مخالفت بھی جاتی رہے۔ شاہ ولی اللہ اس کام کے لئے بے حد موزوں تھے۔ وہ اسلامی فقہ کی تاریخ سے پوری طرح باخبر اور فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ صوفی تھے۔ اُنہوں نے بیعت کی ہُوئی تھی۔ اور خود اپنے صوفیانہ مشاہدات اور واقعات کا حال انہوں نے اس طرح لکھا ہے۔ کہ محدُود رُوحانی تجربے والوں کو ان کا یقین بھی نہیں آسکتا۔ اُنہوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوّف اور فقہ کے اختلاف مٹانے کے لئے استعمال کیا۔ ان سے پہلے ان کے والد اور ان کے چچا کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مولینا عبید اللہ سندھی ان دونوں بزرگوں کی نسبت لکھتے ہیں

"ہر دو بھائیوں کے نظریوں کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ اور متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں" ان کوششوں کو شاہ ولی اللہ نے جاری رکھا اور تصوّف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے متعلق مولٰینا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔" ان کتابوں سے مُلّا اور صُوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تصوّف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے "مولویوں" کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے۔ جو ان بیچاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔" تصوّف اور شرع کے معاملے میں شاہ ولی اللہ کے طرزِ عمل کا ایک نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ مدرسۂ دیوبند میں جہاں شاہ صاحب کے اصولوں کی تھوڑی بہت پیروی ہو رہی ہے۔ فقط علوم ظاہری کی تعلیم نہیں ہوتی۔ بلکہ تلامذہ کی روحانی اصلاح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ میں سے اکثر صحیح تصوف اور تزکیۂ نفس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور حال میں مدرسہ کے سرپرست، مولٰینا اشرف علی تھانوی نے تصوّف کے متعلق جو تفصیلی کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی فی الحقیقت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف صوفیہ اور فقہا کے اختلافات مٹانے کی کوشش کی۔ بلکہ صوفیہ کے اپنے درمیان جو اختلافات تھے۔ انہیں بھی کم کرنے میں ساعی ہوئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کا مکتوب مدنی ہے۔ جس میں انہوں نے ابن العربی کی "وحدت وجود" اور امام ربانی کی "وحدت شہود" کو ایک دُوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے رُوحانی اختلافات مٹانے کے لئے یہ بھی کیا۔ کہ اگرچہ آپ کو زیادہ تعلقِ خاطر طریقۂ نقشبندیہ باقویہ سے تھا۔ لیکن بعیت کے وقت

آپ چاروں خانوادوں کے نام لیتے۔ تذکرۃ الرشید میں مولینا رشید احمد گنگوہیؒ کا ارشاد درج ہے۔ "ہمارے حضرات بیعت کے وقت چاروں مشائخ کا نام لے دیتے ہیں۔ تاکہ سب سے برابر عقیدت رہے۔ اور سب بزرگوں کے فیض سے مستفیض ہو...... اور چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ سے نکلا ہے"۔

اختلاف بین المذاہب:۔ اس کے علاوہ فقہی مذاہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی طریقوں کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں تو اس مسئلے نے بہت پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی لیکن ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں اس پر سخت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا بیان ہے۔ کہ چند سال ہوئے وہ اسپین ہوتے ہوئے اسپینی مراکش میں بھی بغرض سیر و سیاحت چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے۔ تو امام نے پوچھا کیف مذھبکم "تمہارا مذہب کیا ہے" ان بچاروں نے مذہب کا مطلب ہندوستانی محاورہ کے مطابق دین لیا۔ اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دُہرایا اور بالآخر ایک اور ساتھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انہوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا تو امام صاحب اتنے مایوس ہوئے۔ کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے۔ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بھی انصاف اور اعتدال اور سلیم الطبعی سے کام لیا ہے۔ وہ خواجہ محمدؐ امین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "سوم سوال آنکہ عمل تو در مسائل فقیہہ بہ کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ"۔ یعنی مختلف مذاہب کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حنفی طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا

دونوں حنفی تھے۔ لیکن ان کے چاہیتے اُستاد شیخ ابوالطاہر مدنی شافعی تھے۔ شاہ صاحب نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ اور وہ دونوں طریقوں کی خوبیوں اور ان کے اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ ان اختلافات کو نمایاں کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے۔ نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔

جدید علم الکلام کی ابتدا:۔ یہی حال علم الکلام کے متعلق ہے۔ آپ عام معتزلین اور متکلمین کے مخالف تھے۔ اور کئی جگہ ان کے خلاف زور سے اظہار رائے کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"در علوم شرعیہ پیشینیاں چیزہا آوردند۔ کہ مقصود و معلوم پیشینیاں نہ بود۔ بلکہ در سلف امت ازاں اثرے یافتہ نمے شود۔ جموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیاں را با علم شریعت آمیختند۔ و اصل اصول کتاب را از دست دادہ، تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و اعراف و تحریف و تغلیط چیزے دیگر شد۔ علوم اصولِ دیں را کہ افضل علوم اسلام است۔ بہ بیں کہ متکلمین دراں چہ صنائع آفریدند۔ و در وادئے جدل و تعمق تا بکجا رسیدند؟ حالانکہ سلفِ امت نکیرِ عظیم داشتند بریں جنس کلام، و آں را خارج از شریعت پنداشتند۔"

لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں۔ عباسیہ دَور میں علم کلام اس لئے وجود میں آیا۔ کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کرے۔ اور دورِ جدید میں سرسید اور ان کے رفقا کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور نیچر سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں۔ لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دُنیا کے بُنیادی

واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور ان کی تصانیف ہے۔ ان کی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں یہ کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں اُنہوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے۔ کہ یہ احکام فلاح انسانی میں بے حد مفید ہیں۔ اور ان کی غرض و غائت ہی انسانی اصلاح و تہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تقلید کے خلاف اُنہوں نے بڑی سختی سے اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (ترجمہ) "تقلید سے میری جبلّت اور سرشت انکار کرتی ہے۔ اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے"۔ ایک اور جگہ، عام علماء مقلدین، پر بالواسطہ طنز کرتے ہیں۔ "جمعے کہ سرمایۂ علمِ ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد۔ کجا ادراکِ ایں سرِ دقیق تواند کرد"۔ اس کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ (ترجمہ)

"مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا ہے۔ کہ بُرہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے"۔

ایک نئے علمِ کلام کا پیغام نہیں تو کیا ہے۔ مولینا مناظر احسن گیلانی یہ فقرہ نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "آیندہ انگریزی عہد میں وساوس و اوہام اور شکوک و شبہات کے جو سیاہ بادل امنڈنے والے تھے۔ اگر ان کی طرف اس میں اشارہ نہیں ہے۔ تو بتایا جائے۔ کہ حجۃ اللہ کی تصنیف کے بعد انگریزی عہد کے سوا کونسا دور آیا۔ جس میں ضرورت تھی۔ کہ اسلامی شریعت کو "دلیل و بُرہان" کے پیراہنوں میں آراستہ کر کے پیش کیا جائے۔ بہرحال میرا خیال ہے۔ کہ یہ خیال شاہ صاحب کی کتابوں سے

پیدا ہُوا ہے۔ کہ جو کچھ ہونے والا تھا۔ اور مسلمانانِ ہند پر جو اُفتاد پیش آنے والی تھی۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اور اپنے تصنیفی کاروبار میں ان کے سامنے جہاں اَور مقاصد و اغراض تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے خطرات کے انسداد کی بھی اُنہوں نے اپنی کتابوں میں پُوری کوشش کی ہے۔ اور مَیں سمجھتا ہُوں۔ کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہُوئے ہیں۔"

دورِ عباسیہ کے متکلمین اور بعض معتزلین کی طرح شاہ صاحب کی ذہنیت غلامانہ نہیں تھی۔ ان کی یہ کوشش نہ تھی۔ کہ اسلامی تعلیمات کو کسی بیرونی فلسفہ کے مطابق خواہ وہ یونانی ہو یا جدید، ثابت کیا جائے۔ لیکن اُن کی یہ خواہش ضرور تھی۔ کہ اسے انسانی فلاح و بہبود کے بُنیادی اصُولوں پر منطبق کیا جائے۔ چونکہ اُنہوں نے اسلام کو کسی بیرونی نظام کے مُطابق ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس لئے ان کی تصانیف میں کوئی غیر اسلامی عنصر نہیں آیا۔ اور ان کی کتابوں میں کوئی چیز ٹکسال سے باہر نہیں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی ان کی روش، اگر متکلمین کی نہیں، تو جامد متقلدین کی بھی نہیں۔ اور ایک نہایت متوازنی طریقِ کار پیش کرتی ہے۔

شاہ صاحب قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دَور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہُوا۔ جب اسلامی حکومت کی بُنیادیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مُسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے۔ کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورتِ حالات کا افسوس ہوتا ہو گا۔ لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے۔ اسے اپنا دائرۂ عمل محدُود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے آپ کو

اس امر کے لئے موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہوکر واقعات کی رُو کو روکیں۔ لیکن جس کام کے لئے وہ موزوں تھے۔ اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا۔ (یعنی رسُول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ) اس کے لئے اُنہوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پُوری طرح واقف تھے۔ جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کرگئی تھیں۔ اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہورہا تھا۔ اور شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب کرکے کوشش کی۔ تاکہ ان کا ازالہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیکھا۔ کہ مسلمانوں کے ذہنی اور رُوحانی اختلافات مٹانا ضروری ہے۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن سکیں۔ اور آنے والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کرسکیں۔ ان کی تمام کوششیں اس پر منعطف رہی ہیں۔ اور اگرچہ بہ تقاضائے فطرت انسانی تھوڑے بہت اختلافات ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن شاہ صاحب قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سالہا سال کی محنت کے بعد ایک ایسا دستور العمل مرتب کردیا، جس سے اختلاف کی گنجائش تھوڑی ہے۔ اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علما، صوفیہ، فقہا اور عام مُسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام میں مُلک مُلک کے لئے علیحدہ مذہبی نظام (National Church) نہیں ہوتا۔ لیکن تاریخی، نسلی، لسانی اثرات پھر بھی کارفرما رہتے ہیں۔ اور مختلف ممالک میں مختلف طریقے برسرِکار آتے ہیں۔ ایران میں شیعیت نے عروج پایا۔ نجد میں وہابیت نے۔ کسی مُلک میں شافعی فقہ رائج ہے۔ کسی میں حنفی اور کسی میں حنبلی۔ اگر اس نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد، فقہی روایات اور

مذہبی میلانات دیکھے جائیں۔ تو یہ نظر آئے گا۔ کہ جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے۔ جسے بنگال میں مولوی کرامت علی جونپوری، بہار میں صادقپوری خاندان، اور شمالی ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، مولینا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے رائج کیا۔ اور جو آج دارالعلوم دیوبند کی بدولت خواص سے گزر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہؒ نے ترتیب دیا۔ اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کا امام اور یہاں کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جاسکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ذاتِ بابرکات ہے!

حضرت امام الہند کے فرزندانِ ارجمند

شاہ ولی اللہ صاحب نے کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں۔ لیکن جس طرح وہ اولادِ معنوی میں خوش قسمت تھے اسی طرح اولادِ صلبی میں بھی خوش نصیب تھے۔ اُن کے چار بیٹے[۱] تھے اور چاروں علم و فضل میں بے نظیر!

شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ عبدالعزیزؒ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد اور ان کے ایک ممتاز شاگرد سے علم حاصل کر کے سترہ برس کی عمر میں، والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے ساٹھ سال تک درس دیا۔ اور علمِ حدیث جسے شاہ ولی اللہ نے ازسرِ نو ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ اُس کا فیض مُلک میں عام کیا۔ ہندوستان کے

---

[۱] تذکرۃ الرشید کے حاشیے پر ایک جگہ حضرت امام الہند کے پانچویں بیٹے "مولوی شیخ محمدؒ" کا ذکر آتا ہے۔ جو لاولد فوت ہوئے۔ لیکن عام طور پر تذکروں میں فقط چار نام ہی ملتے ہیں۔

اکثر محدثین کا سلسلۂ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے "بالجملہ وے جامع علوم بلکہ آئتے از آیاتِ الٰہی بُود" اور حقیقت یہ ہے کہ آج ہم آپ کی عظمت کا اندازہ آپ کی تصانیف سے صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ آپ درس و تدریس اور ارشاد و ہدائت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس لئے آپکو تصنیف و تالیف کا بہت وقت نہیں ملا۔ لیکن آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ تو آپ کے تلامذہ کی تعداد اور برگزیدگی سے ہو سکتا ہے۔ اور کچھ معاصرانہ تذکروں اور تاریخی کتابوں سے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں آپ کی کس قدر عزت تھی۔ آپ کو کلکتہ کے مدرسے کے لئے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے بُلایا گیا۔ اگرچہ دہلی میں روزگار کا کوئی مستقل سلسلہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے سادہ زندگی اور علومِ اسلامی کی اشاعت زیادہ عزیز سمجھی۔ آپ کے شاگرد بیشمار تھے۔ ذیل میں چند نام درج کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک صاحبِ علم و فضل تھا۔ اور آپ سے فیض حاصل کر کے خود فیض کا سرچشمہ بنا:۔ شاہ رفیع الدینؒ۔ شاہ محمدؐ اسحٰق صاحبؒ۔ مفتی صدرالدین دہلوی۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب۔ مولوی عبدالحی صاحب۔ مولٰینا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندہلوی۔ مولٰینا فضل حق صاحب خیر آبادی۔ مولٰینا سید احمد بریلویؒ۔

آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں۔ اور اسلامی علوم تک محدود نہ تھیں۔ آپ خود فرماتے تھے۔ کہ جو علوم مَیں نے مطالعہ کئے ہیں۔ اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں۔ ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب ایسے

علوم تھے۔ جو امتِ اسلامی کی تخلیق اور باقی نصف دوسری اُمتوں کے۔

اور تو اور آپ کو فنِ موسیقی کے علمی پہلوؤں سے بھی واقفیت تھی۔ اور مختلف گتوں اور راگوں کو پہچانتے تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نہ صرف امورِ مذہبی اور حدیث و تفسیر اور فقہ میں آپ کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی چنانچہ ناظرینِ آبِ حیات کو یاد ہوگا۔ کہ جب شاہ نصیر دہلوی نے ذوقؔ کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ذوقؔ، دہلی کے باقی سب اساتذہ کو چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور جب آپ نے اس کی غزل کے متعلق اس کی تسلی کر دی تو ذوقؔ نے کسی سے اصلاح لئے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرے میں پڑھا۔ اس واقعہ کی نسبت سیّد ناصر نذیر فراقؔ نے لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھا ہے:-

"کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر ثانی اور ابوظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ کے اُستاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحبؒ اور ذوقؔ کا دل کھٹا ہو گیا۔ اور اصلاح موقوف ہوئی۔ تو ذوقؔ ہر جمعہ کو مولینا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے۔ اور وعظ بہت غور سے سُننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پُوچھا۔ تو ذوقؔ نے کہا۔ "اُستاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ مولینا عبدالعزیز صاحب اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سُنتا ہوں۔ اور اُردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں، اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اُردو زبان سیکھنے کے لئے خواجہ میر دردؔ صاحبؒ

کی خدمت میں بچپن سے حاضر ہوتے تھے۔ اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپکی تقریر کو سُنا کرتے تھے۔ اور محاورات کو دل ہی دل میں چُنا کرتے تھے۔ مولینا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے "جس طرح اصولِ حدیث اور اصُول فقہ فن ہے۔ اسی طرح اصولِ زبان بھی فن ہے۔ اور اُردو زبان کے مُوجد اور مجتہد خواجہ میر دردؔ صاحب ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب پکے پان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب خاص طور پر میر دردؔ صاحب کے شاگرد تھے"۔

مُعتقدوں کی نظروں میں تو مولوی صاحب، فقط ایک حلیم الطبع، مسکین، مرنجاں مرنج عالم تھے۔ جنہیں تعبیر خواب میں اور جنّوں کے نکالنے میں خاص ملکہ تھا لیکن آپ کے ملفوظات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ آپ بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سُنّی مباحثے زوروں پر تھے۔ اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ آپ کے پاس بھی لوگ اپنے اعتراض اور سوال لے کر آجاتے۔ جنہیں آپ بعض اوقات ٹھوس اور متیں دلائل سے رد کرنے کے بجائے اس طرح چٹکیوں میں اڑاتے، کہ معترض قائل بھی ہو جاتے اور لاجواب بھی۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں:۔

لطیفہ۱۔ ایک مرتبہ ایک پادری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں آئے۔ اور سوال کیا۔ کہ کیا آپ کے پیغمبر حبیب اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ وہ کہنے لگا۔ تو پھر انہوں نے بوقتِ قتل امام حسین فریاد نہ کی یا یہ فریاد سُنی نہ گئی؟ شاہ صاحب نے کہا کہ نبی صاحبؐ نے فریاد تو کی لیکن انہیں جواب آیا۔ کہ تمہارے نواسے کو قوم نے ظلم سے

شہید کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسےٰؑ کا صلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے!

لطیفہ۔ ایک دفعہ ایک ہندو گاڑیبان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ میری ایک بات بتلاؤ۔ کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟ آپ نے فرمایا۔ کہ جو میں کہوں اسے خوب سوچ لینا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اگر خدا ہندو ہوتا۔ تو گئوہتیا کبھی نہ ہوتی!!

لطیفہ۔ ایک شخص آپ کے پاس کسی مصوّر کی کھچی ہوئی ایک تصویر لایا۔ اور کہنے لگا۔ کہ یہ تصویر جناب رسالت مآبؐ کی ہے۔ اسے کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے کہا۔ کہ حضرت پیغمبر صاحبؐ باقاعدہ غُسل فرمایا کرتے تھے۔ اس تصویر کو بھی غسل دے کر دھو ڈالو!

لطیفہ۔ ایک شخص نے آپ سے مسئلہ پوچھا۔ کہ مولوی صاحب، یہ طوائف یعنی کسبی عورتیں مرتی ہیں۔ تو ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا۔ کہ جو مرد ان کے آشنا ہیں۔ ان کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا۔ کہ ہاں پڑھتے ہیں۔ حضرت نے کہا۔ تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو!!

مذہبی معاملات میں کئی اہم امُور پر آپ کے فتاویٰ یادگار ہیں۔ مثلاً جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب کے شبہات کو دفع کیا اور علیگڈھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔ اسی طرح اسی طرح اور کئی فتوے ہیں۔ جن میں انگریزوں، بلکہ تمام غیر مسلموں کی مناسب

نوکری، اور دارالحرب میں حربی کافروں سے سُود لینے کے جواز کے فتوے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور سرّ الشہادتین اسی سلسلے میں لکھی گئیں۔ آخری دو کتابیں عربی میں ہیں اور پہلی فارسی میں۔ تحفہ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے لیکن مخالفین بھی اس کی متانت۔ تہذیب اور شائستگی کے مدّاح ہیں۔ ان کے علاوہ تفسیر عزیزی میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں کی ہے۔ اصولِ حدیث میں عجالۂ نافعہ اور تاریخ حدیث میں بُستان المحدّثین اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

علمی وسعت اور محققانہ نظر کے علاوہ آپ کو عربی انشا پردازی اور شاعری میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ نے کئی عربی نظمیں لکھیں۔ ایک منظوم عربی خط میں جو آپ نے اپنے عم زاد بزرگوار شاہ اہل اللہ صاحب کو لکھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے حالات اور مرہٹہ اور سکھ حملہ آوروں کے طریقے بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ نظم دہلی کی تعریف میں ہے۔ ایک قصیدے میں آپ نے سوڈان کے حالات و واقعات کا نقشہ کھینچا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط تین بیٹیاں تھیں۔ ایک مولینا عبدالحی سے بیاہی گئیں۔ دوسری مولینا شاہ رفیع الدین کے بڑے فرزند مولوی عیسٰے صاحب سے۔ اور تیسری شیخ محمد افضل سے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ مولینا محمد اسحٰق صاحب مہاجر اور مولوی محمد یعقوب صاحب۔ شاہ صاحب کی وفات پر لوگوں نے مولینا محمد اسحٰق صاحب کو آپ کا جانشین منتخب کیا۔ انہوں نے چند سال کے بعد ۱۲۵۶ھ میں تمام قبائل کو لے کر مکّہ معظّمہ کی طرف ہجرت کی۔ اور

وہیں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں انتقال فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز کی وفات ۷۹ سال کی عمر میں ۷؍شوال ۱۲۳۸ھ یعنی ۱۷؍جولائی ۱۸۲۳ء کو ہوئی۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دئے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہے، تاریخ کہی ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے   فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عدل

شاہ رفیع الدینؒ

شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے مولوی شاہ رفیع الدین ہیں۔ آپ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کی آغوشِ عاطفت میں علومِ مروجہ حاصل کئے اور حدیث شریف کی سند بھی اسی صاحبِ کمال کے دستِ شفقت سے حاصل کی اور تقوے میں اپنے باپ اور بھائی کے قدم بقدم تھے۔ جب آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب کبر سنی، کثرتِ امراض و ضعفِ مزاج کی وجہ سے دماغی محنت اور تعلیم و تدریس کے متحمل نہ ہو سکے۔ تو زیادہ تر یہ کام شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے سپرد کیا گیا۔ آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے۔ لیکن آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول انام ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں مثلاً راہِ نجات اور دمغ الباطل۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں منہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ اور اپنے والد بزرگوار کے قریب پائیں کی طرف دفن ہوئے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے تیسرے صاحبزادے مولوی شاہ عبدالقادر صاحب تھے۔ آپ ۱۱۶۷ھ شمع افروزِ بزمِ جہاں ہوئے اور اپنے وجود باجود سے عالم کو روشن کیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت

اپنے والد مکرم کے سایۂ عاطفت میں پائی اور علم فقہ وحدیث وتفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیلِ علم سے فراغت پا کر اکبرآبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کردی .... گوشہ نشینی پسندِ خاطر تھی۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف چنداں توجہ نہ کی لیکن قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ یا موضح القرآن آپ سے یادگار ہے۔ جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔ یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے۔ آپ نے ۱۲۳۰ھ میں تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدِ امجد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پائیں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔ موضح القرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس سے پہلے ہوا یا بعد میں مقبولیت اور محاورے کی صحت کے لحاظ سے موضح القرآن دوسرے ترجمے سے بہتر ہے۔ اس کی دو بڑی خوبیاں ہیں۔ ایک تو اس میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی طرح اردو عبارت میں عربی جملوں کی ترکیب وساخت کی نقل نہیں کی گئی صحت مفہوم کے ساتھ ساتھ اردو محاورے کا بھی خیال رکھا گیا۔ دوسرے ترجمے میں کم سے کم لفظوں میں صحیح مفہوم ادا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے میں عربی نحوی ترکیب کی پابندی کی گئی ہے اور کئی جملے کانوں کو عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمے میں بعض لفظوں کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔

آج ان دونوں ترجموں سے بہتر ترجمے مرتب ہو رہے ہیں۔ لیکن جب ہم یہ سوچتے ہیں۔ کہ یہ ترجمے اس زمانے میں ہوئے جب اردو نثر کی کتابیں انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور لوگ اس زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے تو ان

بزرگوں کی سمجھ اور فرض شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے اور تبدیل حالات کے ساتھ نئی زبان میں قرآن اور مذہب کی اشاعت کی۔

شاہ عبد الغنی

شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبد الغنی تھے۔ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے۔ تو اس کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے پوری کردی۔ جنہوں نے شاہ عبد العزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم و فضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا۔

اس نئے دَور کا مطالعہ، ہم اپنی تیسری کتاب موجِ کوثر میں کریں گے۔

عُلمائے متاخرینؒ[1]

زوالِ حکومت
۱۷۰۸ - ۱۸۵۷ء

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی۔ اور اسکے بہت جلد بعد مُغلیہ حکومت کا زوال نمایاں ہوگیا۔ اورنگ زیب ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہُوا۔ جب اس کا بیٹا تخت نشین ہُوا تو وہ خود بُوڑھا تھا۔ اور اُسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ اُس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ نے مغلوں کے علاقوں کو لوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت تو اُس نے خود رفع کر دی۔ لیکن بندہ کا قلع قمع فرخ سیر نے کیا۔ جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا۔ چند ایک باتوں میں وہ سمجھ دار اور قابل حکمران تھا۔ لیکن اس کے زمانے میں مسلمان امرا کے دو فریق ہو گئے۔ ایرانی اور تورانی۔ (شیعہ اور سُنّی؟) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان قبائلی اور فرقہ دارانہ اختلافات کے علاوہ حکومت کو ضعف اس لئے بھی پہنچا۔ کہ فرخ سیر کو تخت سید برادران (امیر الامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ) کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ سید عبداللہ وزیر سلطنت اور حسین علی دکن کا با اقتدار صوبیدار تھا۔ جب فرخ سیر نے

---

[1] ہمیں افسوس ہے۔ کہ کتاب کا حجم بڑھ جانے کی وجہ سے ہمیں اس باب اور اس سے پہلے باب میں کئی چیزیں فہرست چھپ جانے کے بعد حذف کرنی پڑیں۔

سید برادران کا اقتدار کم کرنا چاہا۔ تو حسین علی نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ ان سے وعدہ کیا۔ کہ بادشاہ سے تمہیں چوتھ اور سردیش مکھی کا فرمان لے دوں گا۔ چنانچہ وہ ان کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چلا۔ فرخ سیر معزول ہو گیا۔ اور مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی کی اجازت مل گئی۔ خاندان مغلیہ کے زوال کی سب سے پہلی بڑی منزل یہ تھی۔

اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء سے ۱۴ اگست ۱۷۱۹ء تک تین بادشاہ ہوئے۔ جب تورانی امرا نے ان بھائیوں کے مظالم دیکھے۔ تو انہیں قتل کر دیا۔ کئی دوروزہ بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ جو ۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے امور سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن جب "رنگیلے بادشاہ" نے یہ گوارا نہ کیا۔ تو نظام الملک مایوس ہو کر ۱۷۲۴ء میں دکن چلا گیا۔ اور وہاں حکومت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد حکومت دہلی کا وقار و اقتدار بتدریج کم ہوتا گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ روہیلوں اور جاٹوں نے بغاوتیں کیں۔ اور بڑا ظلم یہ ہوا۔ کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ آ گیا۔ اس نے کئی دن تک دہلی کو لوٹا۔ قتل عام کیا۔ اور دہلی کا خزانہ خالی فوج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شاہِ دہلی میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود مختار صوبیداروں اور دوسرے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بنگال میں علی وردی خاں۔ دکن میں نظام الملک اور اودھ میں سعادت علی خاں خود مختار ہو گئے۔

محمد شاہ کی وفات ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔

جس کے زمانے میں ایرانی اور تورانی اختلاف پھر بڑھ گئے۔ ایرانیوں کا سرگروہ نواب اودھ کا بھتیجا صفدر جنگ اور تورانیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین۔ جس نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانٹھ کر طرح طرح کے مظالم شروع کیے۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور اُس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ پانچ سال بعد اُسے بھی مروا دیا۔ اور ایک شہزادے کو تخت نشین کیا۔ ایرانی اور افغان اُمراء نے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین اور اس کے مرہٹے ساتھیوں کی شکایت کی۔ احمد شاہ لاہور پر قابض ہو گیا تھا۔ لیکن مرہٹوں نے اُس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے حامی ایرانیوں کے سرگروہ شجاع الدولہ ابن سعادت علی خاں اور افغانوں کے سرگروہ نجیب الدولہ تھے۔ مرہٹوں کے ساتھ سورج مل جاٹ۔ ابراہیم گاردی اور دوسرے لوگ تھے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا جس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا۔ لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کر کے واپس چلا گیا۔ اور شاہ عالم عنانِ حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا۔ اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں آگیا تھا۔ اس کے چند سال بعد مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی۔ لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ اس قابل نہ رہے تھے۔ کہ انگریزوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں۔ لیکن اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہِ شطرنج کو اپنے قابو میں رکھیں۔ شروع شروع میں ان کا اقتدار بہت واضح نہ تھا۔ لیکن جب رُہیلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر رُہیلے نے بادشاہ کو اندھا

کر کے تخت سے اُتار دیا اور اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر رُہیلے کو شکست دی۔ اور اُسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا تو وہ ۱۸۰۶ء تک بادشاہ رہا۔ لیکن اس کی حالت "مردہ بدستِ زندہ" سے بہتر نہ تھی۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ تختِ دہلی پر متمکن رہے۔ لیکن ان کی حیثیت بھی شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ درحقیقت دہلی کی اسلامی حکومت ۱۷۸۸ء ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ جب غلام قادر رہیلے نے شاہ عالم کو اندھا کیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ مرہٹوں کی مہربانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

اس دوران میں مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت وسیع ہو رہی تھی۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان راجہ رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا۔ وہ خود مختار ہو گیا۔ ۱۸۲۰ء کے قریب اس نے کشمیر اور پشاور فتح کر لئے۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء تک یہ علاقے سکھوں کے ہاتھ میں رہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہانِ اودھ مقابلتہً زیادہ دیر تک محفوظ رہے۔ اور ۱۸۵۶ء تک جب یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت آ گیا۔ شجاع الدولہ کی اولاد یہاں حکمراں رہی۔ سندھ کے امیروں کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ جنوب میں سلطان حیدر علی نے میسور میں ایک نئی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن ۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی۔ مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج نے ٹیپو کو شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں فقط نظامِ دکن کا تاج و تخت سلامت رہا۔ اور آج تک ریاست حیدر آباد مغلیہ حکومت اور تہذیب کی آخری یادگار موجود ہے۔

علومِ اسلامی کا فروغ

فرنگی محل

یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال پر مسلمانوں کے ذہنی اور دماغی جوہر مفقود نہ ہوئے۔ بلکہ اِس دور میں شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالعزیز۔ مولانا اسمٰعیل شہید۔ غالب۔ سرسید۔ حالی۔ آزاد اور شبلی جیسی ہستیاں وجود میں آئیں۔ جن کی توجہ سے مسلمانوں کا رجحان اسلامی روحانیت اور تمدّن کے اصل سرچشمے یعنی قرآن وحدیث پر مرکوز ہوگیا۔

اس زمانے میں علمائے فرنگی محل کی توجہ سے علومِ اسلامی نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کی درسِ نظامیہ کا آغاز ہوا۔ سید سلیمان ندوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔ "...... اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی اور میر زاہد ہروی نے منطق اور فلسفے کا درس عام کیا۔ اور انہی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ۔ فرنگی محل اور خیر آباد کی درس گاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شرح وحواشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد عبدالسلام لاہوری[۱] اور انکے شاگرد مُلّا عبدالسلام اودھی۔ ان سے مُلّا قطب الدین سہالوی اور مُلّا قطب الدین سہالوی سے

---

[۱] "شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ ومفسر بود۔ از شاگردانِ وے۔ ملا عبدالسلام ساکن دیوہ مضاف لکھنؤ مشہور است۔ بر تفسیر بیضاوی حاشیہ برجستہ داد۔ بسال ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) وفات یافتہ۔"

مُلّا قطب الدین شمس آبادی۔ مُلّا امان اللہ بنارسی اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور مُلّا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ مُلّا نظام الدین نے مُلّا امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ مگر نظام الدین کے وارث مُلّا بحر العلوم ہُوئے۔ بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا۔ میرزاہد کا فیض شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کو اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو۔ ان سے شاہ عبدالعزیز صاحب کو پہنچا۔ اور اُن سے مُلک میں عام ہُوا۔"

مولٰینا نے جو سلسلہ ترتیب دیا ہے۔ اس کی قطعی صحت مشتبہ ہے۔ اور اصُولاً بھی یہ خیال صحیح نہیں کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی ساری قابلیت اس میں تھی کہ جو علوم انہیں میر فتح اللہ شیرازی سے پہنچے وہ اُنہوں نے دُوسروں تک پہنچا دئے۔ (شاہ ولی اللہ میں تو میرزاہد کے بجائے مدینہ کا رنگ کہیں زیادہ غالب ہے) لیکن ان باتوں کے باوجود مولٰینا سلیمان ندوی کا مرتب کردہ سلسلۂ تاریخ علوم اسلامی دلچسپ اور مفید ہے۔ اور علومِ اسلامی کی تاریخ میں فرنگی محل کے بزرگوں کی اہمیت اس سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے!

فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے۔ شروع میں (غالباً اکبر کے زمانے میں) وہاں ایک فرنگی تاجر مقیم تھا۔ جس کے تعلق کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر لاوارث مر گیا تو یہ زمین "نزول" یعنی سرکاری ہو گئی۔ اور نگ زیب کے زمانے میں مُلّا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہالی میں رہتے تھے۔ جہاں انصاریوں اور عثمانیوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا تھا۔ مُلّا قطب الدین انصاری تھے۔ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۱ء) کی ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر

چڑھ آئے اور مُلّا کو شہید کر کے ان کا گھر جلا دیا۔ اُن کے صاحبزادے مُلّا محمد سعید سہالوی نے عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انہیں معافی میں دیا گیا۔ مُلّا قطب الدین نے مُلّا عبد السلام دیوی کے شاگرد مُلّا دانیال اور قاضی محب اللہ الہ آبادی کے شاگرد قاضی گھاسی سے علم حاصل کیا تھا۔ آپکی تصانیف میں سے ایک شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ تھا۔ جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہو گیا۔

اولاد کے معاملے میں آپ بڑے خوش قسمت تھے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اور انہی کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کا فیض جاری رہا۔ "تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے۔ "عمر عزیزش بشغل درس بسر برد۔ گوئی ریاست علمی بجوار لکھنؤ برو ختم شد۔ وسلسلۂ تلمذ اکثر علمائے ہند برو منتہی می شود"۔

مُلّا قطب الدین کے بیٹوں میں سب سے برگزیدہ مُلّا نظام الدین تھے۔ جن کے نام پر "درسِ نظامیہ" مشہور ہے۔ تعلیم آپ نے اپنے والد۔ حافظ امان اللہ بنارسی اور اس عہد کے ایک اور مشہور اور قابلِ ذکر اُستاد مولوی غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ تصانیف آپ کی کئی ہیں۔ جن میں حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت شرح مسلم الثبوت۔ حاشیہ شمس بازغہ۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔ آپ شاہ عبد الرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے ملفوظات بھی آپ نے مرتب کیے۔ آپ نے وفات ۱۷۴۸ء میں یعنی نادر شاہ کے حملے سے تھوڑی دیر بعد ہوئی۔ آپ کی زیادہ شہرت بطور مدرّس کے تھی۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں۔ کہ آپ کے درس و تدریس کے مقابلے میں باقی سب علما کے درس بے رونق ہو گئے۔

"بالجملہ وے در فرزندانِ مولینا شہید وحیدِ عصر و فریدِ دہر، جامع علوم بظاہر و باطن بود کہ بمقابلۂ تدریس او گرمئ تدریسِ ہمہ مدرسین و فضلائے دیار فرد نشست۔ مردمانِ اقطار و امصار بعید از اطراف و جوانب مشارق و مغارب برو آمدہ بتعلیمش مستفید و بہرہ اندوز شدند۔ تا اینکہ در تمام ہندوستان کسے باشد کہ از احاطۂ تلمذِ وے و فرزندانش و شاگردانش بیروں افتد"۔

درسِ نظامیہ "درسِ نظامیہ" میں جو اُن کے نام سے مشہور ہے۔ مندرجہ ذیل کتب اور علوم کی تعلیم ہوتی تھی:۔

(۱) **صرف**:۔ میزان۔ منشعب۔ صرفِ میر۔ پنج گنج۔ زبدہ۔ فصولِ اکبری۔ شافیہ۔

(۲) **نحو**:۔ نحوِ میر۔ شرح مائتہ عامل۔ ہدایتہ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی۔

(۳) **منطق**:۔ صغریٰ۔ کبریٰ۔ ایساغوجی۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی مع میر سلم العلوم۔

(۴) **حکمت**:۔ میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔

(۵) **ریاضی**:۔ خلاصتہ الحساب۔ تحریر اقلیدس مقالہ اوّل۔ تشریح الافلاک۔ رسالہ قوشجیہ۔ شرح چغمنی باب اوّل۔

(۶) **بلاغت**:۔ مختصر معانی۔ مطول تا ما انا قلت۔

(۷) **فقہ**:۔ شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ اخیرین۔

(۸) **اصولِ فقہ**:۔ نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

(۹) **کلام**:۔ شرح عقائد نسفی۔ شرح عقائد جلالی۔ میر زاہد۔ شرح مواقف۔

(۱۰) تفسیر :۔ جلالین۔ بیضاوی۔

(۱۱) حدیث:۔ مشکوٰۃ المصابیح۔

مولوی ابوالحسنات ندوی اس نصاب کو درج کرکے لکھتے ہیں۔" اس کے بانی مُلّا نظام الدین تھے۔ انہوں نے اس کی بنیاد ایسے زبردست ہاتھوں سے رکھی کہ باوجود امتدادِ زمانہ آج تک اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی"۔ لیکن صحیح بات یہ ہے۔ کہ "درسِ نظامیہ" کی پائداری کی وجہ اس کی خوبیوں سے زیادہ کچھ تو علمائے فرنگی محل کا اثر و اقتدار تھا۔ اور کچھ علمائے متاخرین کی عقیدتمندانہ روش۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کے ماتحت علما نے خود تعلیم پائی ہو۔ اس سے انہیں اُنس ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علما نے کوئی ایسا مجتہد ابھی تک پیدا نہیں کیا جو پُرانے عربی مدرسوں کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کرکے اسے تبدیل شدہ حالات کے مطابق مفید بنا دے۔

اس نصاب میں کئی نقص ہیں۔ مولینا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا نقص ایک تو یہ ہے۔ کہ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب و لغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے ساتھ منطق۔ الٰہیات کی جتنی کتابیں اس میں شامل ہیں۔ وہ بھی اب تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لئے میری رائے میں صرف و نحو کی کتابوں کو کم کرکے زبانی خطبات کے ذریعے سے سمجھانا چاہیئے۔ اور مخصوص طور پر ایسی جامع کتابیں لکھنا چاہیئیں۔ کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر قواعد پر عبور ہو جائے۔ اور ایسی کتابیں مصر میں رائج ہیں۔ اسی طرح منطق و الٰہیات کی بھی بقدرِ ضرورت تعلیم دینی چاہیئے۔ فقہ و اصولِ فقہ۔ حدیث و اصولِ حدیث بے شک نہایت ضروری ہیں

لیکن افسوس ہے کہ ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں۔ وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان میں بھی ردّو بدل ضروری ہے۔ معانی و بیان اور لغت و ادب کے لئے کتابوں کا معقول اضافہ کرنا چاہیئے۔ اور ہندسہ و ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا۔ طبیعیات۔ طبقات الارض۔ تاریخ۔ اقتصادیات و سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے"۔
دینی نقطۂ نظر سے درسِ نظامیہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے۔ کہ اس میں تفسیر و حدیث پر پوری توجہ نہیں۔ اور منطق۔ حکمت۔ صرف و نحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے نام نہاد معقولات پر ضرورت سے زیادہ توجہ علمائے پُورب کا پُرانا مرض ہے۔ اور اس کے اثرات درسِ نظامیہ میں بھی نمایاں ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے طریق تعلیم میں معقولات کی نسبت جو طرزِ عمل ہے۔ اس کا اندازہ دار العلوم دیوبند کے سابق سرپرست مولٰینا رشید احمد گنگوہی کی رائے سے ہوسکتا ہے۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے۔"اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفّر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہُوا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ میرا جو مُرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا۔ وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں.... حضرت امام ربانی بارہا فرمایا کرتے تھے۔ کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر۔ کہ اس سے دُنیا کے نفع کی اُمید تو ہے"۔

علمائے متاخرین

علامہ بحر العلوم :۔ مُلا نظام الدین کے، جنہوں نے درسِ نظامیہ ترتیب دیا۔ کئی بیٹے بیٹے تھے۔ اُن میں سب سے قابل مُلا عبد العلی بحر العلوم لکھنوی تھے۔ وہ سترہ برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد انہیں لکھنؤ میں ایک سانحہ پیش آیا۔ جس کی

وجہ سے وہ پہلے شاہ جہاں پور گئے اور پھر وہاں سے رام پور اور بہار ہوتے ہوئے مدراس پہنچے۔ کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ "بحر العلوم" کا خطاب دیا۔ درس کے لئے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا۔ جہاں وہ اپنی وفات یعنی ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) تک درس دیتے رہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ارکانِ اربعہ در اصولِ فقہ۔ شرحِ مثنوی مولینا رُوم۔ شرح فقہ اکبر اور رسالہ توحید وغیرہ۔ مولینا سلیمان ندوی نے ایک مضمون میں انہیں ابنِ خلدون اور امام الہند شاہ ولی اللہ کے ساتھ اِس طبقے میں گِنا ہے۔ جنہوں نے متاخرین کے دورِ تقلید میں بھی مجتہدانہ انداز برقرار رکھا ہے۔ مولینا کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے لیکن بعض باتوں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ علامہ بحر العلوم کی اصل جگہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ علامہ وجیہہ الدین گجراتی اور شیخ نور الدین احمد آبادی، کے ساتھ ہے جنہوں نے علومِ درسی میں کمال حاصل کیا اور ان کی خوب اشاعت کی۔ لیکن جنہیں ابنِ خلدون یا شاہ ولی اللہ کا ہم پایہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

مُلا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن ان کے بعد بھی یہ جگہ اسلامی علوم کا مرکز بنی رہی۔ مُلا صاحب کے اپنے صاحبزادے مولوی عبد الرب۔ کچھ دیر مدراس ٹھہر کر پنشن حاصل کرکے لکھنؤ آگئے۔ ان کے علاوہ یہاں سینکڑوں علما تحصیلِ علم و فضل سے فارغ ہوئے۔ گذشتہ صدی میں یہاں کے سربرآوردہ عالم مولینا عبد الحی تھے۔ جنہوں نے عربی میں متعدد کتابیں لکھیں اور جن کے کئی شاگرد نامور عالم ہوئے۔ حال میں مولینا عبد الباری نے نام پیدا کیا ہے۔ اُنہوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصّہ لیا۔ اور مولینا محمد علی مرحوم نے

ان سے طریقۂ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی ؂

آزاد بلگرامی :- لکھنؤ کے قریب بلگرام کا مردم خیز خطہ ہے جہاں سید عبدالجلیل اور اُن کے بعد ان کے صاحبزادے سید محمدؒ قابلِ ذکر علما تھے۔ لیکن شاید ان سے بھی زیادہ عزت و احترام کے مستحق سید غلام علی آزاد بلگرامی تھے جنہیں حسان الہند بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بلگرام میں ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہمعصر تھے۔ سید محمدؒ بلگرامی اور سید طفیل محمدؒ بلگرامی سے تعلیم حاصل کی چونتیس ۳۴ سال کی عمر میں حج کو گئے۔ اور مدینہ منورہ میں شیخ محمدؒ حیات سندھی سے "صحیح بخاری" پڑھی اور "صحاح ستہ" کا اجازہ حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور اورنگ آباد چلے گئے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے صاحبزادے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ نے ان کی بڑی قدر کی۔ اور اپنے پاس رکھا۔ یہاں اُنہوں نے اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزارا۔ ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف کئی ہیں۔ عربی میں ایک کتاب "صحیح بخاری" کے چند ابواب کی شرح میں ہے۔ اور ایک اہم کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ہے۔ فارسی میں اُنہوں نے یدِبیضا۔ سروِ آزاد خزانۂ عامرہ۔ روضۃ الاولیا اور مآثر الکرام لکھیں۔ ان میں سے پہلی تین کتابوں میں شعرا اور روضۃ الاولیا میں بعض اولیاء کے حالات ہیں۔ مآثر الکرام بلگرام کے اولیاء اور فضلاء و شعرا کے متعلق ہے۔ اور ضمناً بلگرام سے باہر کے کئی بزرگوں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستان میں فارسی شاعری اور علومِ اسلامی کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بے حد مفید ہیں۔ آپ کا طرزِ تحریر سلجھا ہُوا۔ محققانہ۔ لفاظی اور استغراق سے پاک ہے۔ اور اِس میں

کوئی شک نہیں۔ کہ اگر آپ یہ کتابیں نہ لکھ جاتے۔ تو مورخین کو اسلامی ہند کی ذہنی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں +

سیّد مُرتضےٰ زبیدی بلگرامی :۔ جس وقت مولٰینا آزاد مآثر الکرام میں بزرگانِ بلگرام کا تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اُس وقت اِس کانِ جواہر کا ایک لعلِ بے بہا، یمن میں جا کر چمکنا شروع ہُوا تھا۔ اور اس کی تابانی اور درخشانی نے عالمِ اسلام کو اس طرح مسخّر کہ شاید ہی کسی ہندی نژاد نے کیا ہو!

یہ فخرِ ہندوستان بزرگ، علامہ مرتضےٰ تھے۔ جو یمن کے تعلیمی مرکز زبید میں اتنی دیر تک مقیم رہے۔ کہ وہ بلادِ عرب میں زبیدی مشہور ہیں۔ اور مصر و عرب میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کہ وہ یمنی نہیں، ہندوستانی تھے۔ سیّد مُرتضےٰ بلگرام میں پیدا ہُوئے (۱۱۴۵ھ) ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد گئے۔ اور مُلا فاخر الہ آبادی سے کچھ دیر فیض حاصل کیا۔ پھر دِلّی پہنچے اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اس کے بعد عنفوانِ شباب میں ہی حج کے لئے مکہ معظمہ گئے۔ اور وہاں سے زبید کا رُخ کیا۔ جہاں اُنہوں نے مختلف بزرگوں سے تعلیم حاصل کی۔ قیامِ عرب کے دوران میں ان کی ملاقات سید عبدالرحمان بن مصطفےٰ عیدروسی سے ہوئی۔ جنہوں نے انہیں سلسلۂ عیدروسیہ میں داخل کیا۔ اور اب علامہ کے علمی ساز کے ساتھ رُوحانی سوز شامل ہُوا۔ مرشد کے زیرِ ہدایت اُنہوں نے مصر کا رُخ کیا۔ اور تالیف و تصنیف کو اپنا موزوں شغل قرار دیا۔ ان کی وفات ۱۲۰۵ھ میں بعارضۂ طاعون ہُوئی۔

علامہ مُرتضےٰ نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ جُداگانہ علوم و فنون میں لیکن ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے نظیر ہے۔ ان کی ایک کتاب قاموس کی شرح تاج العروس ہے۔ جو

چودہ سال میں لکھی گئی۔ اور بہت بڑی تقطیع کے چار پانچ ہزار صفحوں کو محیط ہے۔ لیکن فنِ لغت سے بھی زیادہ شہرت آپ کو علمِ حدیث میں حاصل ہوئی۔ اس علم میں دوسرے سینکڑوں طالبوں کے علاوہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اوّل اور ترکی کے صدرِ اعظم علامہ راغب پاشا نے آپ سے سندیں اور اجازت نامے حاصل کئے۔ تصوّف میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا۔ اور نہ صرف بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے بلکہ آپ نے امام غزالی کی احیائے علوم الدین کی ایسی بلند پایہ شرح لکھی۔ کہ مصر اور بلادِ عرب میں اصل کتاب کو نئے سرے سے مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ڈی۔ بی میکڈانلڈ، جس نے اسلامی دینیات کی تاریخ لکھی ہے (اور اس میں ایک ہندوستانی عالم کا ذکر نہیں کیا!) عہدِ حاضر کے مذہبی اور روحانی رجحانات کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"دوسری تحریک غزالی کے اثر کا احیا ہے۔ یہ اثر کسی وقت بھی قطعی طور پر مُردہ نہ ہوا تھا۔ اور یمن میں تو شاید خاص طور پر کارفرما رہا۔ اسلامی دُنیا کے اس کونے میں صُوفیہ کی کئی نسلیں بلامزاحمت اپنا کام کرتی رہیں۔ اور یہ اس مُلک کا ایک باشندہ سیّد مرتضیٰ زبیدی تھا۔ جس نے احیاء علوم الدین پر ایک معرکۃ الآرا شرح لکھ کر دورِ حاضر میں اس کتاب کو نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بنا ڈالی۔ یہ شرح بڑی تقطیع پر دس جلدوں میں چھپی ہے۔ اور اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔"

چونکہ سیّد مرتضیٰ کے علمی کمالات پر ہندوستان سے باہر نکل کر بہار آئی۔ اس لئے یہاں اکثر لوگ ان کے علمی پایہ سے ناواقف ہیں۔ لیکن اہلِ نظر ان کی قدر و قیمت خوب پہچانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اُردو، مآثر الکرام کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- "خاکِ بلگرام میں ایک اور ایسا جیّد عالم ہو گزرا ہے۔ جسے فخرِ علمائے ہند کہنا بجا ہوگا۔

علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس میں علامہ سید مرتضٰی صاحب تاج العروس کا تذکرہ نہ ہو" مولینا مناظر احسن، جنہوں نے علامہ کی ایک تصنیف نفحۂ قدسیہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ "وہ مصر میں ہی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے لغوی، اور آخر میں ایک مرتاض، صاحب باطن ولی اللہ تھے" تذکرۂ علمائے ہند میں جہاں علامہ کی چھیاسٹھ کتابوں کے نام درج ہیں۔ مولوی رحمان علی خاں لکھتے ہیں۔" بالجملہ بوفورِ علم و نشر علوم بتوسط تلامذہ و تصانیف کتب، کہ بہ حیاتش صیتِ وے اکنافِ عالم را در گرفتہ۔ اگر وے را مجددِ صدی سیزدہم گویند، رواست"

سید مرتضٰی سے پہلے اور بعد میں، کئی ہندوستانی علما نے عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن افسوس کہ ان کو حقیقی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ ہی ان کی تصانیف کی عرب اور مصر کے علما نے قدر دانی کی۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کا بھی معتد بہ حصہ ان کتب سے فیضیاب ہونے سے محروم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے عام علما، بلکہ ہمارے ادبی اداروں کے، بلادِ اسلامی کے علمی حلقوں سے اسقدر مختصر روابط ہیں۔ اور عام طور پر ہمارے علما کو، جن کی زندگیاں ہندوستان میں گذریں، عربی زبان میں وہ مہارت حاصل کرنا، جو اہلِ زبان کا حصہ ہے[1]۔ اس قدر مشکل ہے۔ کہ ہمیں اس امر پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ

---

[1] شاید ہمارے ہاں عربی کی تعلیم میں بھی کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ عام طور پر ہندوستان میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے۔ وہ کتابی ہے۔ اور قدیم۔ اور ایک زندہ زبان میں بہت تبدیلیاں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سوائے چند مستثنیات کے، ہمارے بہترین علما کی عربی تصانیف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیں۔ اور عام طور پر ان کا اثر دُنیائے اسلام کی علمی زندگی پر بہت تھوڑا ہُوا ہے۔ [حجۃ اللہ البالغہ اب ازہر میں شامل درس ہوگئی ہے۔ لیکن جن مصری طُلبا سے ہمیں قیامِ انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہُوا۔ وہ سیّد امیر علی کی سپرٹ آف اسلام سے تو بخوبی واقف تھے۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا انہوں نے نام بھی نہ سُنا تھا۔] لیکن سید مرتضےٰ نے ثابت کر دیا۔ کہ ذہنِ ہندی تو ایسا ہے۔ کہ جن ہندوستانیوں کو اہلِ زبان میں رہ کر عربی زبان حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ ان کے درمیان تصنیف و تالیف کرتے ہیں۔ وہ اہلِ زبان سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ اور عربی زبان میں ایسی دسترس حاصل کر لیتے ہیں۔ کہ بلگرامی کو خود اہلِ زبان یمنی سمجھنے لگتے ہیں!

عربی زبان میں تصنیف و تالیف میں جو شہرت علامہ زبیدی نے حاصل کی۔ وہ

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)
ہوتی رہتی ہیں۔ ہم سے پروفیسر گب نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ متشرقین کی ایک کانفرنس میں ہندوستان سے ایک صاحب اپنا مضمون عربی میں لکھکر لائے ہُوئے تھے۔ اور انہوں نے اسی زبان میں پڑھا۔ لیکن مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کے نمایندوں نے بعد میں کہا۔ کہ وہ اس مضمون کے سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے۔ پروفیسر موصوف نے فرمایا۔ کہ چونکہ انہیں اور ان کے بعض انگریز ساتھیوں کو ہندوستانی طلبہ کے پڑھانے کا تجربہ تھا۔ اور ان کے لب و لہجہ، اور لسانی خصوصیات سے واقف تھے۔ اس لئے وہ تو پھر بھی مضمون کو کسی حد تک سمجھ سکے۔ لیکن مسلمان عرب عُلما اس سے یکسر محرُوم رہے!

غالباً کسی دوسرے ہندوستانی کو زمانۂ حال میں نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ایسے ہندوستانی علما کی تعداد بہت ہے۔ جنہوں نے مدینہ منورہ یا عرب کے دوسرے شہروں میں درس و تدریس کی محفلیں جمائیں۔ اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ افسوس کہ ایسے علما کا جُداگانہ تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ ورنہ ان علمی اثرات کا پُورا اندازہ ہوتا۔ جو ہندوستانی علما نے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈالے۔ لیکن اس فہرست میں بڑے بڑے برگزیدہ نام شامل ہیں۔ اور خوش قسمتی سے یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہُوا۔ ہم شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب متقی کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس زمانے میں بھی ہندوستان کے ایک فاضل شیخ محمد حیات السندی المدنی (۱۱۶۳ھ) نے مدینہ منورہ میں علم حدیث میں وہ پایہ حاصل کیا۔ کہ اپنے معاصرین سے بازی لے گئے۔ اور ان سے حرمین اور مصر اور رُوم و شام کے علما فیض یاب ہُوئے؛

خیرآبادی خاندان:۔ خیرآباد کے علمی خاندان کا آغاز اسی زمانے میں ہُوا۔ پہلے قابلِ ذکر بزرگ مولوی فضل امام خیرآبادی تھے۔ جو دہلی میں صدر الصدور ہُوئے۔ اُن کا آمدنامہ اب بھی فارسی کے طلبا استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیرآبادی تھے۔ جو غالبؔ کے عزیز دوست اور بہت سی کتابوں کے مُصنف تھے۔ غدر کے بعد آپ رنگون جلاوطن ہوئے۔ اور وہیں سنہ ۱۸۵۹ء میں فوت ہوگئے۔ آپ نے علمِ طبعیات پر کئی کتابیں لکھیں۔ اور ایک تاریخ غدرِ ہندوستان بھی مرتب کی تھی۔ آپ کا سلسلۂ فیض مولوی عبدالحق خیرآبادی نے جاری رکھا۔ جو رام پُور میں ملازم تھے۔ وہ علامہ شبلی کے اُستاد اور کئی کتابوں کے مُصنّف تھے؛

مولوی سلام اللہ محدّث:۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کا سلسلۂ فیض انکے بیٹے

شیخ نورالحق نے جاری رکھا تھا۔ اگرچہ قضا کے فرائض کی وجہ سے انہیں درس کے لئے بہت فرصت نہ ملتی تھی۔ لیکن حدیث میں اُنہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی سلام اللہ محدّث رام پوری تھے۔ اُن کے دادا حافظ فخرالدین نے صحیح مسلم کی فارسی شرح لکھی تھی۔ اُن کے والد مولوی شیخ الاسلام بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں صحیح بخاری کی فارسی شرح مشہور ہے۔ مولوی سلام اللہ نے بھی سنے بھی حدیث کی اشاعت کے لئے بڑی کوشش کی۔ صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور اصولِ حدیث پر عربی میں ایک کتاب اور موطا کی شرح لکھی۔ ۱۷۸۸ء میں وفات پائی۔

علامہ تفضل حسین کاشمیری:۔ اس دور میں اور بھی کئی نامور عالم گزرے ہیں۔ ایک مولوی سید دلدار علی لکھنوی تھے۔ جو ہندوستان کے پہلے شیعہ مجتہد گنے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے دوسری کتب کے علاوہ وحدت الوجود کی تردید میں ایک کتاب لکھی تھی۔ آپ کی وفات ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ ان کے علاوہ علامہ تفضل حسین کاشمیری نے اس زمانے میں شہرت پائی۔ وہ علومِ ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ لاطینی خوب جانتے تھے۔ آصف الدولہ نے ایک زمانے میں انہیں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ لیکن اُنہوں نے اپنی سادگی برقرار رکھی۔ اور دروازے پر دربان تک مقرر نہ کیا۔ جو آدمی آتا۔ سیدھا ان کے پاس جاتا۔ ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔ ان کی تصانیف میں سے ایک کتاب جبر و مقابلہ میں اور ایک کتاب فرنگی علمِ ہیئت میں مشہور ہے۔ عقائد کے لحاظ سے آپ شیعہ تھے۔ سرسیدؒ کے نانا نواب فرید الدولہ جو بعد میں شاہ عالم کے وزیرِ اعظم ہوئے۔ لکھنؤ میں آپ سے ہیئت و ریاضی پڑھنے آئے تھے۔

اٹھارویں صدی کے مشائخ

عہدِ عالمگیری میں کئی اہل اللہ ہوں گے۔ اور دو تین کے نام رقعاتِ عالمگیری میں بھی آتے ہیں۔ لیکن شاید سید مرتضےٰ ملتانی کے سوا (جنہیں اس زمانے کا شیخ علائی سمجھنا چاہیئے) کوئی بھی ایسا نہیں۔ جس نے امتیازی شان حاصل کی ہو۔ یا قوم کی روحانی تاریخ کو متاثر کیا ہو۔

چشتیہ سلسلہ :۔ زوالِ حکومت کے زمانے میں البتہ تصوّف کو پھر فروغ ہوا۔ ایک تو چشتیہ سلسلے نے 'دو تین سو سال کے بعد' بارِ دگر رونق پائی۔ اور اس کا باعث اِس طریقے کے دو تین بزرگ تھے۔ جو یکے بعد دیگرے اِس زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ہیں۔ جو شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ اور سفرِ حج کے دوران میں شیخ یحییٰ مدنی سے بیعت ہوئے۔ اُنہوں نے واپس آکر وطن میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت شروع کی۔ کہتے ہیں۔ کہ اورنگ زیب کا بیٹا بہادر شاہ شیعہ عقائد سے تائب ہونے کے بعد آپ کا مُرید ہُوا تھا۔ آپ کی وفات ۱۱۴۲ھ میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ نظام الدین ولی اورنگ آبادی تھے۔ جو شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ لیکن جنہیں آپ نے تعلیم دے کر اورنگ آباد دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ یہاں شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ ہُوا۔ بلکہ مشہور ہے۔ کہ نظام الملک آصف جاہ آپ کے مُرید ہُوئے تھے۔ سلسلے کی خدمت میں ان کے بیٹے مولٰینا فخر الدین فخر جہاں شاہجہاں آبادی ان سے بھی بڑھ گئے۔ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہُوئے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں کا میدان شمالی ہندوستان تھا۔ یہاں دہلی میں بیٹھ کر

آپ نے اطرافِ ملک میں خلفا بھیجے۔ جنہیں اپنے کام میں بڑی کامیابی ہوئی۔
پنجاب میں آپ نے مولینا نور محمدؒ مہاروی کو بھیجا تھا۔ جنہوں نے خانقاہِ تونسہ (ضلع
ڈیرہ غازی خاں) کے بانی خواجہ سلیمان تونسوی اور گولڑہ (ضلع راولپنڈی) جلال پور
(ضلع گجرات) اور چاچڑاں کے بزرگوں کو مُرید کیا۔ روہیل کھنڈ میں ان کے مرید اور مشہور
صُوفی شاعر مولینا نیاز احمد صاحب نیاز بریلوی نے چشتیہ نظامیہ سلسلے کو خوب چمکایا۔
بادشاہِ وقت اکبر شاہ ثانی بھی آپ کا مرید تھا۔ اور آپ کے حالات نظام الملک کے
پوتے، نواب غازی الدین خاں نے مناقبِ فخریہ کے نام سے جمع کئے ہیں۔ میاں
کالے صاحب جن کا بہادر شاہ مرید تھا۔ اور جو مشہور شاعر غالبؔ کے مربی بھی تھے۔
مولینا فخر الدین کے پوتے تھے۔ مولینا کی وفات ۱۱۹۹ھ میں ہوئی۔

نقشبندیہ سلسلہ:۔ نقشبندیہ سلسلے نے بھی اس صدی میں خوب رونق پائی۔
اور اس سلسلے کے کئی بزرگوں نے اُردو زبان اور شاعری کی تشکیل اور نشو و نما میں مدد
دی۔ جب بندہ بیراگی نے سرہند کو تباہ و برباد کر دیا۔ تو جو حضرات یہاں سے ترکِ مکان
کر کے دہلی چلے گئے۔ ان میں ایک بزرگ، شیخ عبدالاحد سرہندیؒ المعروف بہ شاہ گل
تھے۔ وہ خواجہ محمد معصومؒ کے بھتیجے تھے۔ اور دہلی میں علما و مشائخ کے حلقے میں داخل
ہوئے۔ جس میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے والدِ ماجد شاہ عبدالرحیم کا آنا جانا تھا۔ اور
انفاس العارفین میں کئی جگہ ان کا ذکر آتا ہے۔ ان کے ایک مرید حاجی محمد افضل تھے۔
جن سے امام الہند نے حدیث پڑھی تھی ٭

شاہ گلشن دہلوی:۔ ان کے دوسرے مرید شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی تھے۔ جو خود
شاعر اور بہت سے شاعروں کے مُرشد اور اُستاد تھے۔ روضۃ القیومیہ میں ان کی نسبت

لکھا ہے۔ "آپ شیخ عبدالاحد کے خلیفہ ہیں۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر شعرا آپ کے ہی شاگرد ہیں۔ باطنی حالات بھی آپ کے اعلےٰ تھے۔" آپ نے اپنے مرشد کے عرف شاہ گل کی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ شاہ صاحب ایک تارک الدنیا بزرگ تھے۔ جامع مسجد دہلی میں رہتے۔ کئی کئی دن کے بعد کھانا کھاتے۔ اور اکثر ترکاریوں کے چھلکوں اور خشک پتوں پر گزارہ کرتے۔ سروِ آزاد میں آپ کے دیوان "سپہرِ ضخامت" کا ذکر ہے۔ لیکن ہمیں فقط چند شعر دستیاب ہوئے ہیں۔ دو سروِ آزاد سے اور ایک آبِ حیات سے ؎

به چشمِ خویش نگر، سحرِ سامری این است | نظر به آئینه کن، شیشه و پری این است

گشتم شهیدِ تیغِ تغافل کشیدنت | جانم ز دست برد، غزالانه دیدنت

به دقتِ مے تواں فهمید معنی هائے نازِ او | که شرحِ حکمت العین است، مژگانِ درازِ او

میخانۂ درد میں ان کے چار اور شعر نقل ہوئے ہیں۔ جن میں سے ذیل کے تین پڑھے جاتے ہیں ؎

بدرش رفته سجده ها کردم | منتِ پائے ماست بر سرِ ما

سخت جاناں نیستند از چاره سازاں کامیاب | مومیائی نفع کے بخشد شکستِ سنگ را

کلکِ من صورت کشِ صد معنیِ رنگیں رواست | گر کند گلشن تخلص بلبلِ طبعم رواست

آدم الشعرائے اُردو وؔلی ان کا شاگرد تھا۔ اور انہی کے ایما پر اس نے اپنا دیوان فارسی دواوین کے طرز پر مرتب کیا۔ اور اس میں وہ مضامین باندھے۔ جو فارسی شاعری سے مخصوص تھے۔ اس سے پہلے زیادہ تر اُردو میں بھاشا کے مضامین ہوتے تھے۔ (ملاحظہ ہو سردِ آزاد کا تتمہ) یا ریختہ کی شتر گربگی اور غیر تعینی خیالات۔ شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا۔ "شما زبانِ دکنی را گذاشتہ، ریختہ را موافق اُردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید۔ کہ تا موجبِ شہرت و رواج قبولِ خاطر صاحب طبعانِ عالی مزاج گردد۔" (تذکرہ قدرت) اور "این ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار اُفتادہ اند۔ در ریختہ بکار برد۔ از تو کہ محاسبہ خواہ گرفت"۔ ولؔی نے آپ کے مشوروں پر عمل کیا۔ اس وقت سے اُردو شاعری فارسی کے نقشِ قدم پر چلی۔ اور آہستہ آہستہ یہ زبان فارسی کی جانشین ہوئی۔ شاہ صاحب کے ایک اور شاعر مرید خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ تھے۔ جن کے صاحبزادے خواجہ میردردؔ اُردو کے بہترین صوفی شاعر ہونے کے علاوہ کئی صوفیانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ میر دردؔ ایک شعر میں اپنے معنوی بزرگوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں ؎

قدرِ این ناچیز را داند جنابِ عندلیبؔ   گرچہ جز کاہے نیم، اما کیاہِ گلشنم

ایک اور نقشبندی شاعر اور اُردو زبان کے محسن، مرزا جانجاناں تھے۔ جو ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۸۰ء میں ایک شیعہ کی گولی سے ہلاک ہوئے۔ وہ طبقۂ اُمرا کے رُکن تھے۔ ان کی پیدائش پر خود بادشاہِ ہندوستان، اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے مرزا جاں کے نام پر ان کا نام جانِ جاناں رکھا۔ لیکن انہوں نے ترکِ دُنیا کر کے، تصوف اور شعر و ادب کے لئے زندگی وقف کر دی اور شیخ عبدالاحد سرہندی کے کئی خلفا سے فیض حاصل کیا۔

آزاد نے ان کے اور خواجہ میر درد کے حالات میں ہجو ملیح سے کام لیا ہے۔ اور اِن دو نقشبندی بزرگوں سے ان خیالات کا انتقام لیا ہے۔ جو اس سلسلے کے کئی قدیمی بزرگ شیعوں کی نسبت رکھتے تھے۔ لیکن معاصرانہ تذکروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ غیر معمولی نازک مزاجی کے باوجود مرزا صاحب، دقیقہ رسی، علمیت، مذاقِ سلیم، انصاف پسندی اور تصوّف میں یگانۂ روزگار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "آنچہ قدرِ ایشاں ما مردم میدانیم۔ شما چہ دانید۔ احوالِ مردم ہند بہ ما مخفی نیست۔ کہ خود مولد و منشاء فقیر است۔ و بلادِ عرب را نیز دیدہ ایم و سیر نمودہ۔ احوالِ مردمِ ولایت از ثقاتِ آنجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباعِ کتاب و سنت، ہمچنیں استوار و مستقیم باشد۔ و در ارشاد طالبان شانِ عظیم و نفسِ قوی دارد دریں جزوِ زماں مثل ایشاں در بلادِ مذکور یافتہ نمیشود۔ مگر در گذشتگان بلکہ در ہر جزوِ زماں، وجود ایں چنیں عزیزاں کمتر بودہ است۔ چہ جائے ایں زماں کہ پُر فتنہ و فساد است۔"

مرزا صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے آپ کے مکتوبات خاص غور و فکر کے مستحق ہیں۔ بعض مکتوبات میں حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بعض میں صوفیانہ اور شرعی مسائل کی توضیح ہے۔ بعض خطوں سے اس زمانہ کی بدنظمی اور بے ترتیبی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئین و مذہب کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے۔ اور چونکہ ایک مسلّمہ عالم کے قلم سے اس مسئلے پر تفصیلی اظہار شاذ و نادر ہی کہیں ہُوا ہوگا۔ اس لئے ہم اس کا پُورا ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں:-

"آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر، عرب کے مُشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی۔ اور اب منسوخ ہو گئی ہے؟ دیگر ان لوگوں کے اگلوں کے حق میں کیسا اعتقاد کرنا چاہیئے؟

واضح رہے کہ اہلِ ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ کہ معلوم ہوتا ہے' یہ ہے۔ کہ نوع انسانی کی پیدائش کے شروع میں رحمت الٰہیہ نے معاد و معاش کی اصلاح کے لئے ایک کتاب مسمّٰی بہ وید جس میں چار دفتر ہیں۔ اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے اخبار ہیں۔ ایک فرشتے برہما نام کے وسیلے سے جو ایجاد عالم کا آلہ ہے بھیجی۔ اسکے مجتہدوں نے اس میں سے چھ مذہب استخراج کئے۔ اور اصول و عقائد کی بنا انہیں پر قائم کی۔ اس کو دھرم شاستر کہتے ہیں یعنی فنِ ایمانیات جسے علم کلام بھی کہتے ہیں۔ اور نوع انسانی کے چہار فرقے بنائے۔ اور ہر فرقے کے لئے الگ راستہ مقرر کیا۔ اور فروع اعمال کی بنا اس پر قائم کی۔ اس فن کا نام کرم شاستر رکھا یعنی فن عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نسخ احکام کے منکر ہیں۔ لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تغیرِ اعمال بھی ضروری ہے۔ اس لئے دُنیا کی ساری مدت کو چار حصّوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے کا نام جُگ رکھا ہے۔ ہر ایک جُگ کی علامتیں انہیں چار دفتروں سے اخذ کی ہیں۔ جو کچھ متاخرین نے ان میں اپنے تصرفات کئے ہیں وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ ان کے تمام فرقے توحیدِ الٰہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فنائے عالم، نیک و بد کی جزا و سزا، حشر جسمانی اور حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علوم عقلی۔ نقلی۔ ریاضات۔ مجاہدات۔ تحقیقِ معارف اور مکاشفات میں بڑے ماہر ہیں۔ ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

ان کے عقلمندوں نے انسانی عمر کے چار حصے کئے ہیں۔ پہلا تحصیل علم کے لئے۔ دوسرا تحصیلِ معاش اور اولاد کے لئے۔ تیسرا اعمال کی تصحیح اور نفس کی اصلاح کے لئے۔ چوتھا تجرد و تنہائی کی مشق کے لئے جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے۔ اور نجاتِ کبریٰ جسے مہا مکت کہتے ہیں۔ اس پر موقوف ہے۔ ان کے دین کے قواعد و ضوابط میں نظم و نسق نہایت اعلےٰ درجے کا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ یہ دین جاری تھا اور پھر منسوخ ہوگیا۔ اور شرع میں یہود اور نصاریٰ کے دین کے نسخ کے سوا اور کسی دین کے نسخ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ بہت سے دین منسوخ ہوئے۔ اور کئی دین مٹے بھی اور ثابت بھی ہوئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق۔ "وان من امة الاخلا فیها نذیر" (ہر ایک گروہ کا نبی گزرا ہے) ولکل امة رسول" (اور ہر ایک اُمت کا رسُول ہوتا ہے۔) سرزمینِ ہندوستان میں بھی نبی اور رسُول کی بعثت واقع ہوئی ہے۔ اور ان کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے آثار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ صاحبِ کمال تھے۔ رحمتِ عامہ الٰہی نے مصلحتِ انسانی کو اس وسیع سلطنت میں فرو گزاشت نہیں کیا۔ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے۔ جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس قوم کے لئے لازم تھی نہ کہ کسی اور پیغمبر کی۔ لیکن جب سے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔ تب سے لے کر جب تک دُنیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا شرق سے لے کر غرب تک، تمام دُنیا کو آنحضرت ہی کی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مقابل تمام باقی دین منسوخ ہیں۔

آغازِ بعثت سے لے کر آج تک جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہُوا۔ وہ کافر ہے نہ کہ وہ جو پہلے گزر چکے ہیں۔ نیز آئۂ کریمہ "منھم من قصصنا علیك و منھم من لم نقصص علیك"۔ (ان میں سے بعض کا حال تمہارے رُوبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا) اس سے ظاہر ہے۔ کہ بہت سے انبیاء کا حال بیان نہیں کیا گیا۔ اس لئے ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر تعصّب سے کام نہ لیا جائے تو نہ ان کی تابعداری لازم ہے اور نہ ان کی نجات کا یقین۔ لیکن نیک گمان ضرور کرنا چاہیئے۔ اہلِ فارس اور دُوسرے تمام ممالک کے راہنماؤں کے حق میں جو خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور جن کی نسبت شرع میں کچھ گمان نہیں کیا گیا۔ اور جن کے احکام و آثار راہِ اعتدال کے مناسب اور موافق ہیں۔ اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر کہہ دینا آسان نہیں۔

ان (کفارِ ہند) کی بُت پرستی کی حقیقت یہ ہے۔ کہ بعض فرشتے جو حکمِ الٰہی سے عالمِ کون و فساد میں کچھ دخل رکھتے ہیں یا کاملوں کی بعض رُوحیں جنہیں جسم سے الگ ہو کر اس دُنیا میں کچھ تصرّف حاصل ہے۔ یا بعض زندہ آدمی جو ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں۔ ان کی مُورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس توجہ کے سبب مدت کے بعد اس مُورت والے سے مناسبت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس مناسبت کی وجہ سے اپنی معاش و معاد کی ضروریات کو پُورا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکرِ رابطہ سے ملتا جُلتا ہے۔ جو اسلامی صُوفیہ میں عام ہے۔

اور جس میں پیر کی صورت، کا تصوّر کیا جاتا ہے۔ اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں صرف اس قدر فرق ہے۔ کہ شیخ کی تصویر ظاہر میں نہیں بناتے۔ لیکن یہ بات کفارِ عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور مؤثر بالذات مانتے تھے نہ کہ آلۂ تصرفِ الٰہی۔ اور انہیں کو زمین کا خدا جانتے تھے۔ اور اللہ تعالےٰ کو آسمان کا خدا اگر ایسا کرنا شرک ہے۔ ان (کفارِ ہند) کا سجدہ، سجدۂ عبودیت نہیں، بلکہ سجدۂ تحیت ہے۔ جو کہ ان کے طریقے میں ماں۔ باپ۔ پیر اور اُستاد کے سلام کے لئے بھی عام ہے۔ اور جسے ڈنڈوت کہتے ہیں۔ تناسخ پر اعتقاد کرنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسّلام"۔

مرزا مظہر جانجاناں کے خلفاء میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت مشہور ہیں۔ شاہ عبد العزیز انہیں بیہقیٔ وقت کہا کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنّف تھے۔ ان میں سے فقہ کے مسائل کی کتاب مالابدمنہ اب بھی مستعمل ہے۔ اسکے علاوہ اُنہوں نے سات جلدوں میں تفسیرِ مظہری لکھی۔ اس زمانے میں شاہانِ اودھ کی وجہ سے شیعہ سُنّی مسئلہ پھر پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے شیعہ عقائد کے خلاف سیف المسلول کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ ارشاد الطالبین۔ حقوق الاسلام شہاب ثاقب اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔ مرزا مظہر جانجاں کے دوسرے نامور مُرید غلام علی دہلوی تھے۔ جنہوں نے (۱۸۲۴ء) میں وفات پائی۔ وہ خدا رسیدہ عارف اور مُتشرع عالم تھے۔ دہلی میں ان کا بڑا اثر تھا۔

اور ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسے کا مدِمقابل سمجھی جاتی تھی۔ سرسیّد احمد خاں کے والد ان کے نہائت چاہیتے مرید، بلکہ ان کے بیٹوں کی طرح تھے۔ سرسیّد انہیں "دادا شاہ صاحب" کہا کرتے تھے۔ اور ان کے بڑے معتقد تھے۔ وہ اخیر عمر تک اس بات پر فخر کرتے رہے۔ کہ ان کی بسم اللہ شاہ غلام علیؒ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اسی تقریب کے متعلق بعد میں ایک شعر لکھا تھا۔ جس میں شاہ صاحب کی طرف اشارہ ہے ؎

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی
زفیضِ نقشبندِ وقت، جانِ جانجانانی

پتہ نہیں۔ کہ جس وقت شاہ صاحب سرسیّد کو الف۔ بے لکھوا رہے تھے۔ انہیں اس امر کا بھی خیال آتا تھا۔ کہ یہ بچّہ جو ان کی گود میں کھیل کے پلا تھا، بڑا ہو کر خود بھی ایک نئے علمی اور ملّی دَور کا بانی ہو گا!!

شیخ محمد اقبال پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی سے شائع کیا